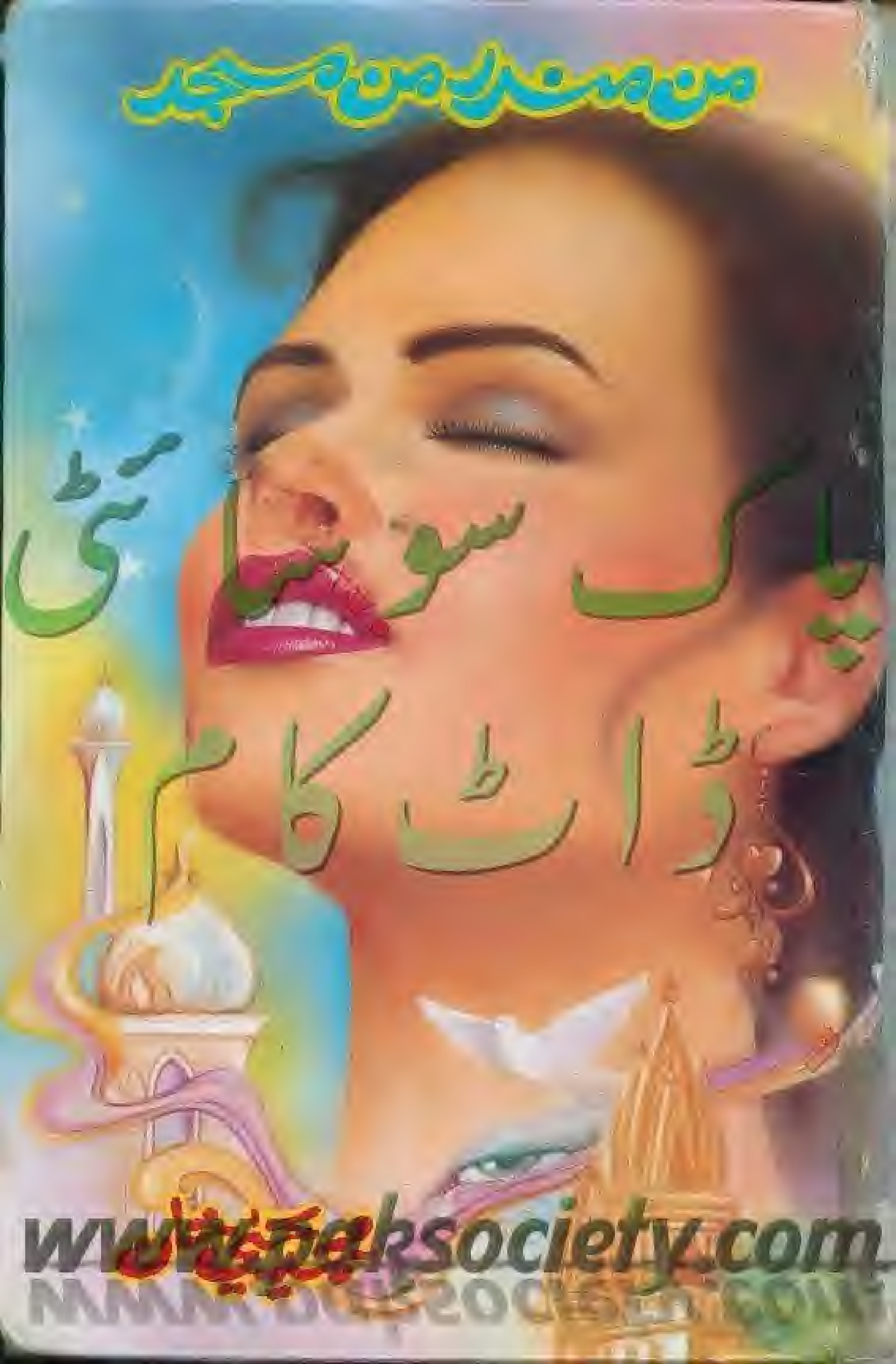

من مندر من مسجد
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com

URDU
MUN MUNDER MUN MASJID
KHAN, MOHAMMAD, Y.

من مندر، من مسجد

محمد یحییٰ خان

حماد پبلی کیشنز
80- نسبت روڈ، لاہور

طبع اول	:	جنوری 1995ء
تعداد	:	500
قیمت	:	100 روپے

کمپیوٹر کمپوزنگ	:	آزاد کمپوزنگ سنٹر وحدت روڈ، لاہور۔ فون: 5835633
سرورق	:	ذاکر
طباعت	:	افراز عاشق پرنٹرز، لاہور
زیر اہتمام	:	خالد بن حامد

انگلینڈ میں کتاب حاصل کرنے کا پتہ
3-GRANVILLE ROAD, FRIZING HALL
BRADFORD, 9
BD9 4EH, UK

انتساب

زندگی کے کٹھن راستوں پر ایستادہ ان چھتناور درختوں کے نام!

جو وقت کے تپتے سورج کو اپنے سروں پر سہار کر تھکے ہارے 'بے دم مسافروں کو ٹھنڈی میٹھی

نرم چھاؤں اور آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کرتے ہیں

محمد علی

اعتراف

پڑھا لکھا شاید اسے کہتے ہیں جو دس بارہ یا اس سے زیادہ کچھ جماعتیں پاس کئے ہوئے ہو۔ اگر یار لوگوں کا یہ قیاس صحیح مان لیا جائے تو اس حساب سے میں بالکل ان پڑھ ہوں۔۔۔ ہاں 'اگر کوئی محض پڑھ سکنے اور کچھ لکھ لینے سے پڑھا لکھا کہلوا سکتا ہے تو میں بھی پڑھا ہوا ہوں جبکہ لکھا ہوا پھر بھی نہیں کیونکہ کتاب سامنے دھر کر زیر لب پڑھنے سے آدمی اپنے پڑھے ہونے کا بھرم قائم رکھ سکتا ہے اور اپنا جہل بھی چھپا لیتا ہے لیکن لکھنے سے وہ بے چارہ سفید پوش ننگا ہو جاتا ہے لہٰذا اسی خوف سے میں نے صرف پڑھا ہی 'لکھا نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نوعمری سے اب بڑھاپے تک منشی علم دین بنا رہا مگر ان خوش فہم احباب کو کیا کہئے جنھوں نے بخ پر باندھ پٹکا کر 'کوئے کو ہنس بنا دیا۔ ہنسی ٹھٹھول سمجھتے ہوئے میں بھی ان کے ساتھ اس مذاق میں شامل رہا مگر رنجیدہ 'سنجیدہ اور کبیدہ تب ہوا جب قلم کو 'ہنس چال چلنے کی مضحکہ خیز کوشش کرنے لگا۔ پچھتاوا بھی ہوا کہ اگر بڑی بڑی نہ چھوڑتا 'تولہ بھر کی کلگی کو دانتوں تلے دبا کر رکھتا' باتوں اور گفتگو میں زیب داستان کے چکر نہ چلاتا 'گاڑھی گاڑھی اور اوکھی اوکھی اردو نہ بولتا تو آج جگ ہنسائی سے بچا رہتا لیکن اس میں بھی سارا قصور میرا ہی تو نہیں بلکہ قصور تو باجی قرۃ العین حیدر' آپا عصمت چغتائی' چچا اشرف صبوحی' بیانی بیدی' انکل منٹو' مولوی ممتاز مفتی اور ٹھاکر مشتاق یوسفی کی کتابیں چاٹنے کا بھی ہے

اور کچھ میرے احباب سید سجاد حیدر' ثناء اللہ' نوید اشرف' جاوید اقبال اور لیاقت جعفری کا بھی ہے جنہوں نے میرا گنڈا باندھا۔ رہی سہی کسر برادرم خالد بن حامد صاحب نے پوری کر دی جن کے چہرے کی معصومیت' لہجے کی شیرینی' پاکیزہ سی مسکراہٹ' انکسار بھرا انداز گفتگو ایٹم بم کی قوت رکھتا ہے جو پھٹتا نہیں' مقابل کے اندر دل کی زمین میں بیج کی مانند دھنس کر گل داؤدی کھلا دیتا ہے۔

صاحبو! بس یہ انٹ شنٹ لکھ کر مجھے یہ ثابت کرنا ہے کہ میں صرف "پڑھا" ہوں' "لکھا" نہیں۔ یہ جو کچھ لکھنے کی خطا سرزد ہوئی ہے اس کے لئے میں کچھ زیادہ قصوروار نہیں ہوں--- یقیناً آپ پڑھے لکھے ہیں' ہو سکے تو اس کی چند سطریں کہیں سے بھی پڑھ لیں لیکن اس پہ لکھیں نہیں' یعنی تنقید نہ لکھیں۔ یوں آپ کا وقت بچ جائے گا اور میرا بھرم--- بھاٹی چوک میں سری پائے کھاتے وقت آدمی کھد کے ساتھ کھال اور پاوے کے ساتھ بال بھی تو کھا ہی جاتا ہے--- آئندہ میری توبہ!

☆ محمد یحییٰ خان

بس اک نظر!

انسان کا بچپن اور لڑکپن تو یوں کہئے کہ جیسے ڈال سے لٹکے کچے پھل کی طرح ہوتا ہے' کچھ ہوتے ہیں کہ جو پکنے تک ڈال کے سہارے رہتے ہیں اور اس کے بعد ہی جدا ہوتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی تو ہوتے ہیں کہ جنہیں آندھیاں اور طوفان وقت سے پہلے ہی شاخ سے جدا کر دیتے ہیں اور پھر یہ کچے پھل' یہ نوعمر بچے رل جاتے ہیں۔ زمانے کی سختیاں انہیں اپنی جان پر جھیلنا ہوتی ہیں' آگے بڑھنے کی راہ انہیں خود کھوجنا پڑتی ہے اور زندہ رہنے کے آسرے بھی خود ہی تلاش کرنا پڑتے ہیں۔ ایسے بچے کہ جن کا ابتداء ہی میں واسطہ زمانے' وقت اور لوگوں سے پڑ جائے' زندگی ان کے لئے اک جبر سے زیادہ نہیں ہوا کرتی' وہ جگہ جگہ ٹھوکر کھاتے ہیں اور لڑکھڑاتے ہیں' گر بھی جاتے ہیں اور ان کی معصوم نظریں ایسے میں کسی ایسے ہاتھ کو ڈھونڈتی ہیں جو ان کا ننھا منا ہاتھ تھام کر انہیں پھر سے کھڑا کر دے' پھر سے لوگوں کے ہجوم میں شامل کر دے اور یہ بے آسرا ہجوم میں اکثر گم ہو ہی جایا کرتے ہیں۔ ان کی کوئی پہچان نہیں ہوا کرتی کہ یہ خود اپنی پہچان بھول جاتے ہیں لیکن سب ہی تو ایسے نہیں ہوتے نا! بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اک ہمت' اک حوصلہ اور اک ولولہ جن کے سنگ رہتا ہے۔ وہ آگے بڑھنے کے لئے دوسروں کے چہرے نہیں تکا کرتے بلکہ اپنی قوت بازو پر انحصار کرتے ہیں۔ اک محاذ پر شکست کا سامنا ہوتا ہے تو واپس پلٹ کر نہیں آتے بلکہ دائیں یا بائیں سے کوئی راہ نکال کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو مسلسل آگے بڑھتے جاتے ہیں اور محرومیوں کو بھول کر ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی کھوج میں رہتے ہیں جن سے ان کا حوصلہ قائم رہے اور اعصاب شل نہ ہوں۔ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں کہ جن پر زندگی بالآخر مہربان ہو ہی جاتی ہے بالکل ایسے ہی کہ جیسے مسلسل خدمت کرتے رہنے سے ایک نہ ایک دن سوتیلی ماں بھی دعائیں دینے پر مجبور ہو جایا کرتی ہے۔

محمد یحییٰ خان کو آپ ان کی تحریروں کے حوالے سے جانتے ہوں گے' میرے لئے بھی ان کی اک بڑی پہچان تو یہی ہے لیکن کچھ اس سے سوا وہ ملاقاتیں ہیں جو وقتاً" فوقتاً" رہتی ہیں اور سچ پوچھئے تو ہر ملاقات اک تشنگی دے جاتی ہے' یوں لگتا ہے کہ بہت سی باتیں تو ابھی کرنا تھیں اور یہ باتیں ہی تو ہیں جو بندے کو بندے پر عیاں کرتی ہے' کچھ لوگ ہوتے ہیں ایسے جو نہ صرف چہرے پر لبادے اوڑھے رکھتے ہیں بلکہ زبان کو بھی کچھ یوں اپنے اختیار میں رکھتے ہیں کہ اندر کا ایک بھی بھید باہر نہ آئے لیکن بعض



من مندر، من مسجد

چہرے ایسے بھی تو ہوتے ہیں جن پر سچ ہی سچ رقم ہوتا ہے۔ یہی سچائی ان کے ہر لفظ' ہر عمل سے جھلکتی ہے اور محمد یحییٰ خان کی تصویر تو آپ نے بھی دیکھی ہوگی۔ آپ بھی گواہی دیجئے گا کہ میں نے سچ ہی کہا ہے نا!--- ان سے پہلی ملاقات کا احوال جی چاہتا ہے کہ سنایا جائے لیکن یہ قصہ پھر سہی کہ یہاں اتنی گنجائش نہیں لیکن کبھی کسی سے برسوں بعد مل کر آپ کو بھی شاید یہ احساس ہوا ہو کہ جیسے ہم بچھڑے تو کبھی نہ تھے' بس فاصلوں کی دیوار درمیان میں حائل ہوگئی تھی لیکن جیسے ہم بادل' ہوا' خوشبو کے ہاتھ ایک دوسرے کو دعائیں تو بھیجتے رہے تھے' محبت بھری سرگوشیاں تو کرتے رہے تھے۔ یہ مانا کہ ہم ایک دوسرے کا چہرہ نہ دیکھ پاتے تھے لیکن شناسائی کو اک احترام کی نظر سے تو دیکھتے تھے اور پھر ملاقات ہو جائے تو کب احساس ہوتا ہے کہ مدتوں بعد ملے ہیں--- کچھ یہی احساس پہلی ملاقات سے مجھے ملا تھا۔ محمد یحییٰ خان کا بچپن زیادہ تر یہاں لاہور میں ہی گزرا اور اسی زمانے سے ہی انہوں نے ان لوگوں کی مجلس اختیار کرنا شروع کر دی تھی جو لفظوں سے کھیلنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ ان میں اس زمانے کے تقریباً سبھی بڑے نام آجاتے ہیں' اسی زمانے میں ہی دو تین بار ہم دونوں کی بھی میل ملاقات رہی اور آداب عرض کے صفحات میں شمولیت بھی اختیار کی۔ پھر عملی زندگی نے کچھ زیادہ باعمل بنا دیا تو دیس بھی چھوٹ گیا اور ایک عمر پردیس کی نذر ہوگئی۔ اب کچھ سستانے کا وقت ملا ہے تو مزاج کی وہی رونق اور وہی شگفتگی لوٹ آئی ہے اور وہ محفلیں انہوں نے پھر آباد کر لی ہیں--- اپنے "اعتراف" میں انہوں نے خود کو لکھا ظاہر کیا اور میں پڑھا' یوں ہم دونوں لکھ پڑھ لئے اور اب آپ کو لکھا' پڑھا رہے ہیں لیکن سچ پوچھئے تو انہوں نے بہت زیادہ کسر نفسی سے کام لیا ہے۔ ان کی پہچان وہی ہے جس کے باعث یہ کتاب ترتیب دی گئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے ان کی تحریر پڑھنی شروع کی تو داد دیئے بغیر نہیں رہیں گے--- آدمی اپنے ہنر سے پہچانا جاتا ہے اور محمد یحییٰ خان یہ ہنر رکھتے ہیں کہ سچ خواہ تلخ ہی کیوں نہ ہو' اسے پڑھنے پر مجبور کر دیا جائے۔ یہ کہانیاں اسی معاشرے کا ایک سچا عکس ہیں جن میں ہماری گمراہیاں بھی ہیں اور وہ سچائیاں بھی جنہیں ہم نے خود ہی اپنی فطرت کی دلدل میں دھنسا رکھا ہے۔ کئی کردار آپ کو ایسے ملیں گے جن سے بظاہر نفرت کرتے ہیں مگر جو محبت کے لائق ہیں اور وہ کہ جن سے ہم محبت کرتے ہیں' وہ اتنے کم ہیں کہ شاید ہم ان کے باطن سے آگاہ ہو جائیں تو ان کی صورت سے ہی بیزار ہو جائیں اور کہنے دیجئے "پل صراط" تو "داتا" کے عقیدت مندوں کے لئے اک ایسا تحفہ ہے جسے وہ مدتوں سنبھال کر رکھنا چاہیں گے۔

خالد بن حامد

۱۷ جنوری ۹۵ء

جمعرات کا روز تھا۔ پیروں فقیروں' منتوں مرادوں' فاتحہ اور خیر خیرات کا دن!۔۔۔ مگر آج جمعرات کا روز کچھ اور دلچسپیاں اور رونقیں لیے ہوئے تھا۔ فصلوں کی کٹائیاں قریب قریب ختم ہو چکی تھیں' کسان فراغت محسوس کر رہے تھے۔ مزارعوں' محنت کشوں' مزدوروں کے چہروں پہ طمانیت اور آسودگی جھلکنے لگی تھی۔ بازاروں' دوکانوں کی رونقیں واپس پلٹ آئیں۔ بھک منگوں' محتاجوں' جیب کتروں اور اچکوں کے نوٹ چھننے لگے تھے' عید میلادالنبیؐ کے مبارک موقع پر اضافی چھٹی اور بچوں کی تعطیلات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے درگاہ شریف کے بڑے میدان میں اک میلے کا رنگ جما ہوا تھا۔ چھوٹا سا سرکس' جھولے ہنکھوڑے' کھیل تماشے' موت کا کنواں' کھلونوں' مٹھائیوں نے خوب بازار گرم کر رکھا تھا۔ گزشتہ رات بھی یہاں اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ پھر جوں جوں صبح کی روشنی اترتی چلی آئی' آمدورفت اور گہما گہمی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔۔۔ کچھ دیر قبل' نماز فجر کے بعد صلوٰۃ وسلام' دعا اور اعلانات کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اب نعت خوانی کا پہلا دور شروع ہو چکا تھا۔ درگاہ شریف کے باہر والے دروازے سے اندر سیڑھیوں تک دونوں اطراف فقیر محتاج' ملنگ درویش اپنی اپنی جگہوں پہ بیٹھے کاروبار میں مصروف تھے۔ پھول پتی' ہار اور شیرینی بیچنے والے آوازوں سے زائرین کو متوجہ کر رہے تھے۔

سائیں مولا بخش کا اپنا مستقل اڈا دروازے کے اندر' دائیں جانب تھڑے کے اوپر تھا' اس کے اڈے کے اردگرد بے شمار پرانی قبریں تھیں اور یقیناً یہاں بھی کسی برگزیدہ ہستی کی قبر رہی ہو گی جسے ضرورت کے تحت برابر کر کے اچھی خاصی جگہ بنالی گئی تھی اور اب اسی نامعلوم برگزیدہ ہستی کے سینے پہ سائیں مولا بخش موتنگ دلتا رہتا تھا۔ آج بھی وہ اپنی پوری جلالت اور درویشانہ کروفر کے ساتھ اپنے چیلوں چانٹوں اور معتقدوں کے درمیان بیٹھا کیف و مستی میں جھول رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نشے پانی سے لال ہو رہی تھیں' اردگرد بیٹھے' کھڑے ملنگوں اور درویشوں کی بھی یہی کیفیت تھی۔ ہر تھوڑی دیر بعد

"یا علی" کے فلک شگاف نعروں سے فضاء لرزنے لگتی۔ پاس ہی ایک چونے گچ شکستہ قبر پر ایک ملنگ بیٹھا گھڑا بجا رہا تھا' کچھ ملنگ دھمال کے آہنگ پہ ناچ رہے تھے اور سورج کچھ اور اوپر اٹھ چکا تھا۔

سائیں مولا بخش اپنے اردگرد پھیلی ہوئی سونا اگلتی اقلیم کا واحد فرمانروا تھا۔ کسی جاٹ کی تیل پلائی ہوئی لٹھ کی مانند مضبوط' سانڈ کا سانڈ' جہنم کے شعلے برساتی ہوئی شعلہ بار آنکھیں' بھدے سے ناک کی عین پھنگ کے اوپر موٹا سا مسا جیسے غلیظ سی مکھی بھنگ کے باسی پکوڑے پہ بیٹھی ہو' تیل کے کولہو جیسا چمکتا گہرا کتھئی رنگ' سپنولیوں کی مانند لہراتی ہوئی گھنگریالی لانبی لانبی زلفیں' گینڈے سی گردن کے گرد موٹی موٹی رنگ برنگے منکوں والی مالائیں' ریچھ ایسے بالوں بھرے بازوؤں میں لوہے چاندی اور تانبے کے کڑے' انگلیوں میں موٹی موٹی مختلف نگینوں والی انگوٹھیاں اور انگوٹھے' سبز چولا' دبنگ لہجہ' حنوط کیے ہوئے مار سیاہ جیسا چندن کاٹھ کا ٹیڑھا عصا' عمر عیار کی زنبیل جیسا بڑا سا جھولا' چیچک زدہ کالا بڑا سا کشکول۔۔۔ یہ تھا ہر وقت جھولتا جھومتا اور "حق مولا سچ مولا' باقی سب رولا ہی رولا" کا سماعت پاش نعرہ لگاتا ہوا سائیں مولا' جس کے بارے میں کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ بڑا پہنچا ہوا درویش ہے' لب ہلا دے تو عرش ہل جائے۔ بند آنکھوں سے لوح محفوظ کے اکھر پڑھ لینا' مقدمے جتوانا' پھانسی سے بچالینا' محبوب کو مجبور کرنا اس کی ادنیٰ سی کرامات ہیں جو اس کے بارے میں مشہور تھیں۔ خصوصاً آس پاس کے دیہاتی لوگ تو اسے زندہ ولی کہتے۔ اس کی کرامات سے فیض یاب ہونے والی یہی بھولی بھالی مخلوق تھی جن کے پرے کے پرے اس کے گرد منڈلاتے رہتے اور خصوصاً جمعرات کو اسے نشہ پانی کی فرصت بھی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ ایسے زائرین اور معتقد درگاہ شریف حاضری سے پہلے اسی پڑاؤ پہ جمع ہوتے۔ ان کے پلوؤں' رومالوں' دوپٹوں اور گٹھڑیوں کی گانٹھیں یہیں ڈھیلی ہوتیں۔۔۔ دکھوں' فریادوں' درخواستوں' آنسوؤں اور سسکیوں کی پوٹلیاں!۔۔۔ مرغیوں کے پاؤں کی رسیاں' بوریوں اور چادروں کی گانٹھیں' دودھ اور مکھن گھی کے برتنوں کے ڈھکن' بکروں بچھڑوں کی رسیاں' تمباکو اور سبزیوں کی ڈالیوں کی مہریں اسی محصول چنگی پہ پہلے کھولی جاتی تھیں۔ یہیں سے یہ لوگ دعائیں' تعویز گنڈے' مشورے' تسلیاں' وعدے اور جھاڑ پھونکوں کی رسیدیں لے کر آگے درگاہ شریف کی جانب بڑھ جاتے۔۔۔ اس کے عقیدت مندوں میں اکثریت صنف نازک کی تھی' بیاہتا عورتیں جو اپنے گھر والوں سے شاکی ہوتیں۔ اولاد کی طلبگار بے اولاد عورتیں' ساس سے بیزار' بہو سے پریشان' ہمسائیوں اور رشتہ داروں کو راہ راست پہ لانے والی عورتیں' لڑکیاں من پسند کی منگنی شادی والی۔۔۔ نوجوان بھی' بوڑھے بچے بھی' جو شادی' محبت' نوکری یا ویزے یا کاروبار' مقدمے' جھگڑے کے بکھیڑے لے کر آتے۔ ایسے پریشان حال مردوں کو وہ کھٹی لسی کہا کرتا جو اسے پسند نہیں تھی' تازہ خوشبو میں بسا ہوا مکھن اور ادھ بلوئی ہوئی میٹھی گاڑھی لسی کھانے پینے والا بھلا کھٹی بساند بھری لسی کو پسند بھی کیسے کر سکتا تھا؟۔۔۔ ایسے عقیدت مندوں کو وہ بڑی عجلت سے

فارغ کر دیتا اور۔۔۔ "بھائی' بیبیوں کو جگہ دو"۔۔۔ کہتے ہوئے عورتوں' لڑکیوں کو قریب آنے کا موقع دیتا۔ ان جوان عورتوں اور لڑکیوں پہ اور بھی خصوصی توجہ دیتا جو گمبھیر لاینحل مسائل لے آتی تھیں' موقع محل کے مطابق ایسی عورتوں اور لڑکیوں کے سر سراپے' ہاتھ یا گال تھپتھپا کر وہ اپنے مکروہ ہاتھ تازہ مکھن کی بھینی بھینی خوشبو اور طراوت سے چکنے کرتا رہتا اور ایسے میں وہ اپنے اطراف گلزار سے کھلے ہوئے محسوس کرتا۔۔۔ ابھی گلزار کھلنے کا سے نہیں ہوا تھا لیکن وہ چشم تصور سے جوق در جوق' رواں دواں' الہڑ جواں' سرسوں کی کچی گندلوں' جو' جوار کی لہراتی ہوئی بالیوں' کچنار کی ڈالیوں' مندی کی کٹوریوں' بھنی بھسوڑیوں' صندلی سراپوں والی ہرنیوں کی سرمستیاں دیکھ رہا تھا۔ ان کی مہکار محسوس کر رہا تھا۔۔۔ بند آنکھیں' چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ' وفور نظارت سے سرشار جھولتا ہوا سر' آس پاس دیکھنے والوں کے لیے یہ حالت مراقبہ ہوتی جو اکثر طاری رہتی۔ وہ اس حالت میں اکثر اپنے ہاتھوں کو ملتا رہتا' کبھی کبھی چہرے پہ بھی ملتا' داڑھی میں کنگھی کرتا' انگلیوں کی پوروں پہ پھونکیں مارتا رہتا۔

ایک زلزلے کی دہاڑ کے ساتھ باہر ایک بڑا سا روسی ٹریکٹر مع ایک جہازی ٹریلر "لنگرانداز" ہوا۔ اس کے ساتھ ہی سائیں مولا بھی اپنے مراقبے سے عالم وجود میں پلٹ آیا۔ اس نے گردن اٹھائے یا موڑے بغیر باہر کی جانب دیکھا۔ پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے گردو پیش کا جائزہ لیا' گردن اٹھا کر لمبی سی سانس کھینچی۔

"حق اللہ' سچ اللہ!" گردن سینے پہ جھکا کر جلی ماری۔ "باقی سب رولا ہی رولا۔"

چیلوں چانٹوں نے بھی آنکھیں پٹ پٹائیں۔ صبح ہی صبح' جاگے سوئے ماحول میں اس ٹریکٹر کی آمد نے زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ پھولوں والوں نے گلاب کی پتیوں پہ پانی کے چھینٹے لگانے شروع کر دیئے۔ ادھر کے بھک منگوں نے واویلا شروع کر دیا۔۔۔ ٹریکٹر کا انجن مسلسل دہاڑ رہا تھا۔ ٹریلر سے مرد' عورتیں اتر رہے تھے۔ بیس پچیس افراد پہ مشتمل یہ زائرین حراں والی کے باسی تھے۔ ٹریلر کے دونوں اطراف مختلف سامان لٹکا ہوا تھا۔ ایک چارپائی بھی بندھی تھی' شاید کوئی بیمار یا بوڑھا بھی ساتھ تھا' ٹریکٹر پہ بھی تین جوان سوار تھے جنہوں نے شملوں والی پگڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ مڈگارڈ پہ ایک چھوٹا سا لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا اور عطاء اللہ خان نیازی کسی بے وفا کو کوس رہا تھا' سائلنسر کے پائپ کے ساتھ ایک گوٹے والا سبز جھنڈا بھی لہرا رہا تھا۔۔۔ اترنے والے زائرین شاید رات کے کسی آخری پہر کے چلے ہوئے تھے' کچھ سوئے کچھ جاگے' اترتے ہی کچھ لوگ ذرا پرے ایک ہینڈ پمپ کے گرد ہو گئے اور کچھ لوگ بندھا ہوا سامان اور ایک انتہائی لاغر بیمار سے آدمی کو اتارنے لگے۔ تھوڑی سی دیر کے بعد ٹریکٹر وہاں سے ہٹا تو شور کا وہ طوفان بھی غائب ہو گیا جو کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔ اب سب لوگ آہستہ آہستہ سائیں مولا کے تھڑے کے پاس جمع ہو رہے تھے' منہ ہاتھ دھو' صاف کر کے منزل پہ پہنچ کر تازہ دم ہو گئے تھے۔۔۔ یہ آج کی پہلی کھیپ' یہاں پہنچی تھی ان میں اکثر سائیں مولا کے معتقد تھے۔ سائیں مولا نے پھر ایک زوردار جلی داغی۔۔۔ "حق مولا' سچ مولا' باقی سب رولا ہی رولا"۔۔۔ گویا یہ اعلان تھا کہ ہوشیار' چاقو چھریاں تیار' بکرے تشریف لا چکے ہیں۔ اسی ہنکار کے ساتھ ہی اندر درگاہ شریف تک دونوں اطراف چیتھڑوں کے ڈھیروں سے جیسے بھوت اگ آئے ہوں۔ لولے لنگڑے' اپاہج' آدھے دھڑ والے' نابینا' کوڑھی' سوکھے کے مارے ہوئے' مدقوق' مجنون' جزامیے' خناقیے' جیسے صور اسرافیل کے پھونکتے ہی ناآسودہ قبروں نے عتاب زدہ گنہگار مردوں کو اگل دیا ہو۔۔۔ سائیں مولا کی بوہنی کا وقت تھا' صیاد بھی ہوشیار تھا' صید بھی تیار۔۔۔ آہستہ آہستہ لوگ سلام کر کے آگے آتے جا رہے تھے' سائیں سر ہلا ہلا کر سب کو جواب دے رہا تھا اور نیم باز نگاہوں سے ایک ایک کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ اس کے اردگرد سبز شالے' پیلی سرسوں' کچے دودھ' گوبر اور کھٹی لسی جیسی باس پھیلی تھی جو اسے بالکل پسند نہیں تھی۔۔۔ کیسے لوگ تھے؟ گاؤں میں پھول کلیاں بھی تو ہوتی ہیں۔ کچنار کے پھول' سرسوں کے پھول' مندی کے پھول' بنفشہ کے پھول' کنول کے پھول' کپاس کے پھول' موتیا کے پھول' یہ کیسے لوگ تھے صبح صبح بوہنی کے سمے' نور پیر ویلے۔۔۔ اس نے بے حد بے دلی سے جلدی جلدی ان سے نپٹنا شروع کر دیا۔ نذر نیاز جھپٹ کر وہ الٹے سیدھے دھاگے' تعویز' دعائیں' تسلیاں دے کر درگاہ شریف کی جانب اشارہ کر کے ان کو اندر دھکا دیتا جا رہا تھا اور ویسے بھی ان لوگوں میں کوئی ایسی خاص آسامی بھی نہیں تھی جس سے وہ اچھا خاصا نذرانہ بٹور سکتا۔ سب ہی دعاؤں اور برکتوں کے طالب تھے۔ سامنے سے جگہ خالی ہوئی تو تھڑے کے نیچے وہی ٹریلر والی چارپائی پڑی نظر آئی۔ قریب ایک بوڑھی عورت بیٹھی پلو سے چارپائی پہ دراز ایک مدقوق سے نوجوان کے چہرے سے مکھیاں ہٹانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی اور پائنتی کے رخ جیسے اک آگ سی لگی ہوئی تھی۔۔۔ سائیں کی سانس میں ایسا پھندا پڑا کہ سانس لینا ہی بھول گیا' بے اختیار تنویمی حالت میں تھڑے سے نیچے اتر آیا اور حواس سنبھالتے ہی اس نے اپنی آستین سے آنکھیں پونچھیں۔ پھر ذرا سوچ کر بوڑھی عورت کے پاس سرک آیا۔

"مائی! کیا ہوا اس بچے کو۔۔۔؟"

مائی ہڑبڑا کر اٹھی۔ وہ پلو درست کرتے ہوئے اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

"سائیں سرکار!" وہ رونے لگی۔ "۔۔۔ بڑی آس لے کر آئی ہوں۔۔۔ نظر کرو میرے پتر پہ سائیں سرکار!"

نظر تو سائیں سرکار کی پائنتی کی جانب اس حسن کی سرکار پہ تھی جس کے حسن آتشیں کی تپش وہ اپنے رگ و پے میں لہراتی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔۔۔ یہ بانکی جنگلی کبوتری اس سے پیشتر تو اس کی چھتری پہ نظر نہیں آئی۔۔۔ وہ اپنی یادداشت کو ٹٹول رہا تھا۔ حسن سوگوار کی اپنی ایک کاٹ ہوتی ہے اور اسی کاٹ

نے اس قصائی کو کاٹ کاٹ دیا تھا۔۔۔ سادہ' سانولی سی' سورج جنسیوں ایسی چمکتی ہوئی فراخ چتون' وحشی ہرنیوں جیسی' وحشت میں چھپی ہوئی کالی سیاہ آنکھیں' سپید موتی مالا کی مانند دانت' سراپا جیسے صندل!

"سائیں سرکار!" وہ کھسیائی۔

"ہوں۔۔۔" سائیں جیسے کسی خواب کو ادھورا چھوڑ کر بیدار ہوا۔ "ہاں' ہاں۔۔۔ اللہ رحم کرے گا۔" سائیں نے قدرے جھکتے ہوئے مریض کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ پھر ذرا حواس باختہ سا بولا۔

"یہ تیرا بچہ ہے مائی' اور۔۔۔ اور یہ تیری کون ہے؟" اس نے پائنتی کی طرف اشارہ کیا۔

"سائیں سرکار! یہ میرا اکلوتا پتر ہے۔۔۔ نمانا' سدا دا روگی! میں کرماں ماری۔۔۔"

"یہ لڑکی تیری کون ہے مائی؟" سائیں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"سرکار۔۔۔!" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ "اے میری بہو' میرے پتر دی بیوی ہے۔ یہ کہاں پئی بھی بیمار اے' تن ورے ہوگئے نے' پر جھولی خالی اے۔۔۔" وہ لڑکی کی جانب ہاتھ بڑھا کر حکم دیتے ہوئے بولی۔ "نی شادو! سلام کرنی' سائیں سرکار نوں۔۔۔"

شادو جیسے ابھی تک سوئی پڑی تھی' ساس کی ہنکار سنتے ہی جیسے ہڑبڑا کر جاگ پڑی ہو اور سوچ رہی ہو کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ اسی کشمکش میں چند لمحے بیت گئے۔ اب وہ اٹھنے والی تھی کہ سائیں خود ہی بڑھ کر اس کے سر پہ پہنچ گیا اور اپنا کانپتا ہوا تھوہر سا ہاتھ اس چھوئی موئی کے سر پہ پھیرنا شروع کر دیا۔ پھر وہ مائی کی جانب متوجہ ہوا۔

"مائی! تو نے میرے پاس آنے میں دیر کر دی ہے۔ تیرے کسی دشمن نے تیرے پتر اور بہو پہ بڑا سخت کارا کیا ہوا ہے' میعاد ختم ہونے والی ہے۔" وہ شادو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اس لڑکی پہ تو بڑا ہی سخت کارا ہے' کالا جادو۔۔۔ تم دیکھ لو' اس کی آنکھوں میں کالا جادو ہے کہ نہیں؟" اس نے یہ کالا جادو دکھانے کے لیے شادو کی ٹھوڑی کے چاہ زنخداں میں انگوٹھا رکھ کر باقی انگلیوں سے چہرہ اوپر اٹھایا۔ "دیکھ' مائی! اس کی آنکھوں میں کالا جادو۔۔۔"

مائی کی موتیا بند آنکھیں جادو کیا دیکھتیں' سائیں نے یہ جادو خود ہی دیکھا۔ مائی نے آگے بڑھ کر سائیں کے پاؤں پکڑ لیے۔

"سرکار! اسی واسطے تو میں ان دونوں کو آپ کے پاس لائی ہوں۔ میرا کوئی کمائی کرنے والا نہیں۔۔ اک پتر' تو وہ بھی لاچار۔۔۔ مجھ بیوہ پہ رحم کریں۔ میں ساری عمر دعائیں دوں گی۔"

"مائی' یہ بڑا مشکل کام ہے۔۔۔" وہ لفظ مشکل پہ زور دیتے ہوئے بولا۔ "میں کوشش کروں گا' اس کے لیے مجھے بڑا سخت جلالی چلہ کاٹنا پڑے گا اور تم سب کو میرا ساتھ دینا پڑے گا' خاص کر اس لڑکی کو۔۔۔" وہ شادو کی جانب بڑے جلالی انداز سے دیکھ کر بولا۔ پھر اس نے اپنے جھولے سے ایک ڈوری

نکالی جس میں ایک فیروزی رنگ کا منکا پرویا ہوا تھا۔ شادو کی جانب بڑھاتے ہوئے حکم دیا۔ "یہ بابرکت ڈوری لے' اسے اپنے گلے میں ڈال لے۔ جب تک تو اسے پہنے رکھے گی' ہر قسم کی پریشانی سے بچی رہے گی۔۔۔ یہ ڈوری تجھے بامراد کر دے گی۔"

شادو نے ایک جھٹکا کھایا' جھپٹ لینے کے انداز میں ڈوری لے لی اور پہلی مرتبہ اس کے لب ہلے۔

"مجھے میری مراد مل جائے گی' میں بامراد ہو جاؤں گی سائیں سرکار!"

"ہاں۔۔" سائیں مولا نے اس کی وارفتگی کا یہ عالم دیکھ کر مزید کہا۔ "تمہیں میرے پاس ہر جمعرات کو آنا پڑے گا۔ جب تک تمہارے سر سے یہ جادو کا اثر دور نہ ہو جائے' تمہیں میرا ہر حکم ماننا پڑے گا۔۔۔ اب تم اپنے شوہر کو باؤلی کے پاس مدرسے کے برآمدے میں لے جاؤ' یہ آگے بائیں طرف راستہ جاتا ہے۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ "اسے پہلے سلام کراؤ' لنگر وغیرہ کھلاؤ۔ اللہ فضل کرے گا۔۔۔ اور سنو! تم تھوڑی دیر تک واپس آنا مگر اکیلی' اپنی ساس کو تکلیف نہ دینا۔ میں تمہیں پانی دم کر کے دوں گا۔ یہ زوال کا وقت ہے' اس وقت دم نہیں ہو سکتا۔"

مائی نے سائیں مولا کی ہدایات سن کر دو چار آدمیوں کو بلایا اور چارپائی اٹھوا کر اب وہ سارے درگاہ شریف کی جانب جا رہے تھے۔ ان لوگوں کے روانہ ہوتے ہی سائیں مولا نے ایک ملنگ کو پانی لانے کا حکم دیا۔ اس کے اندر ایک آگ سی دہک رہی تھی جو دھیرے دھیرے اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی' وہ بڑی شدت سے پیاس محسوس کر رہا تھا۔ اس کے حلق میں جیسے کسی نے گرم گرم ریت بھر دی ہو' ہونٹوں پہ پپڑی سی جم گئی تھی۔ پانی کا بھرپور پیالہ پی کر اسے قدرے سکون کا احساس ہوا تو وہ پیچھے تھڑی پر ہی ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ آج اسے کیا ہو گیا ہے؟ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی عورت کے سامنے ایسے ریشہ خطمی ہوا ہو۔۔۔ اسے اپنی بے بسی اور ایسی لاچاری پہ سخت تعجب ہو رہا تھا۔ دل' دماغ علیحدہ علیحدہ سمتوں کی طرف جا رہے تھے' دونوں کا آپس میں کوئی تال میل نہیں تھا۔۔۔ یہ نہیں کہ وہ عورت کے وجود یا اس کے لمس سے ناآشنا تھا۔ اس کی مکروہ زندگی میں تو بے شمار عورتیں آئیں جن کی گنتی بھی اسے یاد نہیں تھی مگر وہ روگ پالنے کا عادی نہ تھا اور نہ اس کے موجودہ پیشے میں اس کی گنجائش تھی۔ وہ آئی چلائی کا قائل تھا۔۔۔ اس وقت وہ متوحش نگاہوں سے درگاہ شریف کی جانب دیکھ رہا تھا۔ شادو چارپائی کے پیچھے پیچھے یوں جا رہی تھی جیسے کوئی کمسن بچی بھری بھیڑ میں پھنسی ہوئی کسی اپنے کو تلاش کر رہی ہو۔ اس کے سرخ پراندے کے بڑے بڑے پھندنے صاف دکھائی دے رہے تھے اور وہ انہیں یوں گھبرایا ہوا دیکھ رہا تھا جیسے وہ پھندنے نہ ہوں اس کا دل' جگر اور کلیجہ ہوں۔۔۔ اب کچھ اور لوگ بھی آس پاس آ کر کھڑے ہو گئے جو اس کے مراقبے سے باہر نکلنے کے منتظر تھے۔ اسے بادل نخواستہ ان کی جانب متوجہ ہونا پڑا اور حق اللہ' سچ اللہ کی جلی سے لوگوں کو حاضری کی نوید دے کر ایسا

مشغول ہوا کہ اسے وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا--- کھڑے کھڑے وہ قدرے تھک بھی گیا تھا۔ اردگرد کے لوگ' دوکاندار' اس کے اپنے چیلے چانٹے بھی اس کے اس طرح تھڑے کے نیچے کھڑا ہونا سمجھ نہیں پا رہے تھے' ابھرتے سورج کی کرنوں کو اس نے اپنے دائیں گال پہ محسوس کیا تو ایک ملنگ سے پانی پھر طلب کیا اور وہیں کھڑے کھڑے پانی کا پیالہ ایک ہی سانس میں چڑھا کر لوگوں کی آمدورفت کا جائزہ لیا--- کاروبار درگاہ ابھی اپنے شباب پر نہیں آئے تھے پھر بھی اچھی خاصی رونق ہو گئی تھی۔ اس نے ایک بھرپور جمائی توڑی' ایسے میں باہر دروازے کے پاس ایک ملٹری کے ٹرک نے بریکیں لگائیں اور چار پانچ جوان نیچے کود پڑے۔ صاف ستھرے' گبھرو! دو داڑھیوں والے' ایک مچھیل' باقی بابو ٹائپ--- اتر کر وہ پھولوں والی دوکان کی جانب بڑھ گئے اور پھر پھولوں کے لفافے ہاتھوں میں تھامے درگاہ شریف کی جانب بڑھنے لگے۔ مولا سائیں ان کو دیکھ رہا تھا۔ ایک داڑھی والے اور مچھیل کے سوا باقی سارے شاید پہلی بار یہاں آئے تھے--- سائیں مولا نے کمال کا حافظہ پایا تھا' آنے جانے والوں پہ اس کی گہری نظر ہوتی تھی۔ یہ اس کے پیشے کی ضرورت بھی تھی' احتیاط اور حالات کا تقاضا بھی--- اڑتی چڑیا کے پر گننا' چال سے چال چلن کا پتہ چلانا' چہرے پڑھنا' دکھتی رگوں کو ٹٹولنا' ظاہری حالت سے باطن پڑھنا' جیب کا وزن' نیت کی خرابیاں' عشق کے چکر' وارداتیوں' اچکوں' جیب تراشوں کے وطیرے' منشیات بیچنے اور استعمال کرنے والوں کے اشارے' مشکوک اور بھگوڑوں کی حرکات' سفید کپڑوں میں سرکاری کارندوں کی سرگرمیاں' یہ سب کچھ اس کے روز مرہ کے پڑھے پڑھائے سبق تھے جن کا وہ استاد بھی تھا اور ماہر بھی--- وہ ان فوجیوں کی نفسیات سے بھی اچھی طرح واقف تھا لہٰذا جیسے ہی وہ اس کی زد میں آئے' اس نے "حق اللہ' سچ اللہ" کا برسٹ مارا۔ وہ طرح دے گئے۔ اس نے مارٹر کا راؤنڈ پھینکا۔

"مراد پوری ہو' فقیر کی دعائیں لیتے جاؤ' مولا ترقیاں دے---"

پانچوں سواروں میں ایک ڈھے گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا' ساتھیوں سے کہا کہ تم چلو میں آتا ہوں۔ سائیں مولا نے اسے رکتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"آ بچہ' ادھر آ--- رب مراد پوری کرے۔"

قریب پہنچ کر اس نے سلام کیا--- یہ مرد تھا' شاہ مراد! آرٹلری میں کمز' دسویں پڑھا ہوا' خالص سونے کی اشرفی ایسا کھنکتا ہوا' کھرا' اکھڑ' بلا کا جفاکش' نڈر' ضدی' بات کا دھنی' دشمنوں کا دشمن' دوستوں کا دوست' دل کا غنی' وفا پیشہ' عورت سے دور' شراب جوانی مخمور--- سائیں مولا اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

"آ و بچہ' آ و---" حافظ آباد کے دیسی جو نیا کھدر کی کھلی شلوار قمیض میں ملبوس اس جوگی نے اپنا بڑا سا سر سائیں مولا کے آگے نیہوڑ دیا۔ سائیں مولا نے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے دعا دی۔ "اللہ مرادیں پوری کرے---"

مراد نے پانچ روپے کا نوٹ کشکول میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"سائیں جی! آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"بچہ! اللہ جانی' جان ہے۔ درویش دلوں کے بھید جانتے ہیں۔"

"پھر تو آپ جانتے ہوں گے کہ مراد کی مراد کیا ہے--- میری بے بے نے مجھے بڑی منتوں مرادوں سے پایا تھا اسی لیے میرا نام مراد رکھا تھا لیکن سائیں جی! میں مراد ہوتے ہوئے بھی ابھی تک بے مراد ہوں---"

"ہاں---" سائیں مولا نے آسمان کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اس کے ہاں دیر ہے' اندھیر نہیں--- تجھے منزل مراد ضرور ملے گی۔"

"جی' سائیں جی---" وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر بولا۔

اسی لمحہ شادو آتی دکھائی دی۔ سائیں مولا کی عقابی آنکھوں نے اس جنگلی کبوتری کو اپنی جانب آتے ہوئے دیکھ لیا تھا' اس کے سنگ ایک بالڑا سا بچہ بھی گھسٹ رہا تھا۔ سائیں مولا کے ماتھے پہ اک تریلی سی پسینے کی پھوٹی' ہاتھ پاؤں پہ جیسے چیونٹے سے رینگنے لگے۔ اس کے دماغ کا فیوز جیسے اڑ گیا' جسم اور دماغ کا رابطہ کٹ گیا جیسے اس کا کنٹرول سسٹم بھک سے اڑ گیا ہو۔ وہ ہذیان بک رہا تھا۔

"ہاں' ہاں--- تجھے منزل ضرور ملے گی' شاد باد منزل مراد--- ہاں' وہ منزل آ رہی ہے--- جاؤ' جاؤ--- حق اللہ' سچ اللہ!"

مراد مودب کھڑا تھا' سائیں مولا کی دعاؤں سے اپنا دامن مراد بھرنا چاہتا تھا اور سائیں مولا کے مبہم اشارے سمجھ نہیں پا رہا تھا' کسی واضح اشارے کا منتظر تھا۔ سائیں مولا کی یہ حالت عقیدت مندوں کے نزدیک جذب و حال کی کیفیت تھی۔ سب لوگ اس کی بڑبڑاہٹ سے اپنے اپنے مطلب اور اشارے نکالنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ مراد بھی ان لوگوں میں شامل تھا کہ ایسے میں شادو بھی پہنچ گئی اور عین مراد کے پیچھے آ کھڑی ہوئی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی لمبے سفر کے بعد کسی کو کھوجتے کھوجتے تھک ہار کر اس چھتناور شاہ بلوط کی ٹھنڈی چھاؤں اور پناہ میں آ گئی ہو--- سائیں مولا کی حالت دیدنی تھی' اپنے اعصاب کی بچی کھچی قوتوں کو جمع کرنے کی کوشش میں غلطاں تھا۔ اس کے سامنے کی چٹان کی اوٹ میں وہ جادوگرنی اسے دیکھ رہی تھی جس کے فسوں کار حسن کے سحر نے اس دیو کی جلالت و ہیبت' قوت و اختیار کے سارے سلسلے دھواں دھواں کر دیئے تھے۔ وہ دانستہ اس سے آنکھ ملانے سے گریزاں تھا۔

"سائیں جی! میرے لیے کیا حکم ہے---؟" مراد نے ہمت کر کے اس جمود کو توڑنے کی جرات کی۔ سائیں مولا نے آہستہ سے سر اٹھا کر اسے گھورا۔

"بچہ' تیری مراد ضرور پوری ہوگی۔۔۔" وہ کسی کنویں کی تہہ سے بول رہا تھا۔

شاہ مراد نے فرط ممنونیت سے سائیں مولا کے ہاتھوں پہ بوسہ دیا اور ساتھ دس روپے کا ایک کرارہ نوٹ کشکول میں ڈالتے ہوئے عرض کرنے لگا۔

"سائیں جی! جب آپ نے شاوباد منزل مراد کہا تھا' میں نے اشارہ پالیا تھا کہ میری مراد ضرور پوری ہوگی۔۔۔"

سائیں مولا کو قطعی یاد نہیں تھا کہ اس نے یہ کہا بھی تھا یا نہیں؟

"ہاں' ہاں۔۔۔" سائیں مولا بوکھلایا' اس بوکھلاہٹ میں اس کی نظر شادو پہ پڑی۔ چند ثانیے یا کئی صدیاں وہ نار سے بندھا رہا پھر اس کے ہونٹ کپکپائے"۔ "شادو۔۔۔!" بے اختیار اس کے ہونٹوں سے یہ نام پھسل پڑا اور اب نظر بھی پھسل کر مراد پہ آ گئی۔

شادو اپنا نام سن کر بے اختیار "جی" کہہ اٹھی' انجانے میں اس کے ہاتھ مراد کے شانوں پہ زخموں پہ پھاہے کی مانند آ پڑے۔۔۔ شادو کے ہاتھوں میں اس کی مراد تھی۔ اس کے کانوں میں جیسے شہنائیاں سی بج اٹھیں۔ وہ اپنے آپ میں سمٹ کر چھوئی موئی کا پھول بن گئی۔ سائیں مولا نے شادو کی "جی" کو اپنی جان پہ جھیلا۔ اب بھی اس کے اعصاب' اس کے دماغ اور جذبات کا ساتھ نہیں دے رہے تھے اور وہ اسی گومگو والی کیفیت کے زیر اثر تھا۔ بعد' اس نے ایک ڈوری کھینچ کر باہر نکالی' جس میں سرخ منکا چمک رہا تھا۔

"یہ لو۔۔۔" اس نے مراد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اس ڈوری کو اپنے پاس رکھو۔۔۔ لیکن سنو!" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "مراد! منزل پانے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں' بڑے جوکھم جھیلنے پڑتے ہیں۔ تمہیں سات جمعراتیں یہاں آنا پڑے گا میرے پاس۔۔۔ میں تمہیں ایک وظیفہ بھی بتاؤں گا اور ہاں' ممکن ہے کہ جسے تم منزل سمجھو وہ محض دھوکہ ہو۔۔۔ منزل تک پہنچنے کے لیے میں رہنمائی کی کوشش کروں گا' دعا بھی مانگوں گا۔۔۔ میرے پاس آتے رہو۔"

پھر حق اللہ' سچ اللہ کا نعرہ بلند کرتے ہی اس نے مراد کو درگاہ شریف کی جانب جانے کا اذن دیا۔ مراد نے ہلکا سا سر خم کرتے ہوئے سائیں مولا کو تعظیم دی' متبرک ڈوری کو مٹھی میں اس طرح چھپا لیا جیسے بچے جگنو پکڑ کر نرم نرم دباؤ کے ساتھ اپنی مٹھی میں بند کر لیتے ہیں اور بچوں کی طرح ہی اس کی من مٹھی میں مسرت کے لاکھوں جگنو جھلمل جھلمل جگمگا رہے تھے۔ اسی انبساط کے عالم میں کسی مخمور مور کی مانند جھکائی لی تو پیچھے تاروں بھری کہکشاں سے ٹکرا گیا۔ اک چھناکا سا ہوا اور یہ لمحہ کتنی صدیوں تک پھیلتا چلا گیا' کون جانے؟۔۔۔ شادو' مراد کے قدموں میں دھول کی طرح بچھی پڑی تھی' سانسوں کا ارتعاش ابھی تھما نہیں تھا۔ مراد نے شادو کے کاندھے پکڑ کر اسے اوپر اٹھایا اور زبان ہلائے بغیر مجوب آنکھوں سے معذرت چاہی۔ اسے اٹھاتے وقت مٹھی کا بند جگنو بھی آزاد ہو گیا۔ شادو کی مٹھی بھی خالی تھی جہاں کچھ دیر پہلے

سائیں مولا کی دی ہوئی فیروزی منکے والی ڈوری موجود تھی۔ سائیں مولا نے جلدی سے لوگوں کو ہٹایا اور شادو کو ہلکی سی فہمائش کی کہ اسے اتنی بھیڑ میں کھڑا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پھر بیک وقت دونوں کو اپنی ڈوریاں یاد آئیں جو نیچے گر پڑی تھیں۔ ایک مرتبہ پھر چھناکا ہوا' لاشعوری طور پر دونوں بیک وقت جھکے مگر احتیاط کے ساتھ اور اب دونوں کی ہتھیلیوں پہ نئی لکیروں کے جال میں ایک ایک مچھلی پھنسی ہوئی تھی اس تبدیلی کے ساتھ کہ مچھلیاں بدل گئی تھیں۔ شاہ مراد سرخ منکے والی ڈوری کی جگہ فیروزی منکے والی ڈوری لے کر یوں اڑا جیسے عقاب کی ڈوری کھول دی گئی ہو' جیسے اسے نئے پر و بازو مل گئے ہوں۔ شادو اسے تیز تیز قدموں سے درگاہ شریف کی جانب رواں دیکھ کر مسکرا رہی تھی' اس نے بھی بدلی ہوئی ڈوری دیکھ لی تھی۔ وہ واپس سائیں مولا کی جانب پلٹی اور ڈوری دکھا کر بولی۔

"سائیں سرکار! میری ڈوری بدل گئی ہے۔۔۔" اس نے مٹھی بند کر کے ہاتھ سینے پہ رکھ لیا۔

"ہاں میں نے دیکھ لی ہے۔۔۔" اس نے آنکھیں بند کر لیں' اردگرد لوگ اور ملنگ درویش بھی یہ نیا تماشا دیکھ رہے تھے جو آج تک یہاں دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔ سائیں مولا نے آنکھیں کھولیں۔۔۔ "لا' یہ ڈوری واپس کر۔۔۔ یہ ڈوری اس فوجی مراد کی ہے جو تیری ڈوری لے گیا۔۔۔ یہ ڈوری تیرے حساب کی نہیں ہے' تجھے راس نہیں آئے گی۔۔۔"

شادو نے اپنا ڈوری والا ہاتھ سینے سے ہٹا کر پیچھے کر لیا۔ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے روہانسی سی ہو کر بولی۔

"خدا واسطہ سائیں جی! ڈوری مجھ سے نہ لیں۔۔۔ جس کے نصیب میں جو تھا اسے خود بخود مل گیا۔ یہ بھی آپ کی مہربانی ہے سائیں سرکار! یہی سرخ رنگ۔۔۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر مٹھی کھول سرخ منکا دکھاتے ہوئے کہا۔ "میرا من پسند رنگ ہے۔" پھر پراندہ آگے سینے پہ ڈالتے ہوئے بولی۔ "دیکھیں سرکار! میرے پراندے کا رنگ' یہ میری مندری کے نگ کا رنگ' میری ناک والی تیلی کا نگ' میری چوڑیاں' میرے دوپٹے کا رنگ' میرا رومال۔۔۔" وہ اپنی کلائی دکھانے لگی جہاں کرتے وقت چوڑی ٹوٹنے سے ہلکی سے خراش سے ایک ننھی سی خون کی بوند چمک رہی تھی۔ "یہ دیکھیں میرے لہو کا رنگ' میرے سفنوں کا رنگ' میری سدروں کا رنگ۔۔۔"

وہاں اب رنگ ہی رنگ تھا' وہ خود بھی فرط جذبات سے بیربہوٹی ہو رہی تھی اور یہی رنگ اب سائیں مولا کی شعلہ بار آنکھوں میں اترا ہوا تھا۔ وہ بھاڑ سا منہ پھاڑے' پھیلتی آنکھوں سے اس ننھی سی لالی کی شان پرواز دیکھ رہا تھا جس کے آگے آگے ایک شاندار سرخاب نے اڑان بھری تھی۔ اس کے اندر کا مولا اپنی بے بسی اور خجالت کی مٹی چاٹ رہا تھا۔

"سائیں جی۔۔۔!" وہ لجائی۔ "میں بڑی بدنصیب ہوں' آج آپ کی دعا برکت سے مجھے

خوشیوں کی سوغات ملی ہے تو یہ خوشیاں میری جھولی میں ڈال دیں ـــــ" وہ اپنا دوپٹہ پھیلاتے ہوئے بولی۔ "مجھے میری مراد دے دیں ـــــ"

"شادو ـــ!" سائیں مولا نے ایک اور راستہ تلاش کر لیا۔ "تجھے تیری مراد مل جائے گی مگر تیرے سر سے بدنصیبی کا سایہ دور کرنے کے لیے مجھے سخت چلہ کاٹنا پڑے گا۔ تجھے سات جمعراتیں یہاں میرے پاس آنا پڑے گا ـــ دیکھ!" وہ نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولا۔ "تیرا خاوند سخت بیمار ہے' دشمنوں نے اس پہ جادو کرایا ہوا ہے جس کا توڑ مجھے تلاش کرنا پڑے گا' فی الحال اسے تیری ضرورت ہے ـــ کسی فقیری ڈوری تجھے واپس کر دینی چاہیے۔ تو سر سائیں والی ہے ـــ" وہ اس کے بیمار خاوند کا سہارا لے کر اسے رام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"سائیں سرکار! آپ نے خود کہا تھا کہ مجھے مراد مل جائے گی' آپ تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ مجھے کیا چاہیے؟ آپ تو دلوں کے بھید جانتے ہیں' بتائیے کہ یہ ڈوری میں نے خود بدلی ہے؟ ـــ یہ ڈوریاں آپ نے خود بدلی ہیں سرکار! میں جانتی ہوں' آپ میرا امتحان نہ لیں۔ میں تو پہلے ہی بڑے سخت امتحانوں میں پڑی ہوئی ہوں۔" وہ اب باقاعدہ رو رہی تھی' روتے روتے ہی وہ پیچھے ہٹی اور سلام کرتے ہوئے بولی۔ "سائیں جی! اگر آپ میری نہیں سنتے تو میں کیا کہوں؟ ـــ اندر جاتی ہوں' اگر میری نیت ٹھیک ہے تو مجھے میری مراد ضرور ملے گی ـــ ملنگنی کو بچی کے در سے خیر چاہیے' وہ دروازے پہ دلوا دے یا پھر اندر بلا کر دے دے۔"

اب وہ بچی کے گھر' اندر جا رہی تھی۔

آج جمعرات کا دن اس لحاظ سے بھی اہم تھا کہ سائیں مولا کے ترکش کا چھوڑا ہوا ہر تیر واپس پلٹ کر اسی کو چھید رہا تھا' باقی بچے ہوئے تیر بھی اسے کند اور اپنی جان کے دشمن دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی پیشہ ورانہ زندگی میں کوئی ایسی مثال نہیں تھی کہ وہ اس طرح سے اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا ہو۔ ایک کمزور سی دیہاتی لڑکی اور ایک معمولی سے فوجی کے ہاتھوں اپنی نظر میں اتنا ذلیل اور بے بس ہوا ہو ـــ رہ رہ کے شادو کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا منہ چڑا رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس دیہاتی لڑکی میں وہ کون سا جادو ہے' جس کے اثر نے اس کی ساری قوتوں کو پاش پاش کر دیا ہے اور کاش! وہ بھی ایک معمولی کی زندگی بسر کر رہا ہوتا۔ شادو ایسی لڑکی اس کی زندگی میں ہوتی' وہ بھی مراد ایسا جوان رعنا ہوتا' اس کے پاس بھی صدق ہوتا' کوئی سچا جذبہ ہوتا' کوئی مراد ہوتی ـــ وہ اب درگاہ شریف کے مینار کی جانب دیکھ رہا تھا جس کی جانب شادو کے قدم اٹھ چکے تھے جبکہ اس کے اپنے قدم اپنی سوچ اور ذات کی گہری' اندھی' بے آب و بے فیض باؤلی کی دلدل میں دھنسے ہوئے تھے جہاں اس کے ارادوں کے ان گنت مہیب حشرات الارض اس کی بوٹیاں نوچ رہے تھے ـــ اس کے ارد گرد اب بھی کافی عقیدت مند

موجود تھے جو اس کے کملی آنکھوں والے مراقبے سے واپسی کے منتظر تھے ـــ کچھ لوگ واپسی پہ زیارت کی سوچ کر آگے بڑھ جاتے۔ نوٹوں اور ریزگاری سے کشکول کا پیٹ بھر رہا تھا۔ اسی کشکول میں دو نوٹ ایسے بھی پڑے ہوئے تھے جنہوں نے اسے دنیا کا غریب ترین بھکاری بنا دیا۔ اس کی اپنی ہی بٹی ہوئی کچی ڈوریوں نے ایسے مضبوط بندھن جوڑ دیئے تھے جن کو علیحدہ کرنے کی کوشش ناکام میں خود اس کا بند بند جوڑ جوڑ کھل گیا اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سینکڑوں کالے کالے زہریلے سنپولیئے ڈوریوں کا روپ لے اس کے جھولے میں کلبلا رہے ہوں۔ جیسے 'بلائیں' اس کی گردن کے گرد حلقہ تنگ کر رہے ہوں ـــ وہ لاشعوری طور پر اپنی گردن سہلانے لگا۔ اس اذیت اور آزار میں کئی صدیاں بیت گئیں اور اسے یہ احساس بھی نہ رہا کہ اذان کب شروع ہوئی؟ ـــ حی علی الفلاح ـــ ہوا کے دوش پہ لہراتی ہوئی برقی لہروں نے اس کے سکتے کو توڑا لیکن پتھرائی ہوئی نظریں ابھی تک گنبد پہ جمی ہوئی تھیں اور گنبد سے ذرا پرے مسجد کے مینار کے نیچے حوض کے کنارے وضو کرنے والوں میں مراد بھی شامل تھا ـــ آج نماز میں لطف ہی کچھ اور تھا۔ انگ انگ' روم روم سجدے کر رہا تھا' جبین نیاز جھکی ہوئی تھی جیسے لاڈلے' ضدی بچے کسی کھلونے کے لیے اچانک چپ سادھ لیتے ہیں۔ سامنے قاضی الحاجات تھا ـــ دائیں جانب دیوار کے ساتھ زنانہ حصے میں کیسی شادمانیاں تھیں۔ بائیں طرف باؤلی کے پاس برآمدے میں ایک نیم جان مصیبتوں کا عادی بے سدھ پڑا تھا اور پیچھے سائیں مولا بخش! جس نے اپنی نمازیں اور روزے بخشوائے ہوئے تھے' جو عقل کے اندھوں میں مرادوں کی ریوڑیاں بانٹ رہا تھا ـــ پھر نماز کے بعد اکثر نمازی جا چکے تھے۔ وہ بھی درمیان سے اٹھ کر پیچھے ایک خالی جگہ پہ سنتیں پوری کرنے کے لیے آ گیا۔ سنتیں پوری کرنے کے بعد اس نے شاید نفل شروع کر دیئے۔ قیام' رکوع' قعدوں' سجدوں میں طوالت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس پر لرزہ طاری تھا' آنکھوں میں جھڑی لگی ہوئی تھی۔ ایسے ہی ایک طویل سجدے میں پڑا ہوا تھا کہ کوئی شخص اس سے ٹکرایا۔

"معاف کرنا جی ـــ"

ایک نابینا بزرگ نے معذرت چاہی' وہ جھک کر اسے ٹٹولنے لگا۔ مراد نے سلام پھیر کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"بابا جی' آپ کو چوٹ تو نہیں لگی ـــ؟"

"نہیں پتر! میں بالکل ٹھیک ہوں ـــ اللہ معاف کرے' میری وجہ سے تمہاری نماز ٹوٹ گئی ـــ"

"بابا جی! میں سلام پھیرنے ہی والا تھا ـــ اور ویسے بھی میں نفل پڑھ رہا تھا۔ آپ نہ آتے تو شاید میں ہمیشہ سجدے میں ہی پڑا رہتا۔"

بابا جی بڑی نرمی سے اس کے ہاتھوں کو محسوس کرتے ہوئے مسکرائے۔ "ـــ معلوم ہوتا ہے کہ

رب سوہنے سے کچھ مانگ بیٹھے ہو اور اب ضد بھی کر رہے ہو---؟"

وہ مسکرایا' بڑے ادب سے اٹک اٹک کر کہنے لگا۔ "آپ نے صحیح اندازہ لگایا--- مانگا تو کچھ ضرور ہے مگر ضد نہیں کی' اپنی عاجزی پیش کر رہا تھا--- بابا جی! وہ بے نیاز چاہے تو بن مانگے جھولیاں بھر دے' نہ چاہے تو بھری جھولیاں خالی دے۔ وہ بہتر جاننے والا ہے---"

بابا جی نے اس کا بازو' کندھا ٹٹولتے ٹٹولتے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا۔ "تم نے سچ کہا--- وہ یقیناً بہتر جاننے والا اور بہتر کرنے والا ہے--- تم فوجی جوان لگتے ہو اور معلوم ہوتا ہے' ماں کے دودھ کو بھی سنبھال کے رکھا ہوا ہے---"

"ہاں بابا جی' اللہ کے فضل و کرم سے میں نے اپنے صلب کی شرافت اور مائی کے دودھ کو سنبھال کر رکھا ہوا ہے--- فوجی بھی ہوں۔ پہلے کھاریاں تھا اور اب یہاں آگیا ہوں مگر آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا' آپ تو دیکھ نہیں سکتے؟" اس نے تعجب ظاہر کرتے ہوئے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"ہاں بیٹا! تم نے اچھا سوال کیا--- میری یہ آنکھیں اندھی ہیں مگر میرے سوہنے اللہ نے میرے من کو روشن کر دیا ہے اور اس کے فضل و کرم سے میں آنکھوں والوں سے زیادہ دیکھ اور محسوس کر سکتا ہوں---"

"تو پھر آپ نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے کیوں نہیں دیکھا؟" وہ عجلت سے بولا۔

بابا جی نے بڑی ملائمت سے جواب دیا۔ "اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی۔ اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو تم ایسے بھلے مانس سے ملاقات کہاں ہوتی' تمہاری یہ بھلی بھلی باتیں کہاں سننے کو ملتیں؟--- پترا! اللہ کے ہر کام میں کہیں نہ کہیں کوئی بہتری چھپی ہوئی ہوتی ہے'--- ضروری نہیں کہ ہم اسے سمجھ سکیں--- اور ہاں! اپنے من کو مندر نہ بناؤ' مسجد بناؤ۔"

"من مندر---" وہ دہراتے ہوئے بولا۔ "میرا من مندر ہے' پر آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ نہ سمجھتے ہوئے پریشان سا ہو گیا۔

"ہاں' تیرا من مندر ہے---"

بابا جی نے اسے دروازے سے ہٹ کر باہر برآمدے میں چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ باہر آکر وہ کنارے پہ درخت کے نیچے سائے میں بیٹھ گئے اور گہرا سانس لے کر پوچھنے لگے۔

"بھلا بتاؤ' مسجد میں کیا ہوتا ہے---؟"

"مسجد میں کیا ہوتا ہے؟--- مسجد خدا کا گھر ہے' ظاہر ہے کہ وہاں خدا ہوتا ہے۔" اس نے بلا تردد جواب دیا۔

"شاباش' بالکل ٹھیک--- اور مندر میں---؟"

وہ کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ "مندر کبھی دیکھا تو نہیں' پر سنا ہے کہ وہاں بت ہوتے ہیں--- ہندو وہاں پوجا پاٹ کرتے ہیں۔"

"صحیح--- اب سچ سچ بتاؤ کہ تمہارے من میں بت ہے یا خدا؟"

وہ سٹپٹا سا گیا' کچھ دیر خاموش رہا۔

"ہاں--- میرے من میں کوئی اور تھا' کسی اور کا خیال تھا۔" پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "آپ نے کہا تھا کہ میں نے ماں کا دودھ سنبھال کر رکھا ہے--- بابا جی! خدا جانتا ہے کہ میرے من میں کھوٹ نہیں--- پاک وطن کا فوجی ہوں اور دوسروں کی عزت' عفت اور جان مال کی حفاظت کرنا ہمارے فرائض میں شامل ہے--- ویسے بابا جی! اگر کوئی اچھا لگے یا کسی کے لیے محبت کے پاکیزہ جذبات رکھنا یا کسی کو عزت' تحفظ' شرافت دینے کی خواہش رکھنا کوئی گناہ تو نہیں--- میں نے آج تک اپنی نظر و نیت کی اللہ کی توفیق سے حفاظت کی ہے مگر آج مجھے ایک ایسا چہرہ نظر آیا جس کو دیکھ کر میرے من میں ہزاروں دیئے روشن ہو گئے اور مجھے اس کا من بجھا بجھا لگا' میں اس کے روگ کو نہیں جانتا--- آج جو کچھ بھی ہوا اسے محض اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ یقیناً اس کے پیچھے قدرت کا ہاتھ ہے' جیسے قدرت نے اسے میرے لیے سنبھال رکھا ہے اور مجھے اس کے لیے---"

بابا نے ایک ٹھنڈی سی سانس بھری اور اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! تم غیرت مند بھی ہو اور درد مند بھی' بہادر بھی اور بخت آور بھی--- اللہ تمہارے خیالات اور جذبات کی پاکیزگی کو نظر بد سے بچائے رکھے---" پھر وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ "آؤ میرے ساتھ' میں تمہیں اللہ والوں کے قدموں میں پہنچا دیتا ہوں' ان کے وسیلے سے اپنے لیے خیر طلب کرو۔ مجھے یقین ہے تم مایوس نہیں لوٹو گے--- میرا نام حافظ شہاب الدین شاہ ہے۔ یہاں اکثر لوگ مجھے بابا شہابا بھی کہتے ہیں۔ میں درگاہ کے پیچھے پرانی باؤلی والے مدرسے میں بچوں کو قرآن پڑھاتا ہوں اور اکثر درگاہ شریف کی چوکھٹ کے پاس بیٹھتا ہوں۔"

وہ اب سیڑھیاں اتر کر درگاہ شریف کی جانب آرہے تھے' کبوتروں والے چبوترے کے پاس پہنچ کر رک گئے۔

"یہاں جب بھی سلام کے لیے آؤ ان کبوتروں کے لیے دانہ ضرور لیتے آؤ۔ یہ کبوتر اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو حضرت شاہ امامؒ کے کاندھوں اور ہاتھوں پہ بیٹھ کے چوگا لیتے تھے--- ہاں بھئی' باتوں باتوں میں تمہارا نام پوچھنا بھول گیا۔"

مراد نے کبوتروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرا نام مراد ہے--- شاہ مراد!"

"مراد! کبوتروں کو بڑے پیار سے دانہ ڈالا کرو' بامراد ہو جاؤ گے--- اچھا' اللہ وارث!"

بابا جی جاتے جاتے رک گئے۔

"۔۔۔ہاں پتر! مسجد میں جو مجھ سے انجانے میں گستاخی ہوئی' میں ایک بار پھر معافی مانگتا ہوں۔"

مراد نے آگے بڑھ کر ان کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا اور بڑی عاجزی سے کہنے لگا۔ "سرکار! آپ کی اسی ٹھوکر نے تو میری آنکھیں کھولی ہیں۔ مجھے یہ رستہ دکھایا ہے' یہاں تک پہنچایا ہے۔ آپ میرے بزرگ ہیں' میرے حق میں دعا فرمایئے گا۔۔۔"

بابا جی اس کا ہاتھ پکڑ کر چوکھٹ کے پاس لے گئے۔

"اب تم جانو اور اندر والا جانے۔۔۔ میرا ساتھ یہیں تک تھا۔" پھر اسے اندر دھکیلتے ہوئے بولے۔ "میرے حق میں بھی دعا کرنا۔۔۔"

اندر اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ مرد' عورتیں' بوڑھے' بچے' سب ہی اپنے اپنے انداز سے عقیدت و محبت کے نذرانے پیش کر رہے تھے' کچھ لوگ قرآن خوانی میں مصروف تھے۔ اگربتیوں' لوبان' دیگر خوشبویات اور گلابوں کی تیز خوشبو سے یہاں کا ماحول مہک رہا تھا۔ کیف آگیں سی خنکی ہر سو پھیلی ہوئی تھی اور اندر داخل ہونے والا اپنے وجود میں اک عجیب سی روحانیت سے بھیگی ہوئی کپکپاہٹ محسوس کرتا تھا اور یہی کپکپاہٹ کچھ دیر بعد اک پرسکون کیف آمیز طمانیت میں تبدیل ہو جاتی تھی۔۔۔ اللہ والوں کی قربت کا یہی اک خاصہ ہے۔ ان کے قدموں میں پہنچ کر انسان کی انا' حیثیت' جاہ و مرتبت' حسب نسب اور رنگ و نسل کے سارے کچے رنگ اتر جاتے ہیں' ہر کوئی وحدت اور الوہیت کے رائج سرمدی رنگ میں رنگا جاتا ہے۔۔۔ مراد نے اندر داخل ہوتے ہی اسلام علیکم کہا۔ بڑے ادب سے پائلتی پہ بوسہ دیا' چادر سے ہاتھ مس کر کے چہرے اور سینے پہ ملے پھر فاتحہ سے فارغ ہو کر دعا میں مشغول ہو گیا۔ ڈوری اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پہ لرز رہی تھی' ہونٹ کانپ رہے تھے' آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ اس پہ رقت طاری تھی۔۔۔ اندر زائرین کا ہجوم بڑھ گیا تھا۔ آنے جانے والوں کی دھکم پیل نے اسے بھی اپنی محویت توڑنے پہ مجبور کر دیا اور ادھر ادھر دیکھ کر وہ چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر دائیں کونے میں قدرے خالی جگہ پا کر وہاں سمٹ آیا اور دعا کے لیے پھر ہاتھ پھیلا دیئے۔ اسی لمحے اسے بابا حافظ شباب الدین شاہ صاحب کی بات یاد آ گئی۔۔۔ من مسجد ہونا چاہیے' مندر نہیں۔۔۔ اس نے سر کو جھکا اور آیتیں پڑھنی شروع کر دیں۔ جو بھی اسے یاد آیا' پڑھتا گیا اور کبھی کبھی آنکھیں کھول کر مرقد شریف کی جانب بھی دیکھ لیتا جیسے من کو مسجد بنانے کے لیے ان سے مدد کی التجا کر رہا ہو۔۔۔ اس کے اندر کہیں نہ کہیں کوئی روزن ضرور موجود تھا جہاں سے نگاہوں کو خیرہ کرنے والی اک کرن داخل ہوتی جو پھیلتے سمٹتے بالآخر اس بت ناز کا روپ اختیار کر لیتی۔ اس کیفیت کو روکنا اختیار سے باہر تھا۔ وہ مسجد' مندر' کے درمیان گومگو کے عالم میں پریشان کھڑا تھا۔۔۔ زائرین کا ایک ریلا اندر داخل ہوا جس نے اس کے پاؤں اکھاڑ دیئے اور وہ مزید پیچھے دیوار کے پاس بٹنے پہ مجبور ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ اب مجھے یہاں نکل جانا چاہیے' اس نے جلدی جلدی دعا ختم کرنی چاہی۔

"اللہ! تیری تو ہی جانتا ہے' تو بہتر کرنے والا ہے' مجھے راستہ دکھا۔۔۔"

وہ بڑے خشوع سے جانے کیا کیا کہتا رہا' مانگتا رہا' اپنے ارد گرد سے بے خبر۔۔۔ پھیلے ہوئے ہاتھ پہ ڈوری یوں جھولتی تھی جیسے ہتھیلی کی لکیروں سے کسی پچھلے جنم کی آشنائی جگا رہی ہو۔ پھر اسے خبر بھی نہ ہوئی اور ایک اور ڈوری اس تقریب آشنائی میں شامل ہو گئی۔ دعا ختم ہوئی تو آنکھیں کھلیں اور کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ہتھیلی کے جزیرے پہ جیسے فیروزے اور یاقوت کی دو چٹانیں ابھر آئی ہوں۔ الجھی ہوئی کالی ڈوریوں کے درمیان دو منکے چمک رہے تھے۔۔۔ کچے کچنار اور مہندی کے پھولوں کی مہک نے یہ بات اڑانے میں ذرا دیر نہیں لگائی کہ وہ نوبہار اس کوچہ شوق سے ہو گزری ہے۔ اس نے ہولے سے مٹھی بند کر لی' پولی پولی مٹھی میں جگنوؤں کو چھپاتا وہ اب بھی نہیں بھولا تھا اور بھلا آج صبح تبدیل ہونے والے منکے اور ڈوری کیسے بھول پاتا؟۔۔۔ وہ ادھر ادھر اسے دیکھنے لگا اور من مسجد سے پھر مندر میں بدل گیا۔ وہ لوگوں سے بچتا بچاتا چوکھٹ تک پہنچ پایا تھا کہ اسے حافظ شباب الدین شاہ صاحب اپنی مخصوص جگہ دکھائی دیئے۔ پاس پہنچ کر سلام کیا' انہوں نے وعلیکم السلام کہتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو ٹٹولا۔

"آ گئے بھئی۔۔۔" پھر کان کے قریب ہو کر پوچھنے لگے۔ "کچھ ملا۔۔۔؟"

"جی۔۔۔ جی!" یہ کہہ کر وہ مٹھی کو آہستہ سے کھول کر دیکھنے لگا جیسے جگنوؤں کے اڑنے کا خدشہ ہو۔

"بہت کچھ ملا۔۔۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ مسجد اور مندر آپس میں گڈمڈ کیوں ہو جاتے ہیں۔ کیسے یہ دونوں ایک۔۔۔"

وہ اس کی بات قطع کرتے ہوئے بولے۔ "جاؤ' اب جا کے کبوتروں کو چوگا ڈالو۔۔۔ پھر کبھی سمجھاؤں گا۔"

آنکھیں پھاڑ پھاڑ' دائیں بائیں دیکھتا ہوا وہ کبوتروں والے چبوترے تک آ پہنچا۔ عورتیں' بچے' بوڑھے' جوان کبوتروں کو دانہ دنکا ڈال رہے تھے۔ خوبصورت بانکے بانکے کبوتر بڑی بے تکلفی سے ہاتھوں' کاندھوں اور سر پہ آ بیٹھتے تھے۔ وہ بھی پاس آ کر کھڑا ہو گیا' معصوم کبوتروں کی پیاری پیاری ادائیں دیکھنے لگا کہ اچانک ایک بانکی سی کبوتری پر پھڑپھڑاتی ہوئی اس کے کاندھے پہ آ بیٹھی' شاید چوگا مانگ رہی تھی جو اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ ادھر ادھر کسی دانے والے کو دیکھنے لگا' اسی لمحہ پیچھے سے ایک اور شیرازی کبوتری آئی اور دوسرے کاندھے سے آ جڑی۔

"دانہ چاہیے؟۔۔۔ یہ لو۔۔۔" وہ لفافہ تھماتے ہوئے بولی۔ "اللہ والوں کے پاس آؤ تو درد لے کر اور کبوتروں کے پاس آؤ تو دانہ لے کر۔۔۔ مگر تمہیں تو یہ دونوں چیزیں مجھے ہی دینی پڑیں' دانے بھی اور

ورد بھی---"

منہ کھولے بٹ بٹ وہ اسی جادوگرنی کو دیکھ رہا تھا۔

"---کیا دیکھ رہے ہو؟--- ڈالو دانے کبوتروں کو--- یہ معصوم کبوتر بڑے کرماں والے ہیں۔ جو ان کو سچے دل سے پیار کرتا ہے اور چوگا کھلاتا ہے' اس کی ہر مراد پوری ہوتی ہے۔"

وہ لفافہ اسے واپس دیتے ہوئے بولا۔ "میری تو ہر مراد پوری ہو گئی' یہ دانے تو تم ہی ڈالو--- تم بھی تو کوئی مراد مانگتی ہو گی؟"

وہ کبوتروں کو دانے پھینکتی ہوئی بولی۔ "مراد تو میرے پاس ہے--- اور ہاں' یہ دانے تو میں انہیں دیتی ہوں مگر وہ دانے تم سنبھال کر رکھنا جو تمہاری دوسری مٹھی میں ہیں---"

"تم نے اپنا منتہ ڈوری میری ہاتھ پہ کیوں رکھ دیا تھا؟" وہ مٹھی کھول کر اسے دکھاتے ہوئے بولا۔

"اس لیے کہ تم حفاظت کر سکتے ہو' قدر کر سکتے ہو اور میں کمزور ہوں' میرے لیے خود اپنی حفاظت کرنا مشکل ہے--- سائیں سرکار یہ ڈوری واپس مانگ رہے تھے' کہہ رہے تھے کہ تجھے یہ راس نہ آئے گی' یہ کوئی مراد کی ڈوری ہے۔ میں نے یہ ڈوری انہیں نہیں دی' تیرے ہاتھ دی ہے کہ تو ہی اس کا مالک ہے۔ اب اس کو سنبھال کر رکھنا---"

"تم تو میرا نام بھی جانتی ہو---" وہ انجان بنتے ہوئے آہستہ سے کہنے لگا۔

"تمہارا نام تو ازل سے میرے نام کے ساتھ ہے' جیسے مندری کے ساتھ نگینہ ہوتا ہے--- ہمارے گاؤں میں ہمارے گھر کے سامنے جو بچوں کا اسکول ہے وہاں ہر صبح بچے اپنی پڑھائی ہی میرے تیرے نام کے ساتھ شروع کرتے ہیں---"

"تیرے میرے نام کے ساتھ---؟" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرانگی سے اسے تکنے لگا۔

"ہاں--- وہ جب "شاد باد منزل مراد" کہتے ہیں تو میں بہت خوش ہوتی ہوں--- پہلے میں سمجھتی تھی کہ وہ شاباش منزل مراد کہتے ہیں مگر پھر پتہ چلا کہ وہ شاباش نہیں' میرا نام شاد کہتے ہیں--- تیرا نام ہے نا! میرا نام پہل' تیرا نام آخر---" وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ "بچوں نے تو میرا نام ہی باد منزل مراد رکھا ہوا ہے۔" اس نے مٹھی بھر چوگا کبوتروں کی جانب اچھالا' ادھر مراد کا دل بھی بچے گیند کی مانند اچھل رہا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس کی معصوم اور سادگی کی خوشبو میں رچی بسی باتوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔ وہ پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ہولے سے بولی۔ "میرے ساتھ میری ساس اور نند اور میرا بیمار خاوند بھی ہے جو باؤلی والے برآمدے میں پڑا ہوا ہے--- اب میں جاتی ہوں' اگلی جمعرات آؤں گی۔ سائیں سرکار نے کہا ہے کہ سات جمعراتیں آنا پڑے گا' وہ اس اور تو جانے کے لیے چلہ کاٹیں گے۔ اس پہ کسی نے کالے جادو کا کارا کیا ہوا ہے۔ پر میں جانتی ہوں اس پہ کالے جادو کا کارا نہیں' نکمی کا کارا ہے' وہ ناکارہ تو کسے جوگا نہیں--- مرن جوگا!"

"تم شادی شدہ ہو---؟" وہ مری ہوئی آواز میں بڑی مشکل سے بولا۔

"گلے پڑھنے سے کوئی شادی شدہ نہیں ہو جاتا--- اس مرن جوگے نے تو مجھے کبھی بیوی یا عورت سمجھا نہیں اور نہ وہ اس قابل ہے۔ تین برس ہو گئے مجھے اس کا سیاپا کرتے ہوئے' سارا سارا دن اور رات وہ نشے میں بے سدھ رہتا ہے اور جب کبھی نشہ ٹوٹتا ہے تو اس کا دم دب جاتا ہے--- اسے دم ساہ بھی ہے۔" وہ بے تکان اپنے دل کا غبار نکال رہی تھی۔

"سنو---" وہ سمجھاتے ہوئے کہنے لگا۔ "جو بھی ہے' وہ تمہارا خاوند ہے۔ تمہیں اس کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔ جو تمہارے نصیب میں تھا' مل گیا۔ اب تمہیں اس کی خدمت عزت کرنی چاہیے اور صبر کا دامن---"

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "سب سے پہلے یہ سنو کہ میں شادی کے لیے رضامند نہیں تھی' میری ماں نے مجھے بوجھ سمجھتے ہوئے میرے انکار کے باوجود اس کے پلے باندھ دیا کیونکہ یہ اکیلا تھا اور کچھ زمین اور کھیتی باڑی بھی تھی۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ نشئی ہے' دم ساہ کا روگی ہے--- عورت یہاں بھی صبر شکر کر سکتی ہے مگر وہ تو شادی کے قابل ہی نہیں تھا--- میں آج بھی کنواری ہوں۔ میری ساس سارے الزام مجھ پر ہی رکھتی ہے۔ وہ میرا علاج اور تعویذ دھاگے کراتی ہے اور اپنے پتر کو نہیں دیکھتی۔ میں نے دن رات اپنے خاوند' ساس' بیوہ نند اور اس کے بچوں کی خدمت کی۔ ان کے پاؤں دابے' مالشیں کیں' کھیتوں میں کام کیا اور تم مجھے صبر کے لیے کہتے ہو؟--- صبر کا سہارا نہ ہوتا تو میں کبھی کی سنکھیا کھا لیتی' پھائے لگ جاتی یا پھر کہیں منہ کالا کر جاتی---" وہ روہانسی سی ہو گئی۔ "عورت اور مرد میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ عورت' عزت چاہتی ہے' محبت چاہتی ہے' تحفظ چاہتی ہے۔ وہ ماں بننا چاہتی ہے' کسی کی توجہ چاہتی ہے اور جو مرد اپنی عورت کو یہ سب کچھ نہ دے سکتا ہو وہ خاوند کیسے کہلا سکتا ہے؟--- میں بھی انسان ہوں' عورت ہوں' کمزور اور بے آسرا ہوں۔ مجھ سے اچھے تو یہ بے زبان کبوتر ہیں جنہیں محبت ملتی ہے' چوگا ملتا ہے--- کتنی خوش نصیب ہے یہ کبوتری جو تیرے مضبوط کاندھے پر بیٹھی تجھ سے اپنی بے پناہ اپنائیت اور چاہت کا اظہار کر رہی ہے---" اب وہ باقاعدہ سسکنے لگی تھی۔

"شادو' سنو!--- حوصلہ رکھو' اپنے آپ کو سنبھالو۔" مراد بولا۔

"ابھی تک تو میں نے اپنے آپ کو سنبھالا ہوا ہے مگر کب تک میں ایسا کر سکوں گی؟--- قدم قدم پہ میلی نظریں میرے پنڈے کو چھیدتی ہیں۔ میں کب تک اکیلی مقابلہ کر سکوں گی؟ انسان ہوں' فرشتہ یا پتھر نہیں اور پتھر بھی اک دن پھٹ جاتا ہے' ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا ہے---"

وہ رونے لگی' اتنے میں ایک دیہاتی بچہ کہیں سے آنکلا۔

"شادو---نی شادو! بے بے بلا رہی ہے---"

وہ پلو سے آنکھیں صاف کرتی ہوئی بنا کچھ مزید کہے سنے' بچے کا ہاتھ پکڑے ہجوم میں اتر گئی۔ شاہ مراد کے پاؤں تلے سنگ مرمر کی ٹھنڈی سلیں جیسے سمندری جھاگ میں تحلیل ہوتی جا رہی تھیں۔ اسے اپنا وجود ہولے ہولے یخ بستہ دھند کے غبار میں غائب ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں قرمزی ترمرے پتنگوں کی طرح اڑ رہے تھے---- وہ کیا کہہ گئی' کیا کہہ رہی تھی' وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ وہ کدھر گئی' کیا لے گئی' کیا دے گئی؟ اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ دماغ میں کافور کی ڈلی رکھی محسوس ہو رہی تھی جس کی یخ بستگی اس کے رگ و پے میں سرسرا رہی تھی۔ ایسے میں اس کے دوسرے فقیر گرائیں ادھر آ نکلے۔ اس حالت میں اسے ادھر کھڑا دیکھ کر وہ پاس آ گئے۔

"دوست' کہاں رہ گئے تھے---- طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" ایک اسے گم صم دیکھ کر بولا۔

اس نے سختی سے آنکھیں بند کرتے ہوئے سر کو جھٹکا دیا' وہ واپس آ چکا تھا۔

"ہاں یار! بالکل ٹھیک ہوں--- کچھ کھایا پیا بھی ہے یا یوں ہی گھوم رہے ہو؟" وہ خود سخت بھوک اور پیاس محسوس کر رہا تھا۔

"نہیں دوست! ابھی تک تو کچھ بھی نہیں کھایا--- آؤ چلو' لنگر کھاتے ہیں۔"

وہ سب لنگر خانے کی جانب چل دیے۔

***

عصر کی اذان سے پہلے ہی مولا بخش نے اپنی دوکانداری قریب قریب بند کر دی تھی جبکہ یہی آگے پیچھے کا وقت اس کی کمائی کا ہوتا تھا' اس کے کارندے مرغیاں گھی دودھ اور دیگر نذرانے سمیٹتے سمیٹتے نڈھال ہو جاتے تھے۔ جھولا اور کشکول ڈوریوں' منکوں' تعویزوں سے خالی اور روپوں ریزگاری سے بھرنا شروع ہو جاتا تھا مگر آج بھرپور کمائی کے روز وہ انتہائی محویت کے عالم میں کھلی آنکھوں والے مراقبے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی خلاف معمول یہ تبدیلی آس پاس کے دوکاندار' فقیر درویش' شربت' پھولوں اور تسبیحوں' کتابوں والے سب ہی محسوس کر رہے تھے۔ کسی سوئی چبھے' ہوا سے خالی غبارے کی باقیات کی طرح وہ تھڑے پہ اٹکا پڑا تھا پھر اکتا دینے والی مایوسی کی فضا کے جمود کو اس کے فلک شگاف نعرے "حق اللہ' سچ اللہ' باقی سب رولا ہی رولا" نے پاش پاش کر دیا۔ آس پاس والوں نے اس دھماکے کو محسوس کیا۔ سائیں مولا اب اپنے پاؤں پہ کھڑا تھا اس نے اپنے چیلوں کو کچھ ہدایات دیں اور اکھڑے ہوئے قدموں پہ اپنے ڈیرے کی جانب چل دیا۔ ڈیرے پہ پہنچ کر اس نے ڈوریوں اور منکوں والا جھولا سامنے دہکتے ہوئے الاؤ میں جھونک دیا۔ الاؤ سے دہکتا ہوا انگارہ سلفے پر دھرا اور کئی دھواں دھار کش کھینچ کر وہ وہیں پرالی کے پھونس فرش پہ ڈھیر ہو گیا۔ شام تک وہ کسی لاوارث مردے کی مانند اپنی ناآسودگی کے گورستان میں بے

گور و کفن پڑا رہا۔ اس کے کارندے اور فقیر درویش اس کے آس پاس منڈلا رہے تھے۔ عشاء سے ذرا پہلے چوہدری حق نواز تھانیدار کا کارندہ تاجا مخبر باج لینے آ گیا--- باج' وہ مخصوص رقم جو معاہدے کے مطابق ہر جمعرات کو علاقے کے تھانے کو نذر گزاری جاتی تھی۔ خلاف معمول آج اسے تاجے مخبر کو ملنے کا دم لگوانا بھی یاد نہ رہا اور ناچار وہ اپنے آپ کو سمیٹتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

"آ بھئی' تاجے بادشاہ---!"

"کیا بات ہے سائیں' آج تم اپنے اڈے سے غیر حاضر ہو؟" اس نے پاس پڑی ہوئی کلیان کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تاجے یار! یہ لو پانچ سو کا پیا---" وہ ایک زوردار انگڑائی توڑتے ہوئے بولا۔ "آج ذرا تاپ چڑھ گیا ہے۔" اس نے اپنی اور تاجے مخبر کی کلیان سلفے سے بھری اور سلفے کو شعلہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "سنا' سردارے قصائی کا معاملہ ختم ہوا یا نہیں ہے---؟"

تاجے مخبر نے دھوئیں کا طوفان اگل کر لال لال آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا--- "یار سائیں! معاملہ تو رفع ہو جائے گا' پر تم بھی اس کو سمجھانا کہ جیب کاٹتے ہوئے اسامی کی اوجڑی نہ کاٹا کرے اور اس قصائی دے پتر سے کہنا کہ کچھ دنوں کے لیے علاقہ بدر ہو جائے--- چھ ٹانکے لگے ہیں اس بڈھے کی وکھی میں---"

"اچھا' اچھا--- سمجھا دوں گا مگر تم بھی چوہدری صاحب سے میری طرف سے عرض کر دینا کہ جناب اپنے آدمیوں سے کہیں کہ ادھر ذرا اپنی آنکھیں بند رکھا کریں--- ویسے ہی آج کل مندا ہے' مال خالص نہیں ملتا اور جو ملتا ہے وہ دگنی قیمت پر۔ اب تو پولیس والے میرے لگے بندھے گاہکوں کو بھی تاڑتے رہتے ہیں---" وہ تازہ کلیان بھرتے ہوئے بولا۔ "ادھر مال آئے گا تو ادھر بھی جائے گا' نا!"

تاجے مخبر نے ترنگ میں آ کر ہاں میں ہاں ملائی۔

سائیں مولا بخش اکیلے ہڑپ کرنے کا قائل نہ تھا' وہ مل جل کر باہمی اتفاق اور پوری ایمانداری سے دھندا کرنے پہ ایمان رکھتا تھا اور اسی ایمانداری اور مل بانٹ کر کھانے کے اصولوں پر چلتے ہوئے اس نے سات برسوں پہ محیط یہ فاصلہ بغیر کسی جھنجھٹ اور پریشانی کے طے کر لیا تھا۔ اس کالے دھندے پہ گرفت کرنے والے اور کڑی نظر رکھنے والے اس کی عزت ہی نہیں بلکہ اسے ہر طرح سے تحفظ بھی فراہم کرتے تھے اور یہ بھی ہر وقت دامے درمے قدمے سخنے ان کی معاونت سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ درگاہ شریف اور گرد و نواح کے بھک منگوں' اچکوں' جیب کتروں' پڑی' ہوٹی' ٹیکے' بھرے ہوئے سگریٹوں کے پرچون فروشوں کی انجمنوں کا کرتا دھرتا استاد' خلیفہ اور منتظم اعلیٰ یہی تھا۔ بھنگ' چرس' گانجہ' سلفہ' کچی پکی سب درگاہ کے پچھواڑے قبرستان کی جعلی قبروں کے سٹوروں سے سپلائی ہوتی تھیں جن کا چابی بردار یہی تھا۔

تعویز' نقش' گنڈے' منکے' نقلی فیروزے عقیق' جعلی چاندی کی انگوٹھیاں' خاک شفا' گدڑ سنگھیاں' کستوری' کیسر' عود عنبر' شیر کی چربی' الو کی چونچ' چڑے کا مغز' بارہ سنگھے کے سینگ' سیہ کے کانٹے' بجو کے پنجے' سبز چھپکلی کا پتہ' ہدہد کے انڈے' سانپ کا منکا' کینچلی' بچھو کے ڈنک' دھتورے کے بیج' سفید سنکھیا' شنگرف کا کشتہ' کچا کپڈ' تھلیے کی تری' رتی کا تیل' پرانے مردوں کی ہڈیاں' یہ سب کچھ اس کے کارخانہ حکمت و معرفت سے دستیاب تھا۔ یہ نایاب کمیاب اور قیمتی چیزیں اس کے خاص ماہرین فن کارندے اس کے اڈے میں بناتے رہتے تھے جو درگاہ شریف کے قریب پرانے قبرستان میں تھا۔ ان منشیات کے عادی کاریگروں کے سامنے انتہائی بدبودار چیتھڑے' گاچنی مٹی' موم' تیل' سنگ مرمر کے ٹکڑے' رنگوں کی پیالیاں' پرانی ہڈیاں' گلہریوں کی دمیں' گدھوں گھوڑوں کے کھر' کھالیں' چونا' سیپ' کوڑیاں' املی کے بیج' سہاگہ' کافور' ریٹھے کے بیج' کٹے بلبوں کی ہڈیاں' رنگ برنگے سوت کی انٹیاں' کانچ کے ٹکڑے' پرانا گڑ' پسے ہوئے کوئلے' مکئی کا آٹا' ہلدی اور سکاکائی کی جڑیں اور ایسی ہی الم غلم اشیاء کے ڈھیر پڑے رہتے۔ وہ سارا دن اس کے لیے مندرجہ بالا چیزیں تیار کرتے رہتے۔ اس کے علاوہ وہ چہرے بدلنا' سر کو چھوٹا بنانا' آنکھ اندھی کرنا' دماغی طور پہ معذور کرنا' ہاتھ پاؤں بازو ٹیڑھے میڑھے کرنا' تالو میں سوراخ کرنا' گردن پہ فٹ بال جیسا گلڑ بنانا' کوڑھ' داد چنبل' لاہوری پھوڑے' موگری پھوڑے' گھاؤ' زخم اس فنکاری سے بناتا تھا کہ دیکھنے والے کراہت سے منہ دوسری طرف کر لیتے تھے۔ اس کے اردگرد کارندے' چیلے اور دیگر لوگ اپنے اسی کے ہی تراشے اور بنائے ہوئے شاہکار تھے اور جن کی سوچ اور طلب سائیں مولا کے آگے ختم ہو جاتی تھی۔ وہ اس کے بندۂ بے دام غلام تھے اور ان کا ماضی بے خودی اور بے بسی کے اندھیروں میں دفن ہو چکا تھا' کھانے پینے اور نشے پانی کے علاوہ ان کی اور کوئی ضرورت نہیں تھی اور یہ سب کچھ سائیں مولا ان کو فراہم کرتا تھا۔ ان کے نام تو شاید ان کے جننے والے ہی جانتے ہوں گے مگر اب ان میں کوئی بابا صدرو تھا تو کوئی شانا' سائیں منگا اور کوئی جیرو' صوفی داد' ست رنگا' حاجی نورا' اپنے بھلا' سلامتا' شریفو' سائیں مست اور کوئی دریا دل' مائی لوناں' چھبی' مائی حسو' مٹھنی' سلامتے' پرت گھوڑی' مائی ہیر' نوراں' ماچھن اور ان گنت بے نام و شناخت مجذوب ملنگ۔ جن کا یہ ان داتا تھا۔ ضرورت' وقت اور حالات کے مطابق وہ ان لوگوں کو استعمال کرتا تھا۔ جمعرات کے روز تو ان کی اکثریت بھیک منگوں کے روپ میں دکھائی دیتی' کچھ منتخب کارندے' اندر بھیڑ بھاڑ میں وارداتیں کرتے اور عورتیں' عورتوں میں اپنا کام دکھاتیں۔ چار پانچ جیبیں صاف کرنے پہ مامور تھے۔ کچھ نئے آنے جانے والوں پہ نظر رکھتے' سائیں مولا کی کرامتوں کا پرچار کرتے' کچھ نذرانے جمع کرتے اور کچھ اوقاف والوں کے چھاپے کا خیال رکھتے۔ ان کے اپنے کوڈ ورڈ بھی تھے جو یہ مختلف موقعوں یا ایمرجنسی پہ استعمال کرتے تھے۔ خیر شی دی' جیب میں مال ہے' کے اشارے کے لئے بولا جاتا اور یہ جیب کتروں اور فقیروں کے لئے اطلاع ہوتی۔۔۔ سہاگ قائم رہے'

جوڑی سلامت کا مطلب ہے کہ نیا نیا شادی شدہ جوڑا آیا ہے۔۔۔ رب سچ کرائے۔ بڑھاپہ وقوف اور پیسے والا ہے' عنقریب مرنے والا ہے اور رب مراداں پوریاں کرے۔ ٹوٹے ہوئے عاشق کے لئے بولا جاتا' کر بھلا سو ہو بھلا۔ پولیس یا کسی بڑے سرکاری کارندے کی آمد پہ بولا جاتا' جو دے اس کا بھی بھلا اور جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔ کا مطلب یہ تھا کہ جیب خالی ہے' فقط سلام کرنے' قوالیاں سننے اور لنگر کھانے آیا ہے۔۔۔ قلندر' دم دم دے اندر۔ یعنی بڑیا کا گاہک ہے۔۔۔ خیراں ہی خیراں۔ پرائی چڑیا ہے اور کسی سے ملنے آئی ہے۔۔۔ حق اللہ موجود اللہ۔ دربار کے کسی بااختیار مجاور یا منتظم کے لئے بولا جاتا اور خزانے بھرے رہن۔ کسی کارندہ کو لین دین کرنے کے لئے بولا جاتا۔ وہ دنیا۔ حتیٰ آخر' پولیس کی کسی کارروائی پہ کمک مہیا کرنے کے لئے اشارہ ہوتا مگر آج اس کا کوئی اشارہ اپنا چمتکار دکھا نہ سکا۔۔۔ وہ سامنے دہکتے دہکتے سلگتے ہوئے الاؤ میں اپنا وجود جھلستے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ آج اجمیر' باج اور نشہ پانی پورا کرنے کے بعد وحشت اپنی کمین میں سلگتا ہوا چلا گیا تھا' الاؤ میں چھینکی ہوئی ڈوریاں جل چکی تھیں اور چند ایک ادھ جلی' راکھ اور گیلی دھواں دیتی ہوئی لکڑیوں پر چڑھی پڑی ہوئی تھیں۔ سوت' موم اور سلفے کی ناگوار سڑاند پھیلی ہوئی تھی اور وہ زہر آلود نظروں سے ادھ جلی ڈوریوں کو گھور رہا تھا۔ ان ڈوریوں نے آج ایک جنگلی کبوتری اور جنگلی کبوتر کو ایسے مضبوط بندھن میں باندھ دیا تھا جس کو وہ اپنی تمام تر کوشش اور طاقت کے باوجود توڑ نہ سکا اور اس کی چھتری پہ اتری ہوئی کبوتری کسی دوسرے کبوتر کے ساتھ اڑ جائے' یہ اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ اس کی چھتری پہ اترنے والی کبوتریوں اور فاختاؤں کی کمی تو نہیں تھی لیکن صبح صبح اترنے والی اس کبوتری کی چھب ہی کچھ اور تھی' نسے وہ چاہے بھی تو بھول نہیں سکتا تھا۔ اس کی پوری مجرمانہ زندگی میں کوئی ایسا حادثہ پیش نہیں آیا تھا کہ خود اپنے ہاتھوں سے ہی اپنے آپ کو باندھ کر وہ اس بری طرح بے بس اور دل کے ہاتھوں مجبور ہوا ہو۔ اک ہولناک مایوسی اور خجالت اس کے رگ و پے پہ مسلط تھی' اس کے سر پہ کہن سالہ برگد کی گنجان شاخوں پہ پرندے شور مچاتے ہوئے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اس نے سخت ناگواری سے اوپر دیکھا اور اک غلیظ سی گالی اچھال کر وہ جھونپڑے سے باہر نکل آیا۔۔۔ دور تک پھیلی ہوئی اجڑی شکستہ قبروں پہ کہیں کہیں اندھے کی جھونپڑی جیسے دیئے لرز رہے تھے' کہیں آس پاس کتوں کے پلے چیاؤں چیاؤں کر رہے تھے باہر کی ہیبت ناک گھٹن اور اندر کی وحشت ناک چبھن سے بڑبڑا کر اس کا دل چاہا کہ وہ زور زور سے چیخے' کسی کو پھاڑ دے یا خود پھٹ جائے۔۔۔ اسی لمحہ اک منحوس سی چمگادڑ' اس کے عین سر کے اوپر برگد پہ پھڑ پھڑائی اور ایک بڑی سی غلیظ بیٹ اگل کر قبرستان کی جانب چیختی ہوئی غائب ہو گئی' تھپ سی آواز اور بدبو کے جھٹکے نے اسے لرزا کر رکھ دیا' سر کا جنگل غلاظت سے لتھڑ لتھڑ گیا۔ وہ کسی بوکھلائے ہوئے گیدڑ کی طرح قبریں پھلانگتا ہوا دستی پمپ کے نیچے آ بیٹھا' دو چار ملنگ بھی دم ہلاتے ہوئے اس کے پیچھے لپکے' اس کے سر پہ پانی اور منہ سے مغلظات جاری تھیں' ملنگ تھر تھر

کانپ رہے تھے' خوب نہا دھو کر بھی وہ بدبو کے احساس کو کم نہ کر سکا تو اس نے نیا چولا پہنا اور خوب سا خوشبو انڈیلی' ایک ملنگ نے ڈرتے ڈرتے سلفہ بھر کر کلیان آگے بڑھایا' غصے سے اس نے کلیان اس کے منہ پہ دے مارا اور سب کو باہر دفع ہو جانے کا حکم دیا۔۔۔ اب وہ پھر اکیلا تھا۔ وہ دیر تک جھونپڑے سے باہر قبرستان کی دیوار کے ادھر' حضرت شاہ امام کے روضے کے سبز گنبد کے اوپر جھلملاتی ہوئی روشن بتی کو دیکھتا رہا۔ نہانے کے باوجود' پسینہ اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہا تھا' وہ ایک بار پھر باہر نکل رہا تھا۔۔۔

اس کے قدم درگاہ شریف کی جانب بڑھ رہے تھے۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا گیا اس کے اندر کی وحشت اور کندھوں کا بوجھ بتدریج کم ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ عقبی حصے کے پہلے چبوترے کے پاس پہنچ کر چپل اتارے اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ چھوٹے تنگ دروازے سے گزرتے وقت اسے جھکنا پڑا۔ اندر سنگ مرمر کی خوبصورت صاف شفاف قبریں' اگربتیاں' موم بتیاں' طاقچوں میں جلتے ہوئے دیے' آس پاس دعائیں' فاتحہ پڑھتے ہوئے لوگ۔۔۔ اسے یہاں بڑی کشادگی اور پاکیزگی کا احساس ہوا۔ وہ دیر تک سنگ مرمر کے ایک ٹکڑے پہ بیٹھا رہا جس کی ہلکی ہلکی خنکی سے اسے بڑی فرحت ملی' جب وہ اٹھا تو محسوس کر رہا تھا جیسے اس سفید پتھر نے اس کی وحشت کی سیاہ چٹانوں کو اپنی نرماہٹ' ہلکی ہلکی خنکی اور باطنی پاکیزگی کی طراوت سے روئی کے گالوں' ہنس راج کے پروں اور شیرازی کبوتروں کے بازوؤں تلے کی نرم نرم روئیں میں تبدیل کر دیا ہو' اس کے وجود کے اندر جیسے بیک وقت کئی کافوری شمعیں روشن ہو گئیں۔ وہ اٹھا اور ہولے ہولے پگ دھرتا ہوا' درگاہ شریف کے دائیں جانب صحن میں آ گیا۔ یہ صحن زائرین کے لیے جمعرات کی صبح سے جمعہ کی شام تک کھلا رہتا تھا۔ یہاں سماع اور وعظ کی محافل سجا کرتی تھیں' آس پاس اور دور دراز سے آئے ہوئے لوگ شب بسری کا اہتمام بھی یہیں کر لیا کرتے تھے۔ عشاء کی نماز پہ بچھنے سے جب زائد صفیں بھی یہاں بچھائی جاتی تھیں اور ساری رات یہاں رت جگے جیسی رونق رہتی۔ لوگ اپنے اپنے انداز اور سہولت سے پڑھتے پڑھاتے رہتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی زنانہ حصہ بھی تھا۔ صحن کے ساتھ قبلہ رخ والی دیوار روضہ شریف سے ملحق تھی اس لیے اس دیوار کے ساتھ یا پاس قدم رکھنے کی جگہ نہ ملتی۔ عورتیں مرد سب ہی اپنی اپنی جگہوں پہ تسبیحات' نوافل' مناجات اور آہ و زاری میں مصروف و مگن نظر آتے تھے۔ اسی دیوار کے تنگ طاقچوں میں چراغاں رہتا' پھولوں' ہاروں اور منقش معطر چادروں اور دوپٹوں کے انبار لگے نظر آتے۔۔۔ صحن میں قدم دھرتے ہی اسے بے پناہ تازگی اور فرحت کا احساس ہوا جیسے وہ جہنم سے نکل کر جنت کی طرف نکل آیا ہو' نکہت و نور میں ڈوبا ہوا یہ ماحول کسی اللہ والے کے خواب کی تعبیر کی طرح تھا۔ چادر سے اس نے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا اور شمالی دیوار کے قریب املتاس کے جھاڑ کے پاس آ بیٹھا' تنے سے سر ٹکا کر وہ سامنے روضہ شریف والی دیوار کی تنگ جالی کو دیکھنے لگا جس سے چھن چھن کر نکلتے ہوئے نور کی شعاعوں کو اوپر آسمان پہ چمکتا ہوا چاند بھی دیکھ کر شرمارہا

تھا۔ دھیرے دھیرے املتاس کے تنے نے جیسے اپنی گود ممتا سے بھر دی ہو۔ ٹھنڈی ٹھنڈی پروائی کے ہلکوروں نے تھپکنا شروع کر دیا جیسے شاخوں پہ پھلیوں اور پھولوں نے کوئی سازینہ چھیڑ دیا ہو اور ایسے میں اسے اپنی ماں یاد آ گئی جس نے اس کا نام مولا بخش رکھا تھا۔ بڑی منتوں دعاؤں سے اسے حاصل کیا تھا۔ اس کے پیدا ہونے پر بڑے دیئے جلائے' چڑھاوے چڑھائے' بتاشے بانٹے مگر اس تیز موہنے مولا بخش نے اپنے باپ کو بھی نہ بخشا۔ اس کی پیدائش کے ٹھیک چلے کی مدت میں وہ معتدی بخار سے مولا کو پیارا ہو گیا اور ابھی اس نے اپنے پاؤں ٹھیک سے زمین پہ نہ دھرے تھے کہ اس کی غریب بیوہ ماں بھی سیلاب کی نذر ہو گئی۔ پھر اس سخت بذی کو اس کے چچا نے اس کی زمین کے لالچ میں اپنی کفالت میں لے لیا۔ چچا نے دکھاوے کی خاطر اس کی پرورش شروع کی۔ اسکول داخل کروایا۔ کھیتی باڑی پہ لگایا مگر سگی اولاد کی طرح اس کی تربیت پہ کوئی توجہ نہ دی اور نہ ہی اسے نوکر' کی سے زیادہ وقعت دی۔ وقت دبے پاؤں گزرتا رہا اور اس کے پاؤں زمین پہ مضبوط ہوتے گئے۔ پھر ایک دن اس کے چچا نے ایک غلطی پہ اس کی اچھی خاصی ٹھکائی کر دی اور غصے میں اس کے ہاتھ آئی ہوئی درانتی نے چچا کا آدھا جسم اکاٹ دیا وہ دن اس کا آخری دن تھا' اس نے گاؤں چھوڑ دیا اور اللہ کی وسیع زمین نے اسے پکڑ لیا۔

اس زمین پہ ٹھوکریں کھاتے کھاتے جب اسے اپنے نکلتے ہوئے قد کاٹھ کی ہلکی سی شناخت ہوئی تو وہ اپنے ماضی' ماں باپ' زمین گاؤں' حرام حلال' سب کی شناخت کھو چکا تھا۔ اپنی زندگی کا پہلا ڈھنگ کا کام اسے بابے بگے کے چائے خانے پہ ملا۔ رب جانے کہ وہ اسے کہاں سے اٹھا لایا تھا یا وہ خود ہی کہیں سے آ گیا تھا۔ یہیں وہ سارا دن ٹوٹے ہوئے پیالے اور چائے دانیاں گندے پانی سے دھوتا رہتا۔ یہ ایک ٹرکوں کا اڈا تھا۔ ورکشاپ اور دو چار دوکانیں اور بھی تھیں۔ دن رات یہاں رونق رہتی تھی۔ ٹرک' ٹریلر' بسیں یہاں رکتی تھیں۔ لباس' صفائی' حجامت' جوتا' کنگھی سے بے نیاز وہ سارا دن اور آدھی رات تک افتم پشتم' بھاگم بھاگ چائے سپلائی کرتا رہتا' برتن دھوتا' آگ جلاتا' پانی لاتا' صفائی کرتا' گاہکوں کی گالیاں اور بابے بگے کی جھڑکیاں سنتا۔ آدھی رات کے بعد جب بابے بگے کے آرام کا وقت ہوتا تو اس کے لیے چرس کا سگریٹ بھرنا بھی اس کی ڈیوٹی تھی' چھوٹے چھوٹے پھرتیلے پرکار ہاتھوں سے یہ اتنے ٹائٹ قسم کے سگریٹ بھرتا تھا کہ اکثر ڈرائیور سیٹ سے اترتے ہی اسے آواز دیتے کہ اوئے چھوٹے' ادھر آ۔۔۔ وہ اسے چرس کی ڈلی اور سگریٹ تھماتے ہوئے پہلا یہی آرڈر دیتے کہ شہزادے! ذرا ٹائٹ قسم کا بنانا۔۔۔ ایسے ہی ٹائٹ سگریٹ وہ بابے بگے کے لیے بھی بناتا اور ایک دو کش کھینچ کر اسے پیش کرتا۔ اسی کی پائنتی بیٹھ جاتا اور سوکھی سڑی ٹانگوں کو دباتے دباتے خود بھی وہیں ڈھیر ہو جاتا۔۔۔ دوسروں کے لیے سگریٹ بناتے اور پلاتے پلاتے وہ اس چھوٹی سی عمر میں تجربے کے لحاظ سے بڑا ہو چکا تھا۔ ایک نمبر یا دو نمبر؟ وہ دور سے دیکھ کر ہی بتا دیا کرتا تھا۔ چرس' افیم' کوکین' مدک' گانجہ' سلفہ' حشیش' پوڈر ان سب خرابات کی

پہچانیں' خصوصیات' نفع و نقصان' قسمیں' اصل نقل پہچاننے کے فنی طریقے' قیمتیں' استعمال کے طریقے' ان کے نشے کے آثار' یہ سب اسے ایسے ازبر تھے جیسے اس عمر کے بچوں کو گنتی اور پہاڑے یاد ہوتے ہیں۔ وہ انہی خصوصیات کی بنا پر شہزادہ کہلاتا۔ بڑے بڑے جغادری قسم کے ڈرائیوروں سے اس کی بے تکلفی تھی' ان کی ٹانگ کے برابر ہوتے ہوئے بھی وہ باتوں کی کاٹ میں ان کے کان کترتا۔۔۔ ٹرکوں کے پہیوں کے ساتھ ساتھ وقت کا پہیہ بھی رواں دواں رہا۔ اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں' قد کاٹھ بھی نکل آیا' شکل صورت پہ نکھار آ گیا تھا۔ پھر بابے بگے کے مرنے کے بعد اس کے داماد سے اس کی بن نہ آئی۔ اب وہ اپنا علیحدہ کام کرنے لگا۔ ٹرک والوں کو بھرے ہوئے سگریٹ سپلائی کرتا اور گنجائش دیکھ کر وہ چرس خرید بھی لیتا' دو نمبر مال بھی تیار کرتا' اب وہ صاف ستھرے کپڑے پہننے لگا تھا۔ سارا دن چلتے پھرتے سگریٹ لپیٹتا رہتا' سپلائی کرتا رہتا۔ پھر ایک دن بابے بگے کے داماد سے کسی لین دین پہ جھگڑا ہو گیا اور اسی کی مخبری پہ صبح صبح منہ اندھیرے پولیس اسے پکڑ کر لے گئی۔ پولیس والوں نے اس کے قبضے سے کافی مال بھی برآمد کر لیا۔ پھر اس کی عمر کے پیش نظر اسے صرف ڈانٹ ڈپٹ اور جوتے لگا کر فارغ کر دیا۔ یہ مال بھی ادھار لیا ہوا تھا' اسی پریشانی کے عالم میں واپس اڈے پہ آ گیا۔ سارا دن وہ خاموش رہا۔ آج یہ شہزادہ فقیر ہو گیا تھا۔ اسی عالم میں رات سر پہ آ گئی۔ کئی ٹرک والوں کو وہ مایوس لوٹا چکا تھا۔ پھر آدھی رات آگے اور آدھی رات پیچھے' وہ ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور اڈے کے پیچھے اندھیرے میں وہ بابے بگے کے داماد کی کوٹھڑی کی جانب بڑھ گیا۔ وہ اندر سویا ہوا تھا' اس نے خاموشی سے ایک پڑیا جیب سے نکالی اور کھول کر اس کے نتھنے کے آگے کر دی۔ چند لمحوں میں وہ مہلک پوڈر اس کے دماغ کو مفلوج کر چکا تھا۔ اس نے انتہائی پھرتی سے اس کے سلوکے کو خالی کیا اور اس کے منہ پر تھوک کر دوسرے راستے سے واپس اڈے پر آ گیا۔ صبح کی نماز سے کچھ دیر پہلے امروز خان کا کوئٹے سے بھرا ہوا ٹرک اڈے پہ رکا' وہ اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ امروز خان سے پچھلے بدھ اس نے چرس خریدی تھی اور آج بھی اس کا وعدہ تھا' پوری رقم اس کے ہاتھ تھما کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ اب بھی اس کی جیب میں خاصی رقم تھی۔۔۔ مولا بخش نے لمبا ہاتھ مارا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آج اس کے پاس پورے اڈے کی کمیٹی کی رقم موجود ہے۔ وہ اس کی مخبری اور لین دین میں بد دیانتی کی سزا دے چکا تھا۔ اب اس کی قسمت کہ بچ جائے ورنہ وہ جس قسم کا پوڈر اس کے دماغ میں چڑھا آیا تھا' اس کے اثر سے وہ ہمیشہ کے لیے پاگل ہو چکا ہو گا۔۔۔ وہ یہی سوچتا ہوا اڈے سے باہر بڑی سڑک کے کنارے سنگ میل کے پاس کھڑا تھا۔ ایک ٹرک کچھ آگے جا کر رکا تو وہ بھاگتا ہوا پاس پہنچا۔

"اوئے منڈے' کدھر ویسیں۔۔۔؟"

ایک بڑی بڑی مونچھوں والے پٹھان نے نسوار کا پچکارا باہر پھینکتے ہوئے اسے پچکار کر پاس بٹھاتے

ہوئے کہا' دور تک ٹرک کے پیچھے والی سرخ بتیوں کی روشنی دکھائی دیتی رہی جیسے ٹرک سرخ سرخ لہو کا چھڑکاؤ کرتا ہوا جا رہا ہو۔۔۔ ایک دن اور دو راتیں گزرنے کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی' حواس بحال ہوئے تو اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا اور انگ انگ جیسے اکھاڑ کر دوبارہ جوڑا گیا ہو۔ اس کا چہرہ زرد اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کے ساتھ کیا بیت چکی ہے لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا' آسمان سے گر کر وہ کھجور میں اٹک چکا تھا۔ یہ اٹک کے نواح میں کوئی سنسان سی جگہ تھی اور وہ اسی کے حجرے کے ساتھ ایک جڑے سے بارک نما پتھروں سے بنے ہوئے کمرے میں گھاس پھوس کے فرش پہ پڑا تھا۔ دروازے کے باہر دو بندوق بردار خوفناک چہروں والے پہرے دار کھڑے تھے۔ چھ سات اور بھی اس جیسے نیم مردہ حالت میں یہاں قید تھے۔ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا جو مسلسل بڑبڑا رہا تھا اور دو جوان لمبے لمبے ڈاکوؤں جیسے' تنکے توڑنے کے بیکار مشغلے میں مگن تھے۔ دو تین گندے اجڈ سے لڑکے' ایک زخمی حالت میں تھا۔ بس یہی ایک سب سے چھوٹا تھا۔ اسے شدت سے بھوک اور پیاس محسوس ہو رہی تھی' بڑی مشکل سے وہ اٹھ کر دروازے تک گیا۔ پانی طلب کرنے۔ اسے ایک ٹین کے پیالے میں گدلا سا پانی دیا گیا' ناچار اس نے دو گھونٹ بھرے اور واپس اسی جگہ بیٹھ گیا۔ وہ پیدا ہوتے ہی حالات سے سمجھوتا اور مقابلہ کرنے کا عادی تھا' اس نے اس موجودہ صورت حال کو بھی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ وہ آبشار پہ ایک پتے کی مانند تھا' جسے اپنی حیثیت' راستے' منزل کا ادراک حاصل نہیں تھا' اس اڈے کے مالک نے اسے پوڈر کے عوض حاصل کیا تھا۔۔۔ اس کو بھی دوسرے اور لوگوں کے ساتھ بیگار پر لگا دیا گیا' دو برس میں وہ پتھر توڑتے توڑتے پتھر بن چکا تھا۔۔۔ پھر منشیات کا سابقہ تجربہ اس کے کام آیا' مالک نے اسے بیگار سے ہٹا کر منشیات کی سپلائی پہ لگا دیا' اس کا دائرہ کار بڑا وسیع ہو گیا اور مزید چار پانچ برسوں میں وہ' قتل' کئی اغوا' دو گولیاں پنڈلیوں اور ایک بازو پر آزما چکا تھا' معتمد خاص کی حیثیت سے وہ خود بھی صاحب حیثیت تھا۔ اس پہ مالک کے اعتماد اور بھروسے کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنا دھندا اس کی نگرانی میں چھوڑ کر حج کرنے چلا گیا' اس کی غیر موجودگی میں اس نے دو بڑے معرکے اپنی صوابدید پہ سر کیے' ایک معرکے میں تو وہ مرتے مرتے بچا اور حاجی صاحب کے واپس آنے کے بعد ایک معرکے میں پولیس کے ساتھ تصادم میں حاجی صاحب تو کام آ گئے' یہ کسی نہ کسی طرح فرار ہو جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب بساط الٹ چکی تھی' مخالف گروہوں کے خوف سے یہ سرحد پار کر گیا' اب اس کے ہاتھ افغان سرحد پہ اسلحے کی سمگلنگ کا میدان آ گیا اور پھر جب یہ میدان بھی خالی ہو گیا تو اس نے پوڈر بنانے کا کام شروع کر دیا۔۔۔ اسی دوران اس کی ملاقات ایک پیر صاحب سے ہو گئی' جنہوں نے اس کو تصوف کے میدان میں لانے کی کوشش کی اور وہ آہستہ آہستہ تصوف کے رنگ میں رنگتا گیا' داڑھی بڑھا لی' نماز روزہ' ہر وقت اللہ اللہ' اب وہ برے کاموں سے تائب ہو چکا تھا' اپنے پیر صاحب کے ساتھ زیارتوں سے مشرف ہو چکا تھا کہ تب ہی اچانک پیر

صاحب نے شادی کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے اپنے کسی مرحوم مرید کی جوان خوبصورت لڑکی سے خود ہی اس کا نکاح پڑھا دیا' وہ بہت خوش تھا کہ پیر صاحب کی برکتوں سے اسے آبرومندانہ زندگی گزارنے کا موقع ملا' خوبصورت بیوی بھی ملی۔ یہ ساری خوشیاں پھر ایک رات' دہلا دینے والے دھماکوں میں دب گئیں---

ایک دور دراز گاؤں میں وہ پیر صاحب کے کسی ذاتی کام گیا ہوا تھا' اتفاق سے وہ کام مقررہ وقت سے پہلے ہی سرانجام پا گیا اور اتفاق سے ہی اسے واپسی پہ ایک پیر بھائی کی سرکاری گاڑی میں لفٹ مل گئی' آدھی رات سے کچھ ہی دیر پہلے وہ اپنے ڈیرے پہ پہنچ گیا تو اس کی بیوی موجود نہیں تھی' وہ تلاش کرتا کرتا پیر صاحب کے حجرے تک پہنچا تاکہ وہ پیر صاحب سے اپنی بیوی کے بارے میں پوچھے' ممکن ہے کہ انہوں نے اس کی غیر موجودگی میں اسے اپنے زنان خانے میں بھیج دیا ہو۔ حجرے کے دروازے پہ ہاتھ رکھتے ہی اس کے کانوں میں اپنی بیوی کی جانی پہچانی گھٹی گھٹی سی آواز ٹکرائی جو پیر صاحب سے فریاد کر رہی تھی' وہ پیر صاحب سے رحم اور اپنی عزت کی بھیک مانگ رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ کانوں پہ رکھ لئے' شاید وہ اس حالت میں کچھ دیر اور ٹھہرتا مگر ایک قدرے بلند چیخ نے اسے اندر کودنے پہ مجبور کر دیا۔ اپنی زندگی میں اس نے بڑے بڑے مکروہ نظارے دیکھے تھے مگر جو کریہہ منظر اس نے ابھی دیکھا وہ شاید اس نے کبھی تصور میں بھی نہیں دیکھا تھا' اسے دیکھ کر پیر صاحب کی بھی سٹی گم ہو گئی۔ وہ اٹھ کر چارپائی پہ بیٹھ گئے' بڑی مشکل سے ان کے منہ سے نکلا۔

"آؤ بھئی' آؤ--- کب آئے؟" وہ ہکلا رہے تھے' وہ اس کی بیوی کو چارپائی پہ بیٹھنے کا اشارہ کرنے لگے جو وہاں سے ہٹ کر اس کے پاس آکر رونے لگی تھی۔ "اس پہ جنات کا اثر ہے' اگر آج میں اسے نہ بچاتا تو جن اس کو اٹھا کر لے جاتے--- میں ذرا جلالی وظیفے سے اس کو جنات سے نجات دلا رہا تھا---"

وہ اپنی صفائی میں مختلف دلائل پیش کر رہے تھے۔

"یہ سب جھوٹ ہے' یہ مجھے زبردستی یہاں لائے ہیں۔ میری عزت---"

"ہاں' ہاں--- مجھے سب معلوم ہے' میں نے سب سن لیا ہے۔ تم ذرا گھر چلو---" وہ اسے دروازے سے باہر کرتے ہوئے بولا' دروازہ اندر سے بند کر کے وہ پیر صاحب کے قدموں میں آکر بیٹھ گیا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ "پیر جی! میری بیوی کو معاف کر دیں' اس کو کیا معلوم کہ آپ کا کیا مقام ہے۔ وہ تو آپ کی بیٹیوں کے برابر ہے---"

"ہاں' ہاں---" وہ سنبھل کر بولے۔ "وہ میری بچی ہے' میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کی شادی کی ہے--- نادان ہے' کیا جانے کہ جن نکالنے کے کیسے کیسے طریقے ہوتے ہیں---؟"

وہ اٹھ کر ان کی پگڑی ان کو دیتے ہوئے بولا کہ یہ لیں' پہن لیں۔ انہوں نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس نے پگڑی کھول کر ان کے گلے میں ڈال دی' ساتھ ہی پلنگ پہ گرا کر سینے پہ بیٹھ گیا اور منہ پہ ایک ہلکا سا مکہ رسید کیا تو مصنوعی بتیسی اچھل کر باہر آپڑی۔ پوپلے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس نے پگڑی سے ان کی مشکیں کس دیں۔ اس سے فارغ ہو کر پیر صاحب کے صندوقچوں کی سونا چاندی' نقد مال' گھڑیاں' انگوٹھیاں' سب ایک چادر میں باندھا۔ پیر صاحب بندر کی طرح غوں غوں کی آوازیں نکال' دیدے پھاڑ کر اس کی جانب رحم طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بڑے اطمینان سے سامنے بیٹھ گیا' پاس ہی ایک ٹوکری میں فروٹ بھرا تھا۔ وہ ایک سیب آستین سے صاف کر کے اسے دیکھنے لگا پھر اپنی صدری سے کمانی دار چاقو نکال کر سیب کی قاشیں کاٹ کر کھانے لگا' اٹھ کر پیر صاحب کے پاس آیا' منہ سے کپڑا کھینچا اور ایک قاش ان کے پوپلے منہ میں ڈال کر بولا۔

"لیں' آپ بھی کھائیں---"

انہوں نے قاش زبان سے باہر دھکیل دی' روتے ہوئے ہکلائے۔

"میں نے آج تک تمہاری بڑی قدر کی ہے--- مجھ سے غلطی ہوئی ہے' میں شیطان کے بہکاوے میں آگیا' خدا کے واسطے میری خطا معاف کر دو---" وہ بری طرح رو رہا تھا۔

اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ "پیر جی! میں آپ کا تابعدار ہوں۔ آپ نے مجھے انسان بنایا' میں آپ کی مہربانی کبھی نہیں بھولوں گا مگر اسی انسان کو آج آپ نے پھر شیطان بننے پر مجبور کر دیا ہے--- میں آپ کو معاف کرتا ہوں مگر ساتھ ہی مجھے یہ بھی کہنے دیں کہ میں اس شیطان کو کبھی معاف نہیں کروں گا جس نے آپ ایسے نیک انسان کو بہکایا ہے---"

خون آلودہ چاقو ان ہی کی شلوار سے صاف کر کے' نیم بیہوشی کی حالت میں چارپائی پہ پھینک کر اور حجرہ باہر سے مقفل کر کے وہ اپنے ڈیرے پہ آگیا' اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر چھت سے لٹکتی ہوئی اپنی بیوی کی لاش پہ پڑی--- کھلی آنکھوں سے جیسے وہ کہہ رہی ہو کہ میں تمہارے قابل نہیں رہی--- اگلی صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ جمرود کا پل پار کر چکا تھا جہاں دس کوس دکن کی جانب ایک پہاڑی سلسلے میں اس کے زمانہ جہالت کا ایک معتمد ساتھی رہتا تھا۔ وہ واپس اسی دلدل میں اتر گیا۔ اس کے نصیب ہی ایسے تھے کہ پاؤں تلے آئی ہوئی پکی چٹان جیسی زمین بھی کچھ عرصے کے بعد ابلتی ہوئی دلدل بن کر اس کو ہڑپ کرنے کے درپے ہو جاتی اور وہ پاؤں کھینچ کر پھر کسی جائے اماں کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا۔ یہ نئی جگہ بھی اس کے لیے جائے اماں ثابت نہ ہوئی۔ داڑھی اور نماز روزے کے معاملے میں وہ ابھی تک ثابت قدم رہا۔ نماز میں اسے بے حد سکون ملتا۔ اسے پختہ یقین تھا کہ نماز دین' ایمانداری سے اس ظالم دنیا میں عزت سے نہیں جیا جا سکتا' عزت اور وقار سے زندہ رہنے کے لیے بڑھ کر چھیننا پڑتا ہے اور اگر تم ایسے نہیں کرو گے تو زمانے کا تیز رفتار ریلا تمہیں خس و خاشاک کی مانند بہا کر لے جائے گا اور ایک دن ایسا ہی ایک ریلا اسے بہا کر یہاں لے آیا۔ یہاں کی زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے اور پھر یہیں اس کے بالوں

نے ہلکی سی سفیدی پکڑلی۔ گردن کی ہنسلی تک پھیلی ہوئی داڑھی' لمبے لمبے گیسو' سبز جوغہ---اب تک درگاہ اس کے لیے جائے اماں تھی اور یہیں ایک لڑکی نے اسے پہلی بیوی کی کھلی آنکھیں یاد دلائی تھیں---عہد رفتہ کا ایک ایک ورق اس کے سامنے پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ سر جھٹک کر' آنکھیں کھول کر اردگرد کا جائزہ لینے لگا' اس نے بھیگی آنکھوں کو چادر سے صاف کیا۔

ادھر رات بھی بھیگ چکی تھی اور جذبہ ہو یا احساس' جب بھیگ جاتے ہیں تو اندر روح تک سیلن بھر جاتی ہے اور روح سل جائے تو سوچ صدق کے قبلہ رخ ہو جاتی ہے---یہی سوچتے سوچتے اسے شادو اور مراد یاد آ گئے۔ ان کا معصوم جذبہ بھیگا ہوا صدق---کاش! وہ بھی ایسے بھیگے ہوئے جذبے کا امین ہوتا---نہیں' نہیں---جیسے اس کے اندر سے حیوان نے سر اٹھایا---شادو میرے پاس آئی' مراد نے اسے ڈوری دی اور میں ہی اسے مراد دے سکتا ہوں۔ اس کا شوہر ناکارہ ہے' بیمار ہے' آج نہیں تو کل مر جائے گا۔ میں اس سے شادی کروں گا' اپنا گھر بساؤں گا---کیا کمی ہے! صحت' دولت' ہمت میں آگے بڑھ کر اسے چھین لوں گا۔ یہی میرا اصول ہے' یہی عزت اور وقار سے زندہ رہنے کا طریقہ ہے۔

اس کی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔

٭٭٭

دونوں ڈوریاں اس کی مٹھی میں ایک دوجے سے بغلگیر تھیں' اقلیم محبت کا جہانگیر اپنے جہان کی آئینہ بندی میں مصروف و مگن تھا۔ اس کی کیفیت اس مفلس و نادار کی سی تھی جس کی اچانک لاٹری نکل آئی ہو اور کیا کرے کیا نہ کرے' جس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔ اس کے سامنے شادو کا سراپا سرسرا رہا تھا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے فرش' ہلکی ہلکی ہوا' کھلی ہوئی چاندنی' موتیا چنبیلی کی ملی جلی خوشبو جیسے وہ جنت کے گوشے میں بیٹھا ہو۔ سامنے گزرنے والی ہر عورت میں اسے اسی حور شمائل کا پرتو نظر آتا اور ایسے میں اسے کیا نظر آتا؟ اس کی بائیں جانب چند قدموں کے فاصلے پہ اسی جنت میں ایک سانپ بھی کنڈلی مارے بیٹھا ہوا ہے جو اس عاشق زار کے ارمانوں میں زہر بھر دینا چاہتا ہے۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ سامنے دیوار کے اس پار مرمریں مرقد میں متیم نخی اس کی جھولی میں مرادوں کی خیر ڈال چکا ہے۔ فرحاں و شاداں اٹھا اور کسی نچیلے رنگیلے مست مور کی مانند اٹھلاتا ہوا مسجد کے وضو خانے کی جانب دیا۔ اپنی ترنگ میں یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ جس راہ سے وہ گزر رہا ہے وہیں پاس ایک سانپ بھی بیٹھا کینچلی اتار رہا ہے۔ تہجد کی اذان کے لیے حافظ شہاب الدین شاہ صاحب وضو کر رہے تھے۔ وہ خاموشی سے ان کے پاس بیٹھ کر وضو کرنے لگا۔ وضو کے بعد نہایت ادب سے سلام کیا تو مسکرا کر انہوں نے سلام کا جواب دیا اور اس کا بازو تھام کر مسجد کے اندر اپنی مخصوص جگہ پہ بیٹھ گئے جہاں ایک شخص مائیک ٹیسٹ کر رہا تھا۔ ابھی اذان میں چند منٹ باقی تھے۔

"ہاں بھئی جوان!---اور سناؤ؟"

"جی' اللہ کا کرم ہے' آپ کی دعا ہے---حافظ صاحب! آپ کے مدرسے کے صحن میں ایک مریض تھا' کیا حال ہے اس کا؟"

"ہاں' ایک مریض تھا۔ اس کی بوڑھی ماں میرے پاس آئی تھی' پانی دم کرانے کے لیے---کوئی دیہاتی تھا بچارا' بڑا واویلا مچا رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ عصر کی نماز کے بعد وہ لوگ چلے گئے تھے مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ کوئی عزیز تھا تمہارا؟"

"جی نہیں' وہ میرا عزیز نہیں تھا۔ وہ تو---؟"

"وہ تو شادو کا خاوند تھا---" اس کا ادھورا جملہ حافظ صاحب نے پورا کر دیا۔ "حیران مت ہو کہ میں کیسے جانتا ہوں؟---دراصل جب تم روضہ شریف کے دروازے پہ مجھ سے باتیں کر رہے تھے' وہ دیکھ رہی تھی پھر مدرسے میں مجھے دیکھ کر میرے پاس آئی اور اپنی' تمہاری اور خاوند کی ساری باتیں مجھے بتانے لگی---بڑی معصوم اور دکھی بچی ہے جوان!۔ اللہ اس کے لیے بہتر کرے۔"

وہ اذان کے لیے کھڑے ہو گئے۔

٭٭٭

رات آدھے سے زیادہ بیت چکی تھی' بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چاند سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ جھینگروں کی راگ داری اپنے عروج پہ تھی۔ اپلوں کے دھوئیں' گوبر' گھاس' چارے کی مخصوص بوباس نے فضا کو قدرے بوجھل کر دیا تھا۔ گاہے گاہے ڈھور ڈنگروں کے ڈکرانے اور کتوں بلوں کی کٹ کناریوں کی آوازیں بھی ٹلوں' گھنٹیوں کے ترنم کے ساتھ بے ہنگم سا ہنگامہ برپا کر دیتیں۔ بوڑھا چوکیدار شاید کہیں ٹھنڈے حقے کی نے منہ میں دبائے اونگھ رہا تھا مگر شادو اپنی جھلنگی کھاٹ پہ جاگ رہی تھی' پڑی ہوئی نیم باز آنکھوں سے آسمان کے سمندر میں تیرتے ہوئے چاند کو تک رہی تھی۔ آج اسے بڑھیا کا چرخہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہاں تو ایک چہرہ تھا زندگی اور اس کی توانائیوں کی تمازت سے تمتماتا ہوا---صحن کے ساتھ دالان میں اس کا سدا کا بیمار شوہر وقفے وقفے سے کھانس کر اپنے ناکارہ وجود میں باقی چند سانسوں کا احساس دلا رہا تھا۔ اس کی ساس نماز والے چوکے پہ سوئی پڑی تھی' دن بھر کی دوڑ دھوپ نے اس کی سدھ بدھ مار دی تھی۔ اس کے خوفناک خراٹوں کی آواز سے دور بندھی مریل بھینس اپنی جگالی روک کر اسے گھورنے لگتی تھی۔ اس کی جھگڑالو بیوہ نند اپنے دو بچوں سمیت ایک بڑے سے کھٹولے پہ خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی اور جاگ رہی تھی اللہ کی ذات یا یہ عورت' جس کا نام شادو تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کس ان پڑھ نے اس کا یہ نام رکھا؟ پیدا ہونے سے اب تک شادمانی نام کی کوئی چیز تو اس نے دیکھی نہیں۔ پیدا ہونے کے چندرھویں دن اس کا باپ پانی کی تقسیم کے ایک جھگڑے میں اپنا سر کھلوا بیٹھا اور

علاج معالجے میں غفلت کے باعث سر میں کیڑے پڑ گئے۔ ان کیڑوں نے اس کا بھیجا چاٹ لیا' چند دنوں کے بعد وہ کیڑوں سمیت قبر میں لیٹ گیا۔ ایک اجڈ سا بھائی جو فوج میں تندور چی تھا کھیتی باڑی کی مشقت سے بھاگا ہوا اور اس کی کوئی خیر خبر ہی نہیں۔ ایک بڑی بہن' بس! جب سے ہوش سنبھالا تو فاقوں' گالیوں' جھڑکیوں اور ذلت کے سوا کچھ نہیں ملا۔۔۔ چار گھر پچھواڑے چاچا دینے کے گدھے کی ڈھینچوں ڈھینچوں نے اس کے خیالوں کی مالا توڑ دی۔ کروٹ بدل کر اپنے پاؤں کو پائنتی کے ادوائین سے کھجانا چاہا' شائد کسی مچھر نے کاٹ لیا تھا۔۔۔ کھوں کھوں کی آوازیں اب گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ نند کا بڑا بچہ شاید خواب میں بڑبڑا رہا تھا۔ ساس نے بھی اب کروٹ لے لی اور خراٹوں کی لے بدل گئی۔ بھینس بھی نتھنوں سے پھوں پھوں کی آوازیں نکالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ سب کچھ یوں تو روزمرہ کا معمول تھا مگر آج یہ سب کچھ بڑا پراسرار لگ رہا تھا' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے درود شریف پڑھنا شروع کر دیا۔۔۔ کھوں' کھوں' کھوں۔ ہائے' ہائے۔۔۔ یہ کھوں' کھوں اور ہائے ہائے کی آوازیں اس کے لیے اجنبی نہ تھیں۔ یہ تو صبح و شام کی کمسنتی' سسکتی' بلبلاتی زندگی کا ایک حصہ تھیں اور سہاگ رات اسے خاوند کی جانب سے یہی تحفہ ملا تھا۔ اسے خواب یاد تھا کہ اس کا خاوند کوٹھڑی میں داخل ہوتے ہی اس کے پاؤں کے پاس کھوکھلے تنے کی مانند گر پڑا تھا۔ اس کی متوحش آنکھوں کے ڈیلے ابل پڑے اور سانس کی دھونکنی تیز تیز چلنے لگی۔ تھی وہ شگنوں کے جوڑے میں مہندی لگے کومل کومل ہاتھوں سے ساری رات اس کا سینہ ملاتی رہی۔ اس کی نند نے دوائی کے نام پہ اسے افیون گھول کر پلائی تو اسے چین آیا۔ پھر وہ صبح تک ایک مردے کی مانند اس کے پہلو میں پڑا رہا اور وہ ایک سجی سجائی زندہ لاش بن کر ارمانوں کی سیج پہ اپنے نصیبوں کو روتی رہی۔ صبح اس کے سرخ جوڑے پہ بلغم کے چھینٹے تھے اور بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ کلائی کی چوڑیاں کچھ تو رات اسے سنبھالتے ہوئے ٹوٹ گئیں اور باقی اس نے خود توڑ ڈالیں۔ اپنے طور وہ سہاگ رات ہی بیوہ ہو چکی تھی۔ یہ جینا بھی کوئی جینا تھا' نہ سہاگنوں میں' نہ بیواؤں میں اور سانس کھینچنے کا نام اگر زندگی ہے تو وہ زندہ تھی۔ منہ اندھیرے وہ گھر کے کام کاج میں جت جاتی۔ چکی' چولہا' چارا' اپلے' کھانا پکانا' صفائی' نند کے بچے' ساس کی جھڑکیاں' خاوند کی تیمارداری۔۔۔ تھک ہار کر وہ رات کو کھاٹ پہ مردے کی طرح پڑ جاتی۔ پھر ساری رات وہی کھوں کھوں' ہائے ہائے۔۔۔ کنگھی پٹی تو الگ' ڈھنگ کا پہناوا ابھی نصیب نہیں تھا۔ وہ صبر شکر کر لیتی اگر اسے کوئی آرام سے جینے دیتا' نند تو جیسے اس کو کوسنے اور طعنے دینے کے لئے بیوہ ہو کر یہاں آئی تھی۔ بھائی کی بیماری اس کے سر' بچہ نہ ہونے کا الزام اسی پر' اور تو اور وہ اپنے بیوہ ہونے کا کارن بھی اسی کو جانتی' قرآن شریف کی قسم کھا کر کہتی کہ اسی ڈائن نے میرے بھرو دیر پر تعویذ کئے ہوئے ہیں۔ یہ اسے ہی منحوس کھا کھا کر سانڈنی ہو گئی ہے۔ یہ خود ہی بچے والی نہیں بننا چاہتی' پتہ نہیں کہاں منہ کالا کرے گی۔۔۔ ساس بوڑھی ایسی باتیں تو نہ کرتی لیکن اپنی زبان درازی بیٹی کو

منع بھی نہ کرتی' بس حکیموں' ویدوں اور پیروں کے پیچھے پھرتی رہتی۔ پڑیاں' گولیاں' شربت' جھکیاں' خدا جانے کیا کیا اسے دیتی رہتی لیکن کوئی عقل کا اندھا' نیم حکیم اور دے سے آگے تشخیص ہی نہ کرتا کہ اسے کوئی اور بیماری بھی ہو سکتی ہے۔ کاش! ابھی کوئی حکیم یا پیر اس سے پوچھ لیتا تو یہ فوراً بتا دیتی کہ اسے کیا بیماری ہے۔ اس کے گلے کی پھولی ہوئی رگوں کی مالش کرتے کرتے اکثر اس کی انگلیاں لوہے کے شکنجے جیسی سختی پیدا کر لیتیں' یہ سب کچھ لاشعوری طور پر ہو جاتا اور بڑی مشکل سے وہ خود پر قابو کر پاتی۔۔۔ یہ نہیں کہ وہ بزدل تھی' بزدل ہوتی تو کبھی کی پھانسی لگ جاتی یا افیون کھا کر لمبی لمبی لیٹ رہتی' یہی افیون جو اس کے نام نہاد شوہر کے لئے تریاق کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کے بغیر تو وہ شاید ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ بھی ساس کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ پیدائش کے سے بڑا کمزور اور لاغر تھا۔ ساری رات روتا رہتا' کسی سیانی کے کہنے پہ دو تل کے برابر افیون اسے دے دیتی جس کے بعد وہ سکون سے سو جاتا۔ پھر عمر کے ساتھ ساتھ یہ تل بڑھ کے چنے کے برابر ہو گیا اور اب دن بھر کے لئے ریٹھے کی گولی کے برابر افیون چاہئے تھی۔ ممتا کی ماری بوڑھی ماں اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے کہیں نہ کہیں سے بندوبست کر دیتی۔ اسی بندوبست میں اب اس کے سارے چاندی کے زیور آہستہ آہستہ دلے جوگی کے پاس منتقل ہو چکے تھے جو خود بھی افیونی تھا اور چوری چھپے فروخت بھی کرتا اور شادو کے اپنے نوم چھلے تو شادی کے پہلے دو چار مہینوں میں ہی غائب ہو گئے۔۔۔ فضل کی اس کنائی پہ اس کی شادی کو پورے تین برس ہو چکے تھے جیسے تین صدیاں گزر چکی ہوں۔ وہ اپنی بڑی بڑی پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے اپنے دھوئیں میں لپٹے ہوئے مستقبل کو ٹک ٹک دیکھتی رہتی۔ اس کے اردگرد دھواں ہی دھواں تھا' اس دھوئیں میں اسے کچھ بھی سجھائی نہ دیتا کہ وہ کیا کرے' کدھر جائے؟ کتنے ساون اس کی آنکھوں کے جھروکوں سے گزر گئے۔ بہار کے موسموں کی کتنی رنگیلی رتیں اس کے رت بکوں سے روٹھ کر منہ موڑے کسی اور طرف نکل گئیں۔ لمبی لمبی حبس ماری راتوں میں اسے اپنے صندلی سراپے سے اٹھتی ہوئی کستوری کی بھینی بھینی مہک پاگل کر دیتی۔ وہ دانتوں تلے ہونٹ دبا لیتی' کبھی خون بھی رس آتا جس کا سواد اسے بہت اچھا لگتا۔ وہ خود ہی جلتی' خود ہی تاپتی۔ وہ بدنگاہ یا گندے ذہن کی مالک نہیں تھی۔ نماز روزے کی پابند' شرم و حیاء والی' صبر شکر والی۔۔۔ لیکن ہر چیز کی کوئی انتہا یا حد ہوتی ہے۔ انسان بھی ایک حد تک ہی صبر' شکر یا برداشت کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ اس سے آگے وہ صبر کے ہتھیار پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لیتا ہے۔۔۔ کوئی ٹیری چیختی چلاتی ادھر سے ادھر پرواز کرتی ہوئی صحن کے اوپر سے گزر گئی۔ چاند بیچارہ زرد منہ لئے ہوئے کالیوں کے جھنڈ میں منہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہلکی ہلکی اوس نے اس کا سراپا خنک کر دیا جیسے ورتے کے کالے ڈوریے کے دوپٹے کو استری کے لئے کسی پھٹے پہ پھیلا دیا ہو' وہ لیٹی ہوئی یا چارپائی پہ پڑی ہوئی تھی۔ پو پھوٹنے میں ابھی کافی دیر تھی' نیند کے ہلکے ہلکے ہلکورے اس کی نیم خوابیدہ آنکھوں میں تیر رہے تھے۔ ایسے نور پیر کے ویلے' کتوں' چوروں

اور چوکیداروں کو بھی نیند آجاتی ہے جن کا کام ہی جاگنا ہوتا ہے اور وہ تو عورت ذات! دن بھر کی ٹوٹی تھکی ہوئی' کروٹ بدل کر اس نے بھاری بھاری غلافی پپوٹوں کو اذن وصال دے دیا---وصال تو ابھی تک اسے نصیب نہ ہوا تھا' آنکھوں کے پپوٹوں کو کیسے ہوتا؟--- کھوں' آکھوں--- ہائے' ہائے میں مر گیا--- کھوں--- آمین' ثم آمین!--- یہ الفاظ' شادو نے نہیں کہے تھے۔ اسی لمحے سامنے کچی دیوار پہ دو کالی بلیوں کے بین کا ترنم تھے اور جانے یہ کمبخت کہاں سے آ نکلی تھیں؟ گاؤں میں تو شاید کالی بلیاں تھیں ہی نہیں--- اس کی ساس نے بڑبڑا کر وہیں لیٹے لیٹے ''دفع دور' خصماں نوں کھانیوں'' کہا۔ پھر وہ بلند آواز سے کلمہ پڑھنے لگی جسے اگر مولوی سن لیتا تو زیر زبر کی کم از کم دو غلطیاں نکالتا۔ شادو نے ایک نظر اندر دالان کی جانب ڈال کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کھوں' کھوں کا ایک سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

''نی شادو---!'' فوراً جواب نہ پا کر وہ قدرے بلند آواز میں بولی۔ ''نی شادو' نامراد! اٹھ نی' ذرا فضلے نوں تک---'

''اٹھ نی' نیندراں ہٹھیے--- اس کی نند نے بھی اپنے روتے ہوئے بچے کو سینے سے چمٹاتے ہوئے لقمہ لگایا۔

''اٹھ رہی آں' ماسی!''

قہر آلود نگاہوں سے نند کو دیکھتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھی اور پلو سر پہ ڈال کر دالان کی جانب بڑھ گئی۔ کھانستا' ہانپتا ہڈیوں کا ڈھانچہ اکڑوں بیٹھا تھا' اس کے دونوں ہاتھ کھاٹ کی پٹیوں پہ جمے تھے' کھانستے کھانستے وہ سجدے میں چلا جاتا اور پھر سانس بھرنے کے لئے قدرے آجاتا۔ وہ سرہانے بیٹھ کر اس کی کمر اور گردن سہلانے لگی۔

''نی' اسے پانی پلا---!'' ساس وہیں سے حکم دینے لگی۔

وہ پانی لینے کے لئے اٹھی اور یہ سجدے میں گر پڑا۔ پانی کا آدھا گھونٹ بھی اس کے حلق سے نیچے نہ اترا' دونوں باچھوں سے باہر آ گیا کہ مسلسل کھانسی نے اسے بے دم کر دیا تھا' ناچار اس کی ماں اٹھی اور پلو کی گانٹھ سے افیون نکال کر پیالے میں گھولنے لگی۔ اس کی بہن بھی پاس آ بیٹھی۔ بڑے جتنوں سے انہوں نے اس کی خوراک حلق میں انڈیلی' ان بیچاروں کے پاس یہی ایک علاج تھا جو ان کے بس میں تھا مگر آج یہ شافی علاج بھی کارگر نہ ہوا' اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی' کھانسی کی گرہ ایسی پھنسی کہ ڈیلے ابل پڑے' گلے کی رگیں تنبورے کے تاروں کی طرح تن گئیں۔ باچھوں سے گندلا سیاہی مائل لعاب ٹپک رہا تھا۔ اس نے مضبوطی سے شادو کی کلائی پکڑ رکھی تھی جیسے وہ اسے چھوڑ کر کہیں بھاگنے والی ہو۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اتنی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا--- پھر اس کی بہن حکیم کو لانے کے لئے باہر نکل گئی اور ماں تختی گرم کرنے کے لئے چولہے میں پھونکوں سے آگ اڑانے لگی۔

''ماسی' نی ماسی---!'' شادو وہیں سے چلائی۔ ''میری بانہہ چھڑا---''

اس کی کلائی جیسے لوہے کے پنجے میں جکڑی ہوئی ہو۔ شادو کا ہاتھ سفید پڑ گیا' دوران خون رک گیا' کلائی کی ہڈی کڑکڑانے والی تھی کہ بڑھیا بھاگی بھاگی آئی۔

''ہائے نی--- میرا پتر!''

اس نے پاس آ کر دو ہتڑ سینے پہ مارے--- اس کی باچھوں سے اب سرخی مائل تھلو ٹپک رہا تھا۔ پھر ہڈیوں کے ڈھانچے نے ایک زور کا جھٹکا لیا جیسے کسی نے بجلی کا تار چھو دیا ہو--- بس اسی جھٹکے کے ساتھ ہی گرفت ڈھیلی ہونے شروع ہو گئی۔ اس نے جلدی سے اپنا بازو چھڑایا جہاں ایک سرحد سی بن گئی تھی' ایک طرف زندگی کی گرمی اور سرخی' دوسری جانب موت کی سپیدی اور کپکپا دینے والی یخ بستگی' وہ بازو ملنے لگی--- گردن کے لڑھکنے کے ساتھ ہی ماں نے پیٹنا شروع کر دیا۔ شادو منہ بسورے اس کی باچھیں اپنے دوپٹے سے پونچھنے لگی۔

آذان سے پہلے پہلے پورے گاؤں میں شادو کے بیوہ ہونے کی خبر پھیل گئی۔ گاؤں والوں کے لئے آج کا سورج کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا تھا۔ پاس پڑوس اور گاؤں والے آہستہ آہستہ موت والے گھر کا رخ کر رہے تھے' مسجد کے مولوی صاحب اور قبرستان کے گورکن سائیں جیونا کو بھی یہ خبر مل چکی تھی--- آج جمعہ مبارک کا دن تھا' لوگ ویسے بھی فارغ ہوتے ہیں' آذان کے بعد مسجد سے اعلان کر دیا گیا۔ گاؤں کے میراثی اور نائی نے اپنی اپنی ڈیوٹیاں سنبھال لیں' صحن میں پھٹی ہوئی دری بچھ گئی۔ تین چار حقے تھے جن کے گرد پندرہ بیس لوگ جمع ہو چکے تھے اور تو اور فضل' شادو کی بہن بہنوئی کو فوتگی کی اطلاع پہنچانے کے لئے روانہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

نماز کے بعد سلام پڑھا جا رہا تھا' مراد بھی خشوع و خضوع کے ساتھ سلام پڑھنے میں شامل تھا۔ آج جمعہ کے روز مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ اکثر لوگ جمعرات کو آتے'' ساری رات عبادت کرتے اور جمعہ کی نماز ادا کر کے واپس جاتے۔ ابھی صبح صبح یہ عالم ہے تو جمعہ کی نماز تک کیا حشر ہوگا؟--- سلام کے بعد وہ ناشتہ کرنے کے لئے باہر نکل آیا' فوجی ہونے کے ناتے وہ دن بھر میں چار پانچ بار چائے پینے کا عادی تھا' خصوصاً صبح ناشتے پر وہ پورا مگا کڑک چائے کا پیتا تھا۔ اسی چائے کی تلاش میں وہ کوئی چائے کی دوکان دیکھ رہا تھا۔ پھر حلوہ پوری' چائے سے فارغ ہو کر وہ ساتھ والے میدان کی طرف جا نکلا جہاں میلہ لگا ہوا تھا گو ابھی اتنی بھیڑ نہیں تھی پھر بھی اچھی خاصی رونق اور گہما گہمی تھی۔ درگاہوں' مزاروں پہ ایسے عرس' میلے ٹھیلے' زیادہ تر دیہاتیوں' کسانوں' محنت کشوں کے دم قدم سے آباد ہوتے ہیں اور یہاں بھی زیادہ تر ان لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ دکھائی دے رہے تھے--- یہ جانتے ہوئے بھی کہ شادو

کل کی واپس چلی گئی ہوئی ہے' وہ اسے تلاش کرتا رہا کہ شاید کہیں سنگ مرمر' کنگھی شیشے' عطر چھیلی خریدتی ہوئی نظر آجائے' ہر لڑکی اسے شادو نظر آتی--- وہ کافی دیر میلے کی دلچسپیوں اور دل کی وابستگیوں میں کھویا رہا۔ اسی دوران اس نے گڑیا خریدنی چاہی جس نے ایک بڑی سی نتھ' جھمکے' چوڑیاں' رنگ برنگا گھاگرا اور چولی پہن رکھی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں' لمبی سی چوٹی--- پھر اس نے ارادہ بدل دیا' یہ بھی تو بت کی ایک شکل ہے--- اسے حافظ صاحب یاد آگئے اور ایک پین' ناخن تراش اور چھوٹی ڈائری خرید کر وہ واپس مسجد لوٹ آیا۔

شاہ مراد کی چھٹی کا آج دوسرا روز تھا' ہفتہ کی شام اس نے اپنی یونٹ واپس پہنچنا تھا۔ اس نے سوچا کہ جمعہ کی نماز تک آرام کرلے' ساری رات پلک سے پلک نہیں لگی تھی اور کل دن بھر کی تھکاوٹ' رتجگے نے مدہوش سا کردیا تھا' گھر سیدھی کرنے کا ارادہ کرکے وہ مسجد کے برآمدے کے ایک ستون سے لگ کر نیم دراز ہوگیا اور جیب سے ڈوریاں نکال کر دیکھنے لگا جو ابھی تک ایک دوسرے سے الجھی ہوئی تھیں جیسے مدتوں کی بچھڑی ہوئی ہوں--- گذشتہ روز و شب کے تمام واقعات کی ڈوریاں بھی الجھی ہوئی تھیں اور آئندہ کا کوئی لائحہ عمل فی الحال دماغ میں نہیں تھا۔ شادو نے کہا تھا کہ ان ڈوریوں کو اپنے "ڈولے" پہ باندھ لینا مگر جانے کیوں وہ ابھی تک عمل نہ کرسکا' بس بار بار مٹھی کو کھول کر ان کو دیکھتا۔ لال' فیروزی منکے چمک رہے تھے۔ خوبصورت' خوش رنگ چھوٹے چھوٹے منکے--- وہ دیر تک تماشا دیکھتا رہا۔ اک خوش رنگ مسکان اس کے چہرے پہ کھلی ہوئی تھی۔ فرط انبساط یا خمار زندگی سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ڈوریوں والا ہاتھ بے خیالی سے دل پہ دھرے وہ وادی ایمن میں اتر گیا--- حد نظر' ہر جانب یاقوت اور فیروزے بکھرے پڑے تھے۔ سیماب کے سیمیں پانیوں سے جھلمل جھلمل کرتی ہوئی نہریں' مونگے کی چٹانیں' موتی اور مرجان چگتے ہوئے اصفہانی کبوتر--- لاجورد کے ایک جھاڑ تلے' سنگ داؤدی کے تخت پہ احمریں منقش جوڑے میں ملبوس' مہر و انجم کی کرنوں کا سولہ سنگار کئے ہوئے شادو اس کی جانب چاہت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اور وہ ایک انجانی سی کشش کے زیر اثر اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

سائیں مولا بخش ابھی تک وہیں صحن میں چہرہ اور جسم چادر میں لپیٹے بیٹھا تھا۔ اس کے اردگرد کا ماحول تبدیل ہوچکا تھا' پیشہ ور نعت خواں خوب گلے بازی کر رہے تھے اور وہ سب سے بے نیاز' اپنے ہاتھوں کھودی قبر میں اترا ہوا تھا--- سارا دن' ساری رات کا جاگا ہوا تھا' آنکھیں شعلہ بار ہو رہی تھیں۔ دو چار معتقد کارندے اور ملنگ سامنے بیٹھے کسی حکم کے منتظر تھے۔ ادھر اس کے اڈے پر بھی ہجوم اکٹھا ہوچکا تھا۔ دعا' دم' تعویذوں والے انتظار کر رہے تھے۔ سورج کی کرنوں کی ہلکی سی تمازت اپنی پشت

محسوس کرتے ہوئے وہ اٹھا' لمبی سی انگڑائی توڑی--- اب چادر گھسیٹتا ہوا وہ قبرستان کی جانب جا رہا تھا۔ ڈیرے پہنچ کر اس نے چلے بیٹھنے کا اعلان کر دیا اور پل بھر میں یہ خبر پھیل گئی۔ اپنے اڈے پر اس کا دست راست حاجی فقیرا قائم مقام تھا--- ڈوریاں بٹ رہی تھیں۔ دعا' دم' جھاڑ' پھونک' تعویذ' گنڈے سب سلسلہ اسی طرح جاری تھا اور آنے جانے والوں کو یہ خوشخبری سنا دی جاتی کہ سائیں سرکار آج سے چلے بیٹھ رہے ہیں جو اگلی جمعرات پورا ہوگا--- سائیں سرکار کا یہ چلہ بھی بڑی اہمیت اور کمائی کا حامل تھا۔ معتقدوں اور دعا برکت حاصل کرنے والوں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی' دور دور سے دیہاتی مرد' عورتیں' بچے' بوڑھے جوق در جوق آنا شروع ہو جاتے۔ پانی کی بوتلوں' کپوں اور برتنوں کے انبار لگ جاتے اور ہر بوتل یا برتن پہ نام اور کام لکھا ہوا ہوتا۔ یہ سارے برتن' بوتلیں سائیں سرکار کے چلے والے مقام کے باہر رکھ دی جاتیں' چلے کے بعد سائیں سرکار ان پہ دم پھونکتے۔ سائل نذر نیاز پیش کرتے' سائیں سرکار کی زیارت کرتے' دست بوسی کرتے اور مرادیں پاتے۔ کئی ضرورت مند تو اپنے مویشی' جانور' بکریاں' مرغیاں تک چھوڑ جاتے کہ ان کی دعا اور چلے کی خصوصی برکت سے دودھ' گوشت' انڈوں اور بچوں میں اضافہ ہو جائے۔ بیماروں کی چارپائیاں یہاں پہنچا دی جاتیں جو قبرستان میں' قبروں کے پاس کئی کئی روز پڑی رہتیں' ان کے ساتھ آئے ہوئے تیماردار مرد' عورتیں' بوڑھے' بچے بھی ہوتے--- گویا یہ چلے کا زمانہ بھی بڑی تبدیلیاں اور گہما گہمیاں لاتا۔ جھونپڑے کے اندر' اگربتیوں اور لوبان کے مشکبار دھوئیں کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں' چلے کا انتظام کرنے والے مخصوص ملنگوں نے آج دھلے ہوئے چیتھڑے پہنے ہوئے تھے۔ جھونپڑے کے باہر' اردگرد چونے کے علاوہ موٹی سی جھاڑیاں' درختوں سے باندھ کر دوہرا حصار قائم کردیا گیا تھا' اس کے اندر مخصوص ملنگ کے سوا جانے والا جل سکتا تھا یا جنوں کے غضب کا نشانہ بن سکتا تھا۔ پھر باہر کا حصار بند ہوتے ہی اندر جھونپڑے کا پٹ بھی بند ہو گیا--- اندر سائیں مولا تھا' باہر ملنگ پہرے پہ چاروں کونے کھڑے ہوگئے۔ حصار کے پاس لکڑی کا تخت رکھ دیا گیا تھا۔ پھول' کھانے' بتاشے' پھولوں کے ہار' اگربتیوں کے بنڈل' لوگ آتے اور کچھ نہ کچھ اس تختے پہ رکھ دیتے۔ دور سے جھونپڑے کا نظارا کرتے مگر حصار کے قریب تک جانے کی کسی میں جرات نہ ہوتی--- بوتلیں' برتن بھی قطار در قطار تختے کے نیچے دھری جا رہی تھیں۔ ادھر نماز جمعہ کی پہلی اذان کی تیاریاں تھیں' لوگ جوق در جوق مسجد کی جانب رواں دواں تھے تاکہ مسجد کے اندر پہلی صفوں میں جگہ پاسکیں' شاہ مراد تو بہت پہلے سے پہلی صف میں بیٹھا ہوا تھا--- سائیں مولا بخش بھی اپنے چلے پر بیٹھ چکا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کے اندر کا غبار بھی بیٹھنے لگا جیسے پانی کا چھڑکاؤ کرنے کے بعد دھول مٹی بیٹھ جاتی ہے۔ وہ ٹیک لگا کر نیم دراز ہو' یا' حالات اور واقعات پر از سر نو غور کرنے لگا۔ اپنی خیالات' بے بسی' ہیجانی کیفیت پر قابو پانے کے لئے تنہائی انتہائی ضروری تھی اور چلے سے بہتر کوئی پناہ گاہ نہیں تھی' وہ کہہ بھی چکا تھا کہ ان دونوں کے لئے چلے کاٹے گا۔

وہ چاہتا تھا کہ شادو آئے' وہ شاہ مراد کا طرز عمل بھی دیکھنا چاہتا تھا' ان امکانات پر غور کرنا چاہتا تھا جن پہ عمل کرکے وہ اپنی راہ ہموار کرسکے--- اس نے کلیان کے منہ پر اک انگارہ دھرا اور دھوئیں کے بادلوں میں ہوش و خرد کے پروں بغیر اڑنے لگا--- باہر جھونپڑے کے ساتھ رسی سے منسلک ایک خالی ٹین کھڑکا جس کا مطلب یہ تھا کہ صاحب چلہ' اپنے خاص کارندے کو طلب فرمارہے ہیں۔ اس کا کھڑکنا سنتے ہی باہر ملنگوں نے نعرہ مستانہ بلند کیا' اردگرد کی شکستہ قبروں کے مردوں نے کروٹ بدلی' اک بدہیبت ملنگ اس طرح جھونپڑے میں داخل ہوا جیسے کسی اوترے کی قبر میں بچھو داخل ہوتا ہے۔

***

غسل دینے والوں کو مردے کی کھنچی ہوئی باچھیں' لٹکا ہوا جبڑا اور ٹیڑھی ٹانگیں راہ راست پہ لاتے ہوئے کافی دقت اور مشقت کا سامنا کرنا پڑا' آنکھوں کے گڑھے گہرے اور ناک کی گھوڑی بائیں کروٹ بیٹھ گئی تھی۔ مولوی صاحب نے بڑے بڑے مردے نہلائے تھے مگر اس قسم کے مردے کے سامنے ان کی چیں بول گئی۔ پاؤ بھر کافور انڈیلنے کے باوجود چربی کے جلنے کی چراند جیسی بدبو ختم نہیں ہوئی تو مجبوراً انہوں نے عطر اور پھولوں کا ڈھیر ڈال کر جنازہ تیار کردیا اور خود غسل کرنے کے لئے چلے گئے--- جمعہ کی نماز کے بعد جنازہ پڑھنے کے پروگرام تھا۔ ابھی تک اس کے رشتہ دار اور بہن بہنوئی نہیں پہنچے تھے۔ صحن مردوں' بوڑھوں سے بھرا ہوا تھا' ادھر دالان کے پاس عورتیں جمع تھیں۔ مردے کی چارپائی صحن اور دالان کے درمیان پڑی تھی۔ بوڑھی ماں بانہیں پھیلا پھیلا کر بین کررہی تھی' بیوہ بہن اپنے دکھوں کو یاد کرکے پیٹ رہی تھی اور شادو بچاری خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ اس کے جسم کا رہا سہا لہو بھی خشک ہوچکا تھا' کسی زندہ لاش کی طرح وہ ہر شے کو دیکھ رہی تھی۔ الجھے ہوئے بالوں' ہونق آنکھوں سے وہ باولی سی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بار بار باہر کے دروازے کی طرف دیکھتی' شاید اسے اپنی بہن کا انتظار تھا یا کسی اپنے کا جو اسے دلاسہ دے' جس کے گلے لگ کر وہ دل کا غبار نکالے۔ مرنے والوں' شریکوں' رشتہ داروں نے بولیاں مار مار کر اسے ہلکان کردیا تھا۔ اس کی حالت اس زخمی چڑیا جیسی تھی جو سینکڑوں چیلوں کے درمیان پھڑپھڑا رہی ہو--- تب ہی ایک دہلا دینے والی چیخ کے ساتھ اس کی بہن دوہتڑ پیٹتی اندر داخل ہوئی۔

جمعہ کی نماز پہ اچھی خاصی بھیڑ تھی' مولوی صاحب نے بھی موقع محل دیکھ کر خوب زور خطابت دکھایا۔ چند روزہ دنیا کی حقیقت' اگلے جہان کے انعامات' مسجد کی حالت زار' مدرسے کی ضروریات' اپنی خدمات' علماء کی توقیر' غرض ہر موضوع پہ خاطر خواہ روشنی ڈالی۔ جنازے کے بعد باہر کے قبرستانوں میں اس شہید منشیات کو دفنا دیا گیا' اردگرد جھنگ کے خودرو پودے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

قلوں کے ختم کے بعد دور دراز سے آنے والے عزیز رشتہ داروں نے بھی چار پانچ روز خوب

روٹیاں توڑیں تو واپس جانے کی تیاریاں شروع کردیں۔ اس کے میکے سے بہن بہنوئی' ان کے بچے اور دور کے رشتہ دار آئے تھے۔ انہوں نے بھی دبے دبے الفاظ میں اپنی مجبوریاں اور ذمہ داریاں سنانا شروع کردیں اور ویسے بھی ان کی یہاں پذیرائی کرنے والا کون تھا؟ اک تھلک شادو کے ساتھ بیٹھے وہ صبح سے شام کردیتے اور کوئی ان کو گھاس نہ ڈالتا۔ شادو کا اور تھا بھی کون؟ لے دے کے یہی ایک ماں جائی سگی بڑی بہن جو نہ ہونے کے برابر تھی' دور ایک گاؤں میں بیاہی ہوئی' خاوند پٹواری تھا۔ ظاہر ہے گھر میں آسودگی بھی تھی اور سرکارے دربارے اثر رسوخ بھی' اپنے جیسے حرام خوروں اور بدمعاشوں میں اٹھنا بیٹھنا--- کہتے ہیں ناکہ ایک لقمہ حرام' سو برائی کے دروازے کھول دیتا ہے لہٰذا شروع سے ہی بدنظر اور اوباش تھا۔ اس کی بہن سے شادی تو اس کی ہوگئی لیکن وہ اس پہ بھی ڈورے ڈالتا رہتا۔ اس کا بس چلتا تو اس کو بھی گھر ڈال لیتا' وہ تو اس کی شادی ہوگئی اور اس سے اس کی جان چھوٹی۔ اس کی بڑی بہن بھی خاوند کے کرتوتوں سے واقف تھی اسی لئے اس کا آنا جانا یہاں نہیں تھا اور نہ ہی کبھی اس نے شادو کو اپنے ہاں بلایا۔ وہ شادو کو مجسم جنس کی منحوس سمجھتی--- اتنی دور بیاہ کر اس نے اپنا پلا پاک کرلیا ہوا تھا۔ اب شادو کے بیوہ ہونے پہ دنیا خاطر آتو گئی لیکن اب بے شمار خدشے اس کے اندر سر ابھار رہے تھے۔ اپنے خاوند کی بدلتی ہوئی نظریں اور حد درجہ اظہار ہمدردی کی شدت کو وہ محسوس کررہی تھی۔ آج ہی صبح وہ دلاسہ دیتے ہوئے اسے کہہ رہا تھا کہ فکر نہ کرو شادو! ہم تمہیں عدت کے بعد یہاں سے لے جائیں گے--- اب اس کی بہن کے لئے ایک لمحہ بھی یہاں ٹھہرنا مشکل ہو رہا تھا' وہ کسی لمحہ واپس جانے کا بہانہ پیش کرنے والی تھی۔ قریب قریب سارے روٹیاں توڑنے والے جاچکے تھے' ایک آدھ قریبی شریکے والے بھی ابھی تک موجود تھے۔ شام کے وقت شادو کی ساس نماز سے فارغ ہوکر چوکے پہ بیٹھی تو وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"ماسی! اللہ کی مرضی' کوئی کیا کرسکتا ہے۔ تمہارا ایک ہی بیٹا تھا' بڑا نیک اور سادہ۔ اللہ اس کو جنت نصیب کرے--- ہماری بہن بھی بیوہ ہوگئی ہے۔ ہمارا دکھ اور غم سانجھا ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس کر بولی۔

"ماسی! اب کیا کرنا ہے؟"

شادو کی ساس نے ہچکیاں لینی شروع کردیں' بڑی مشکل سے بولی۔ "نی' میں کرماں ماری' کی کرن جوگی آں؟ مجھے تو اپنی زندگی کے دن تھوڑے نظر آرہے ہیں--- ایک بیوہ بیٹی بچوں سمیت سر پہ بیٹھی ہے' اب اس کی بیوہ کو میں کہاں بٹھاؤں--- بول' یہ کہیں بیٹھنے کے قابل ہے؟--- نہ بہن! میں کسی کی راکھی نہیں کرسکتی۔" وہ شادو کی جانب دیکھتے ہوئے بے زاری سے بولی۔ "روٹی تو رب دے دیتا ہے' پر سر پہ خصم نہ ہو تو گزارہ نہیں ہوتا---"

"تم ٹھیک کہتی ہو ماسی---!" اس نے آخری کوشش کرتے ہوئے مشورہ دیا۔ "تمہارے دیور کا بیٹا کرامتا ابھی کنوارہ ہے' کیا ہوا جو تھوڑا سا جھلا ہے۔ اسے اپنا بیٹا بنالو' شادو تو ہے ہی تمہاری بیٹی---" وہ

آہستہ سے کہہ رہی تھی کہ شادو نہ سن لے۔

"پتر! میرا دماغ کام نہیں کرتا' پتہ نہیں کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں---؟" وہ تخت پہ نڈھال سی لیٹ گئی۔

رات کو تھڑے پہ وہ اپنے بچوں کو سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پٹواری خاوند صحن کی جانب نظریں گاڑے حقہ پی رہا تھا' وہ جانتی تھی کہ وہ کیا سوچ رہا ہے؟ وہ اس کی توجہ ہٹانے کی خاطر بولی۔

"صبح سویرے سویرے ہی واپس جانے کی تیاری کرلو--- بڑے دن ہو گئے ہیں' پیچھے بھینس بیمار ہو گئی ہو گی۔ بچوں کی پڑھائی کا بھی نقصان ہو رہا ہے اور بھرا بھرایا گھر اکیلے چھوڑ کر آئے ہوئے ہیں--- سن رہے ہو؟"

وہ حقہ چھوڑ کر بولا۔ "ہاں' سن رہا ہوں--- میں تو سوچ رہا ہوں کہ بیچاری شادو کا کیا ہو گا' بڑا ظلم ہوا ہے اس کے ساتھ---"

وہ آہستہ سے بتانے لگی۔ "خدا کے آگے کسی کا بس نہیں چلتا۔ جو اس کے نصیب میں تھا' ہو گیا--- میں نے ماسی سے بات کی ہے' اس کے دیور کا بیٹا گرا اسکتا ہے نا---"

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "وہ تو جھلا سودائی ہے' اسے تو اپنا ہوش نہیں---"

"شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گا--- بس' تم صبح تیاری کرو--- عدت پوری ہونے دو' پھر سوچیں گے۔"

وہ بچوں کے پاس لیٹ گئی مگر پٹواری کی آنکھوں میں نیند کہاں تھی' وہ تو اس بغیر کاشت کی زمین کا انتقال ہوس کے کاغذوں میں اندراج کرنے کے جوڑ توڑ کر رہا تھا۔ اس کی بیوی لیٹتے ہی خراٹے بھرنے لگی تو وہ کچھ سوچ کر چلم اٹھا کر نیچے صحن میں آگیا۔ بجھے چولہے سے وہ کسی چنگاری کو تلاش کر رہا تھا کہ اسے شادو نظر آئی۔ وہ چولہے کے پاس پانی کے گھڑے سے پانی لینے اٹھی تھی۔

"شادو' ذرا مجھے بھی پانی دینا۔"

پیالہ واپس کرتے ہوئے اس نے آہستہ سے اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔

"شادو! گھبرانا نہیں' میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ میرے پاس بہت دولت ہے' میں تمہیں رانی بنا کر رکھوں گا۔"

اس نے خاموشی سے ہاتھ چھڑایا' پیالے میں پھر پانی انڈیل کر اس کے آگے کر دیا۔

"بس--- میں نے تیری دید سے اپنی پیاس بجھالی ہے۔" وہ اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

"یہ پانی پینے کے لئے نہیں بھائیا جی! یہ تمہارے ڈوبنے کے لئے ہے' اگر تم میں غیرت اور شرم کی

ایک رتی بھی باقی ہے تو---"

وہ اسے پیالہ تھما کر' بات کا تھپڑ جما کر جا چکی تھی۔

صبح نماز کے بعد لسی اور باسی روٹی' شلجم کی ترکاری کا ناشتہ کرنے کے بعد انھوں نے بھی جانے کی تیاری کرلی۔ شادو اپنی ستی ستی آنکھوں سے ان کو تیار ہوتا دیکھ رہی تھی۔ پٹواری جل سا' چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح' تیز تیز حقے کے کش لگا رہا تھا۔ پھر تانگہ باہر دروازے پہ آلگا۔ بڑی بہن پلو درست کرتی ہوئی اٹھی اور شادو کی ساس کے پاس آئی۔

"اچھا ماسی! سدا اوا تا خدا ہے' اللہ صبر دے--- شادو کو اپنی بیٹی کی طرح سمجھنا اور جو بات میں نے کی تھی اس پہ وچار کرنا۔ شادو کی عدت پوری ہو جائے تو پھر چکر لگاؤں گی---" پھر وہ اس کی نند کی جانب بڑھی۔ "اچھا بہن' صبر کرنا۔"

شادو دہلیز پہ کھڑی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ شادو کے پاس آئی اور اسے چھاتی سے لگا کر بولی۔

"اچھا شادو' جو رب کرے---"

شادو کی آنکھوں کے بند کھل گئے' وہ خوب بھڑاس نکال کر روئی کہ ماں جائی تھی' کون تھا اور؟--- جب خوب رو چکی تو پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔

"کس کے سہارے چھوڑے جا رہی ہو' جانتی ہو کہ میرا یہاں پہلے کون ہمدرد تھا اور اب کون ہے؟ تم تو اپنے گھر راضی باضی ہو' مجھے کس کھڈے میں پھینکا ہوا ہے---" وہ کسی مضروب فاختہ کی مانند پھڑپھڑا رہی اٹھی۔

"صبر کرو' صبر--- جو مقسوموں میں لکھا ہو' وہی ملتا ہے۔ صبر سے عدت کے دن پورے کرو--- دیکھو' رب کیا کرتا ہے؟"

وہ اس کے آنسو پونچھنے لگی۔ پٹواری بھی آنکھیں پٹ پٹا کر دونوں بہنوں کا موازنہ کر رہا تھا۔ پھر شادو اسے باہر دروازے کی دہلیز تک چھوڑنے آئی تو پٹواری نے جیب سے پانچ سو روپے کے نوٹ نکالے اور شادو کے ہاتھ میں تھما کر دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔

"اچھا شادو' یہ رکھ لے--- کوئی فکر نہ کرنا---"

وہ گلی کے موڑ تک تانگے کو دیکھتی رہی اور اس کی نند اس کی مٹھی میں دبے ہوئے نوٹوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ٹوٹے ہوئے قدموں سے واپس دالان کی جانب آئی۔ گھر میں ادھر ادھر کچھ بیکار سی عورتیں جو نوحہ مسر پھسر میں مصروف تھیں' ساس سر پہ دوپٹہ باندھے بدحواس سی پڑی تھی۔ آج اسے گھر کا منظر بڑا عجیب عجیب' اجنبی سا دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ کسی اور گھر میں گھس آئی ہو۔ دروازے سے دالان تک جیسے صدیوں سے محو سفر ہو' ازل سے چلتی آرہی ہو' اس کے پاؤں تلے پل صراط ہو--- سنبھل سنبھل

کر قدم دھرتی ہوئی' ڈولتی ڈولتی دالان تک پہنچ تو گئی پھر جیسے کسی نے مٹی کی بوری دھڑام سے پھینک دی ہو۔ اس کی نند بڑی عجلت سے اس کے پاس پہنچی۔

"نی شادو' کی ہویا تینوں۔۔۔؟" اس نے پانچ سو روپے' اپنے قبضے میں کرتے ہوئے کہا۔ وہ اس کو پانی پلا رہی تھی۔

زمین اپنے محور پر گھوم رہی تھی' وقت کا پرندہ محوِ پرواز تھا۔

★★★

نیچے سے اڑ کر ایک کبوتری اس کے شانے پہ آبیٹھی' شاید وہی ہو جو پچھلی جمعرات اس کے کاندھے پہ بیٹھی تھی۔ وہ اس کے کان کے پاس غوں غوں کر رہی تھی جیسے کوئی پیغام دے رہی ہو یا پھر چوگا مانگ رہی ہو۔۔۔ دانے تو فرش پر بھی بہت ہیں' یقیناً کوئی پیغام دے رہی ہے مگر کبوتروں کی زبان کون سمجھے؟۔۔۔ وہ اسے چوگا کھلانے لگا۔ صبح سے اس وقت تک وہ ادھر ادھر بیسیوں چکر لگا چکا تھا' آتے ہی پہلے سائیں سرکار کا پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ شام کی نماز کے بعد چلہ ختم ہوگا۔ مزار شریف پہ سلام کے بعد وہ حافظ صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔ ان کے لئے وہ گوند اور باداموں والی پنجیری لایا تھا۔ ظہر کی نماز تک ان کے ساتھ رہا پھر دانستہ ان کے پاس سے اٹھ آیا اور آنے جانے والے لوگوں میں شادو کو یوں تلاش کرتا رہا جیسے بھوسے میں سے سوئی تلاش کی جاتی ہے۔ اس کی بے چینی اپنی انتہا کو پہنچ گئی' مختلف خدشات میں گھرا ہوا وہ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر چکر کاٹ رہا تھا۔ آخر تھک ہار کر باہر دروازے کے پاس ایک تھڑے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ لوگوں کے پرے کے پرے آجا رہے تھے مگر شادو کو نہ آنا تھا' نہ آئی۔ مغرب کی نماز ادا کرکے وہ سائیں مولا بخش کے ڈیرے' قبرستان آگیا۔ بے شمار لوگ سائیں سرکار کی زیارت اور برکت حاصل کرنے کی غرض سے جھونپڑے کے باہر موجود تھے' وہ بھی ایک شکستہ سی قبر سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اک موہوم سی امید اب بھی موجود تھی کہ شادو شاید یہاں نظر آجائے۔۔۔ کافی انتظار کے بعد سائیں مولا بخش کی آمد کا اعلان ہوا تو لوگوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ تین چار درویش اندر جا چکے تھے' باہر ایک بڑی سی چارپائی پہ چادر بچھا کر تکیے اور پھول وغیرہ رکھ دیئے گئے۔ لوگ آگے بڑھ کر چارپائی کے پاس پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے' وہ بھی اپنی جگہ سے آگے بڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر جھونپڑے کا دروازہ کھلا۔ پہلے ایک درویش الٹے پاؤں باہر نکلا' اس کے ساتھ ہی سائیں مولا بخش کسی دلہن کی طرح جو مجلہ عروسی سے شرمائی گھبرائی بوجھل قدموں سے باہر لائی جاتی ہے' بھاری سی چادر میں گھونگھٹ نکالے لڑکھڑاتے بوجھل قدموں سے درویشوں کے کاندھوں پہ ہاتھ دھرے چارپائی پر آبراجمان ہوئے۔۔۔ درویش آگے بڑھتے ہوئے لوگوں کو پیچھے ہٹا رہے تھے۔ پھر لوگ باری باری دست بوسی کا شرف حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے' نذر نیازیں پیش کی گئیں۔ سائیں مولا بخش نے اب چادر سر سے سرکالی تھی۔ وہ ہاتھوں کے

اشارے' سر کی جنبش اور دھیمی سی مسکان سے عقیدت مندوں میں مرادیں' برکتیں بانٹ رہے تھے۔ مراد بھی آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اس کی متجسس نگاہیں جس در نایاب کو تلاش کر رہی تھیں' سائیں مولا بخش کی متحرک نگاہیں بھی اسی دانہ زرگون کی تاب یگانہ سے خیرہ ہونے کے لئے بیتاب تھیں۔ شاہ مراد کو جلد ہی باریاب ہونے کا موقع مل گیا۔ سائیں مولا بخش نے خلاف توقع بڑی شفقت سے اس کی پذیرائی کی۔ دست بوسی اور سلام کے بعد وہ بڑے ادب سے چارپائی کے پاس دائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ سائیں مولا بخش نے اسے نظروں سے تولتے ہوئے پوچھا۔

"شاہ جوان' کیسے ہو؟۔۔۔ میں نے تمہارے لئے خاص طور پر دھیان کیا ہے' تمہارے ستارے بڑی سخت گردش میں ہیں۔۔۔ تمہیں مراد ملے گی' تمہارے نصیبوں کی لڑی یہاں نہیں کہیں اور' دور کہیں جڑی ہوئی ہے۔۔۔ رب مہربانی کرے گا' میرے پاس آتے رہو۔۔۔ حق اللہ' سچ اللہ۔۔۔"

شاہ مراد اس کا اشارہ کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے صرف "جی" کہنے پر ہی اکتفا کر سکا۔

اب سائیں مولا بخش دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ تھا مگر وہ مراد کے صرف "جی" کہنے سے مطمئن نہیں ہوا تھا' اصل میں تو وہ اس سے اس کے ارادوں کے متعلق کچھ سن گن حاصل کرنا چاہتا تھا' یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ شادو اسے دوبارہ ملی ہے یا نہیں اور یہاں آج آئی ہے یا نہیں؟۔۔۔ اسی دوران متراں والی کی ایک بوڑھی عورت پانی کی بوتل لئے آگے بڑھی' کانپتے ہاتھوں اور لرزتے لہجے میں اس نے شادو کی ساس کا پیغام دیا کہ اس کا بیٹا اللہ کو پیارا ہو گیا ہے' اس کے حق میں دعا کریں اور قبر پہ چھڑکنے کے لئے پانی دم کردیں۔ اس نے بوتل آگے بڑھا دی۔۔۔ سائیں مولا بخش ایک لمحہ کے لئے تو سکتے میں آگیا' یہی عالم پاس کھڑے شاہ مراد کا تھا۔

"ہاں' میں جانتا ہوں مائی! اس کی معیاد ختم ہو چکی تھی۔ اب کوئی تو ڑ نہیں ہو سکتا تھا۔ تعویذ اپنا کام کر چکے ہیں۔۔۔" اس نے جلدی سے بوتل پر پھونک مار کر ہاتھ دعا کے لئے اٹھا دیئے اور دعا کے بعد بوڑھی مائی سے کہنے لگا۔ "اس کی ماں کو کہنا کہ مجھے آکر ملے۔ میں تعویذوں کے باقی اثرات دور کرنے کے لئے کچھ تعویذ دوں گا۔۔۔ اور ہاں' اس کی بہو شادو کا کیا حال ہے؟"

بوڑھی عورت روہانسی سی کہنے لگی۔ "سائیں جی' اس کرماں ماری کا کیا حال ہونا ہے' وہ زندوں میں اور نہ مردوں میں۔۔۔ چپ سی لگی ہے۔ بے چاری کچھ بولتی چالتی نہیں۔۔۔ آگا نہ پیچھا' سیاں سڑی۔۔۔" وہ رونے لگی۔

جو چاہتا تھا' اگلوا کر وہ سر جھکائے مراقبے میں چلا گیا۔ بوڑھی مائی کو ملنگوں نے وہاں سے ہٹا دیا۔ بوڑھی مائی کے ہٹتے ہی شاہ مراد بھی پیچھے کھسک گیا۔ وہ مائی بوتل تھامے پیچھے قبروں کے پاس عورتوں کے جھرمٹ میں بیٹھ گئی جو اپنی باری کے انتظار میں تھیں۔ مراد اس بوڑھی مائی کے پاس جا بیٹھا' بات چلاتے

ہوئے اس نے پوچھا۔

"ماں جی! وہ بچارا تو پچھلی جمعرات یہاں آیا تھا۔۔۔۔ کس دن وہ فوت ہوا؟"

"وے پتر! طبیعت تو اس کی یہاں ہی بہت خراب تھی۔ پنڈ پہنچ کر آدھی رات کے بعد دم مسافر ہوگیا' جمعہ کی نماز پر جنازہ بھی ہوگیا۔ بڑا مبارک دن ملیا اس مرنے والے کو۔۔۔"

وہ ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولا۔ "بڑا افسوس اے مائی جی' اوہدی موت دا۔۔۔ کیا نام تھا اس کا ماں جی؟"

"وے تم اس کا نام نہیں جانتے؟۔۔۔ اس کا نام فضل' اس کا باپ حاکم دین' میری پھوپھی دا پتر۔۔۔ بڑا جوان تے بیبا بندہ تھا' پورے متراں والی میں اس جیسا سوہنا تے نیک کوئی نہیں تھا۔ وہ بے چارہ بھی جوانی میں مارا گیا تھا۔۔۔"

ایسے میں کوئی معتقد چاولوں کی دیگ بانٹنے کے لئے آیا تو سب لوگ اس کے گرد ہوگئے۔ سائیں مولا بخش کے آگے سے بھیڑ ذرا چھٹی تو اس نے دیکھا کہ سائیں جی ابھی تک سر ڈالے مراقبے میں غرق تھے۔۔۔ شادو کے خاوند کے مرنے سے واقع ہونے والی تبدیلیوں پر وہ غور کرنے لگا۔ وہ چشم تصور سے دیکھ رہا تھا کہ شادو پہ کیا بیتی ہے؟ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اور خستہ حالی اس کے سامنے تھی اور عدت کی مدت پوری ہونے تک وہ کیسے کیسے جاں گسل مراحل سے گزرے گی۔۔۔ کاش! وہ اس کی مدد کرسکتا' اسے دلاسہ دے سکتا۔

عشاء کی اذان ہو رہی تھی' لوگ بھی کھا پی کر ہاتھ پونچھتے ہوئے مسجد کی جانب بڑھنے لگے تو وہ بھی اپنے خیالات کی کھچڑی پکاتا ہوا مسجد کی جانب بڑھ گیا۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ حافظ صاحب کو لے کر بیٹھ گیا اور شادو کے بیوہ ہونے کا تذکرہ شروع کردیا۔

"جوان۔۔۔!" وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولے۔ "اللہ بے نیاز ہے' وہ بہتر کرنے والا ہے۔ انسان بے صبرا اور بے خبرا ہے۔۔۔"

"حافظ جی! میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔۔۔" وہ قدرے ہچکچا رہا تھا۔ "میں محسوس کر رہا ہوں کہ جیسے اسے میری مدد کی اشد ضرورت ہے۔"

"صبر کرو جوان! صبر بڑی اچھی چیز ہے۔ وہ ابھی عدت میں ہے۔ پھر ان لوگوں سے تمہارا کوئی رشتہ ناتہ تو ہے نہیں۔۔۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ تم سرکاری ملازم ہو لہٰذا کوئی جذباتی فیصلہ فی الحال تمہارے اور اس کے حق میں بہتر نہ ہوگا۔" وہ کچھ دیر خاموشی اختیار کرنے کے بعد بولے۔ "مراد! تم اپنا اور اس کا معاملہ اس پر چھوڑ دو۔۔۔" انہوں نے شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی۔

"جی بہت بہتر حافظ صاحب!۔۔۔ شادو کے لئے دعائیں فرمائیں کہ اللہ اسے ہر بلا سے محفوظ رکھے' بیچاری بڑی دکھی ہے۔"

"مجھے تو تم اس سے زیادہ دکھی دکھائی دیتے ہو۔۔۔" وہ ہلکے سے مسکرا دیئے تو وہ بھی سر جھکا کر رہ گیا۔

☆☆☆

رات ہجر کی ہو یا وصال کی' آخر گزر ہی جاتی ہے اور وقت اوکھا ہو یا سوکھا' کٹ ہی جاتا ہے۔ یہی وقت بڑے بڑے امڈتے ہوئے طوفانوں کو شانت بھی کردیتا ہے' بڑے بڑے گہرے زخموں کو مندمل بھی کر دیتا ہے۔ قدرت کے بنائے ہوئے یہ اصول انسانیت کے لئے سہولتیں' امیدیں' توازن اور صبر و برداشت کی قوتیں بیدار کرتے ہیں۔۔۔ وقت کا پرندہ ذرا دم لینے کی خاطر منڈیر پہ آ بیٹھا تھا۔۔۔ شادو کی عدت پوری ہوگئی تھی اور ان تین چار مہینوں میں بے شمار تبدیلیاں ظہور پذیر ہوچکی تھیں۔ شادو کی ساس کئی مرتبہ مرتے مرتے بچی' نند کے ایک دو رشتے نزدیک پار کے گاؤں سے آچکے تھے۔ بھینس نے ایک کٹی کو جنم دیا تھا۔ شادو کا بہنوئی ایک دو چکر اکیلے ہی کاٹ چکا تھا۔ جھلے کرامتے کی ماں بڑی مہربان ہوگئی تھی اور اس کی بہن تو شادو کی پکی سہیلی بن چکی تھی۔ آج بھی کرامتے جھلے کی ماں شادو کے پاس بیٹھی میٹھی میٹھی نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی اپنے بیٹے کی تعریفیں کر رہی تھی کہ وہ تو اب بڑا ہی سیانا اور کاما ہوگیا ہے' صاف ستھرے کپڑے پہن کر خوشبو بھی لگاتا ہے اور شادی کے بعد تو بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ اس نے قریب قریب اس کی ساس کو یہ کہہ کر راضی کرلیا تھا کہ دیکھو' بہن! گھر میں پہلے ہی بیوہ بیٹی بیٹھی ہے' اوپر سے اسے بھی بٹھالو گی تو کھلاؤ گی کہاں سے؟ زمانہ بڑا خراب ہے تم بوڑھی کہاں تک ان کی راکھی کرو گی؟۔۔۔ اپنا کرامتا پتر ذرا سادہ ہے' پاگل یا جھلا نہیں۔ تیری خدمت ہی کرے گا اور گھر کی بات گھر ہی میں رہے گی۔۔۔ شادو یہ سب کچھ خاموشی سے سنتی رہتی' منہ سے کچھ نہ کہتی۔ اس کی مسلسل خاموشی کو وہ نیم رضامندی سمجھ رہے تھے۔ آخر ایک دن اس کی ساس نے کہہ ہی دیا کہ شادو سے پوچھ لو' میں آج مری کل دوسرا دن۔۔۔ اس روز شادو کی بڑی بہن' پٹواری بہنوئی اور بچے شام کی نماز سے پہلے ہی آچکے تھے۔ اب وہ سب کھانا کھا رہے تھے۔ کرامتے جھلے کی ماں اور بہن آج کھانا اپنے گھر سے پکا کر لائی تھیں' دونوں بڑھ بڑھ کر بڑی گرمجوشی سے ان کی آؤ بھگت کر رہی تھیں۔ شادو نے بھی آج ذرا ڈھنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے' کئی مہینوں کے بعد آج ذرا رنگ روپ نکھرا تھا۔ پیلے رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس شام کے جھٹپٹے میں وہ کسی مندر کی دیوداسی دکھائی دے رہی تھی۔ پھر کھانے سے فراغت پا کر باتیں شروع ہوگئیں مرنے والوں کی' جینے والوں کی اور ان کی بھی جو نہ مردوں میں نہ جینوں میں تھے۔ کرامتے جھلے کی ماں کی خواہش تو سب کے سامنے واضح ہوچکی تھی لیکن کھل کر بات کرنے کا موقع شاید ابھی نہیں آیا تھا۔ پٹواری بھی حقہ سنبھالے الگ چارپائی پہ بیٹھا اپنے کسی شیطانی منصوبے کی جز بندی میں مگن تھا۔

پہلا کنکر کرامتے جھلے کی ماں نے پھینکا اور مرنے والی کی بوڑھی ماں کے بولے کان پہ جا لگا۔

"دیکھو نا' ماسی! مرنے والوں کے ساتھ مرا تو نہیں جاتا۔ اللہ صبر دینے والا ہے۔۔۔ جیسے شادو تیری دھی ویسے ہی میری' کرامتا بڑا تابعدار پتر اے۔ تیری خدمت کرے گا' بس میری جھولی میں خیر ڈال دے۔" پھر وہ پٹواری کی جانب مڑی جو اس کی بات سن کر چلم میں دبی کسی چنگاری کو پھونکیں مار رہا تھا۔ "پٹواری جی! رب کا دیا سب کچھ موجود ہے اور میرا کیا ہے' آج مری کل دوجا دن۔۔۔ سب کچھ انہی کا ہی ہے۔"

شادو کی بہن بولی۔ "ماسی! ابھی تو ہمارے اتھرو بھی نہیں سوکھے' سوچ کر جواب دیں گے۔۔۔ اس کی عمر گھر بٹھانے کی نہیں ہے' کہیں نہ کہیں تو اس کا سر ڈھانپنا ہی ہے۔"

پٹواری بھی بولا۔ "ابھی تو ہم شادو کو اپنے ساتھ لے کر جا رہے ہیں۔ ذرا آب و ہوا تبدیل ہو جائے گی' اس کا دل بھی بہل جائے گا۔"

"ہاں ماسی' ہم مشورہ کر کے آپ کو جواب دیں گے۔۔۔" اس کی بہن شادو کی ساس کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

اگلے روز سویرے سویرے شادو اپنے میکے روانہ ہو گئی۔۔۔ یعنی کھائی سے نکل کر کھڈے میں جا گری۔ شادو کی ساس' نند نے بڑی رکھائی سے اس کو روانہ کیا اور نند نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ اب آپ ہی اس کے والی وارث ہیں۔ ہمارے پاس تو اپنے تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا جتی نہیں تو اس کا سر ڈھانپنے کے لئے کہاں سے لائیں گے۔۔۔ ہمارا کون سا کمانے والا اور اس کی راکھی کرنے والا ہے؟

ظہر کی نماز سے بہت پہلے شادو اپنی بہن کے سسرالی گاؤں کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس کے بہنوئی پٹواری نے اشارے سے اپنے کھیت اور زمین دکھائی جس کا وہ مالک تھا۔ وہ قدم قدم پر اپنی خوشحالی' عزت' مرتبے کا احساس دلا رہا تھا اور دلجوئی' ہمدردی میں بھی پیش پیش تھا۔ صبح سے اس وقت تک اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جو شادو کو دیکھتے ہی اس سے سرزد ہو جاتی تھی۔ اس کا رویہ شادو کے لئے ناقابل فہم قطعی نہیں تھا' وہ خوب جانتی تھی کہ یہ سانپ موقع پاتے ہی ضرور ڈنک مارے گا۔ وہ اس کی بدفطرت سے خوب واقف تھی۔ آج وہ ایک معصوم بکری کی طرح ہنکی ہوئی ساتھ چلی آئی اور جاتی بھی کہاں؟ یہ جیسے بھی تھے' اپنے تو تھے لیکن وہ اپنی حفاظت کا پختہ تہیہ کر چکی تھی۔ ہچکولے کھاتے ہوئے تانگے میں جیسے وہ کسی شکستہ کشتی پر بے دست و پا طوفانی لہروں کے رحم و کرم پر ہو۔۔۔ دور کہیں اسے ساحل مراد تو نظر آ رہا تھا لیکن کون جانے وہ صحیح سلامت وہاں تک پہنچ پاتی ہے یا نہیں؟۔۔۔ ایک کبوتر عین اس کے سر کے اوپر سے پھڑپھڑاتا ہوا گزر گیا تو اسے بچپن کا سنا ہوا گانا "واسطہ ای رب دا توں جاویں وے کبوترا" یاد آ گیا۔ وہ دور تک کبوتر کو تکتی رہی اور اڑتی ہوئی دھول' ٹاہلیوں کے جھنڈ نے یہ نظارہ بھی

چھین لیا۔ جوہڑ کے آگے پیپل کے نیچے تانگہ رک گیا۔ ننگے دیہاتی بچوں اور چند بوڑھی عورتوں نے ان کا استقبال کیا' دیکھتے ہی عورتوں نے منہ بسورنا شروع کر دیا۔ آس پاس سے چند بوڑھے' جوان بھی آ گئے جنہوں نے وہیں پہ اظہار افسوس شروع کر دیا۔۔۔ آج وہ دوسری بار اس گاؤں آئی تھی۔ پہلی دفعہ وہ بہن کی شادی پہ ڈولی کے ساتھ آئی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس رات خدا نے اس کی عزت بچائی تھی ورنہ یہ خبیث اس کو دلہن بنانے پہ تل گیا تھا۔ دوسری بار اپنی بہن کے پہلے بچے کے چھلے پہ آئی اور اس موقع بھی اس نے اسے شیشے میں اتارنے کی ہر ممکن کوشش کی' اللہ نے اس بار بھی اس کی حفاظت فرمائی۔ آج پھر وہ اس کے رحم و کرم پر تھی لیکن اسے یقین تھا کہ ہر مرتبہ اس کی حفاظت کرنے والا اس کا سوہنا رب اب بھی اس کی حفاظت کرے گا۔۔۔ گھر پہنچتے پہنچتے پورے گاؤں کو خبر ہو چکی تھی۔ پٹواری مردوں کے ساتھ بیٹھک میں جا بیٹھا' عورتیں شادو کے گرد ہو گئیں اور شام بلکہ رات تک عورتوں مردوں کا آنا جانا لگا رہا۔ پرتکلف کھانا پٹواری کے ایک گرد اور دوست کے گھر سے آ گیا۔ رات شادو اپنی بہن اور بچوں کے کمرے میں سوئی' پٹواری حقہ لے کر دیر تک مردوں کے ساتھ گپیں ہانکتا رہا اور پھر وہیں بیٹھک میں سو گیا۔ پھر آنے والے دن اور اس کے بعد آنے والے تین چار ہفتوں تک پٹواری کا رویہ بڑا خوشگوار اور ہمدردانہ رہا جیسے وہ انسان بن گیا ہو۔ اس دوران اس نے بھولے سے بھی کوئی ایسی حرکت نہ کی جس پر کسی کو اعتراض ہو۔ شادو' آہستہ آہستہ اپنے آپ کو محفوظ اور پرسکون محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کی بہن بھی اب اپنے مرد کی فطرت سے واقف ہونے کے باوجود مطمئن تھی اور اب وہ چاہ رہی تھی کہ شادو کی آئندہ زندگی کے بارے میں جلد کوئی فیصلہ ہو جائے۔۔۔ کبھی کبھی اپنے خاوند کی ضرورت سے زیادہ ہمدردیوں اور بدلے ہوئے طور طریقوں سے وہ خوفزدہ بھی ہو جاتی' عورت تھی اور اپنے خاوند کو جانتی تھی کہ وہ شروع سے ہی شادو میں دلچسپی لیتا ہے۔ بہن کی عزت کی خاطر وہ دن رات' کسی لمحہ بھی اسے اپنے سے علیحدہ نہ کرتی۔ پھر آخر ایک دن اس نے بات چھیڑ دی۔

"میری بہن کے لئے کوئی فیصلہ کرو' نا! جوان جہان گھر میں بڑی اچھی نہیں لگتی۔ ماسی حشمت بھی ایک دو بار اپنے بھتیجے سردارے کے لئے اشارے دے چکی ہے اور پھجے مشین والے کی بہو اپنے بھائی کے لئے کہہ رہی تھی' وہ لڑکا فوج میں ہے۔۔۔ ادھر حتراں والی' والے بھی رشتہ مانگ رہے ہیں۔ وہ لڑکا تمہیں پسند ہو تو بات پکی کر دو۔۔۔ میرا خیال ہے کہ ماسی حشمت والا رشتہ اچھا ہے۔ لڑکا ڈرائیور ہے اور نیک بھی۔۔۔"

پٹواری جو پہلے بڑے خوشگوار موڈ میں تھا' یہ باتیں سن کر سنجیدہ ہو گیا اور ناچار بولا۔ "ابھی تو اس بے چاری میں سانس ست بھی نہیں آیا۔۔۔ دیکھتی نہیں' ہر وقت اداس اداس رہتی ہے۔ پہلے اس کے پلے تم سب نے کسی باندھ دیا تھا جو اس کی جوتیوں میں بھی بیٹھنے کے قابل نہ تھا۔ حشر دیکھ لیا۔۔۔ کیا اب

سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھائیں گے۔ متراں والی کے رشتے کو تو گولی مارو' شادو کے لئے وہ پاگل ہی رہ گیا ہے کہ سارا دن اس کی رالیں پونچھتی پھرے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے بھی ایک دو لوگوں نے کہہ رکھا ہے' سمجھ سوچ اور دیکھ بھال کر فیصلہ کریں گے۔"

اسے باہر نکلتے دیکھ کر شادو بہن کے پاس آ بیٹھی۔

"کیا بات ہو رہی تھی' باجی؟"

"تم نے کوئی بات سنی---؟" بہن نے شادو کو میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس میں نے تو ایک دو بار اپنا نام سنا ہے---" وہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔ "بہن! میں کہیں آپ پہ بھاری تو نہیں ہو گئی---؟"

"نہیں شادو! بہنیں بھی کبھی بہنوں کے لئے بوجھ ہوتی ہیں؟--- مگر یہ بوجھ نہ ہوتے ہوئے بھی زیادہ دیر کندھوں پر نہیں اٹھایا جا سکتا' لڑکیاں اپنے گھر ہی اچھی لگتی ہیں--- میں ویسے ہی تمہارے بھائی جان سے بات کر رہی تھی کہ شادو کے لئے ایک دو رشتے آئے ہیں۔ متراں والی کا رشتہ تو انہیں پسند نہیں' وہ کہہ رہے تھے کہ ہم اپنی شادو کو بہت دیکھ بھال کر کسی اچھی جگہ بیاہیں گے۔ ہاں کھان دیکھیں گے' گھر بوہا دیکھ' تسلی کر کے شادو کی شادی کریں گے بلکہ ایک دو رشتے ان کی نظر میں بھی ہیں---" وہ ہاتھ لہرا کر بولی۔

شادو سر جھکائے ہوئے آنسو بہا رہی تھی' وہ خاموش تھی۔

"کیا بات ہے' رو کیوں رہی ہے؟--- قسمت کوئی خود نہیں بناتا' لکھنے والے نے جو لکھ دیا اسی پہ صبر جبر کرنا پڑتا ہے۔"

"باجی! تم میری بڑی بہن اور ماں کی جگہ بھی ہو' اور کون ہے ہمارا--- ایک بھائی تھا۔ اس کی خبر نہیں اور نہ ہی اسے ہمارا خیال--- میں کس سے اپنے دل کا حال کہوں؟"

"مجھ سے کہہ' میں تیری بہن ہوں۔ ہم تیری خوشی اور بھلا چاہتے ہیں---" وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔

"باجی! اگر میری خوشی اور بھلا چاہتی ہو تو میری مرضی کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھانا اور نہ ہی کہیں میرا رشتہ پکا کرنا' نہیں تو میں زہر کھا لوں گی---"

"ہائے نی شادو' زہر کھائیں تیرے دشمن جو تجھے دیکھ نہ سکیں--- بتا' کہیں تیری مرضی ہے تو ہم وہیں کر دیں گے' ہمیں تو تیری خوشی اور آبادی سے مطلب ہے---"

"باجی! ابھی میں کچھ نہیں کر سکتی--- درگاہ شریف کے سائیں سرکار نے مجھے کہا تھا کہ تجھے تیری مراد ضرور ملے گی' سات جمعرات وہاں جانا پڑے گا۔ وہ میرے لئے چلہ کاٹیں گے--- مجھے لے چلو ان

کے پاس' میں نے وہاں سلام بھی کرنا ہے۔ مجھے سات جمعراتیں وہاں حاضری دے لینے دو پھر کوئی فیصلہ کرنا---" وہ اس کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے' ہمیں بھی کون سی جلدی ہے۔ اس جمعرات کو وہاں چلیں گے' میں نے بھی ختم درود کرانا ہے اور تمہارے بھائی پٹواری کے لئے منت بھی چڑھانی ہے--- رب دا شکر ہے کہ وہ بھی اب گھر بار کا خیال رکھنے لگے ہیں' کہہ رہے تھے کہ میں اب نماز بھی شروع کرنے والا ہوں---"

***

نماز ختم ہو چکی تھی' شاہ مراد بیٹھا دعا مانگ رہا تھا--- کیا مانگ رہا تھا' وہ یا اس کا قاضی الحاجات جانتا تھا مگر اس کے سنگی ساتھی صرف یہ جانتے تھے کہ شاہ مراد اب پہلے والا نٹ کھٹ' بات بات پہ قہقہے لگانے والا' نور جہاں کے گانے سننے والا' کبڈی کھیلنے والا شاہ مراد نہیں رہا۔ پنج وقتہ نمازی' چھوٹی سی خوبصورت داڑھی' تسبیح پڑھتا ہوا' آہوں بھری دعائیں مانگنے والا اب جانے کیا چاہتا ہے اور کوئی کہتا کہ جن قابو کرنے کے لئے وظیفہ کرتا ہے۔ وہ سب کی باتیں پھیکی سی ہنسی سے سنی ان سنی کر دیتا لیکن اپنے من کا بھید کسی کو نہ دیتا۔

اتفاق سے آج بھی جمعرات تھی۔ وہ طویل جان توڑ مشقتوں کو مکمل کر کے آج ہی بہاولپور سے واپس اپنی کمپنی میں آیا تھا اور یہ پانچ چھ مہینے جیسے کئی صدیوں پہ پھیل گئے تھے۔ اسے اپنے ارد گرد ہر چیز بدلی بدلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس عرصہ کے درمیان وہ دس دن کی چھٹیاں اپنے گھر بھی گزار آیا تھا اور وہاں بھی معمول کے خلاف وہ چپ چپ ہی رہا۔ اس کی ماں جی اور بڑی بھابی نے اس کی اداسی کو جاننے کی بڑی کوشش کی' مختلف طریقوں سے اسے ٹٹولا بھی اور اس کی شادی کا تذکرہ بھی چھیڑا۔ اسی گاؤں میں اس کے ماموں کی ایک خوبصورت سی لڑکی تھی' منگنی وغیرہ تو نہیں ہوئی تھی لیکن اس کی ماں کا ارادہ وہیں شادی کرنے کا تھا۔ اس کی ماں نے باتوں باتوں میں اس کی بات پکی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر اس نے بڑی نرمی سے ماں کو سمجھا دیا کہ وہ ابھی شادی نہیں کرے گا۔ ماں کے مزید کریدنے پہ اس نے کم و بیش ساری رام کہانی سنا دی اور زور اس بات کی جانب تھا کہ کسی مظلوم' بے بس کی داد رسی کرنا ثواب ہے اور ایسا کرنے کے لئے اسے اشارے بھی مل چکے تھے۔ ماموں کی لڑکی کو اچھے سے اچھے رشتے مل جائیں گے مگر شادو کو مضبوطی اور عزت سے تھامنے والا ہاتھ اور کہیں نہیں ملے گا--- سیدھے سادھے فوجی نے بغیر لگی لپٹی کے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ماں بھی پیروں فقیروں کو ماننے والی تھی' کیسے انکار کی جرات کرتی اور ویسے بھی ان کے قبیلے کے مرد بیل' انتقام اور عورت کے معاملے میں بڑے اکھڑ اور انتہا پسند واقع ہوئے تھے۔ بدلہ ضرور لیتے' چاہے اس کے لئے سات اور قتل کروانے پڑیں۔ من پسند عورت حاصل کرنے کے لئے آگ اور خون کا دریا بھی پار کر جاتے اور اچھے خوبصورت بیلوں کے لئے تو وہ اپنی جان اور سو قیمت تک کر دی

رکھنے کا گر وہ رکھتے تھے۔ ماں کو بھی یاد آیا کہ اس کے باپ نے اسے حاصل کرنے کے لئے کتنے سر کھولے تھے بلکہ نکاح کے روز بھی اس کے زخموں سے خون رس رہا تھا۔۔۔ اس نے کہا۔

"اچھا پتر! سوہنے رب دی مرضی' پتر دی مرضی' او ہو ماں دی مرضی۔۔۔ رب سوہنیاں کرے۔"

بوڑھی ماں نے دعا دی اور ستو' شہد' گڑ' گھی اور ماں کی دعاؤں سے بھری ہوئی گٹھڑی اٹھائے وہ واپس آگیا۔۔۔ وہ شہد اور ستو حافظ صاحب کے لئے لایا تھا۔ سائیں مولا بخش کے لئے گھی لایا اور جب تک یہاں رہا' برابر حاضری دیتا رہا۔ سائیں جی نے ایک چلہ خاص طور پر اس کے لئے کھینچا مگر بقول ان کے' اس کے ستاروں اور سنجوگ ریکھاؤں کا رخ پچھم کھائی کی سنگت' ندی کے درے' کھدرے کھدرے کھلیانوں کی بیچ ایک چھوٹے سے گھر کے آنگن میں کھڑی ایک سندر کنیا کی طرف ہے۔ شاہ مراد نے گھی اور نذرانہ پیش کر کے ایک اور چلے کی درخواست کی کہ کسی طرح اس کی سنجوگ ریکھاؤں کا رخ شورکوٹ سے سیالکوٹ کی جانب پھیر دیا جائے۔ اللہ والوں کے لئے کیا مشکل ہے۔۔۔؟

سائیں مولا بخش اور شاہ مراد' دونوں ہی شادو کی عدت کی مدت پوری ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ کوئی چلوں کی چکوں کے پیچھے چیخیں مار رہا تھا تو کوئی مشتوں کی مشقت سے من مارنے میں مشغول تھا۔ ایک شعلہ تھا اور ایک شبنم' ایک رام تھا اور دو جا راون' ایک رستہ تھا تو دوسرا رکاوٹ' ایک سنت تو دوسرا سقم۔۔۔ عدت پوری ہونے پہ دونوں ہی ایک دوجے سے حالات کی سن گن لینے کے لئے بے چین تھے کہ براہ راست دونوں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ایک کو اپنی دوکانداری اور ظاہری بھرم و بھروسے کا احساس تھا تو دوسرے کو اپنی شرافت اور سرکاری نوکری کا پاس تھا' دونوں ایک دوسرے کی شدت اور ہمت کا تقابلی موازنہ کرنے پر مجبور تھے۔ اس دوران سائیں مولا بخش کے طور اطوار' معمولات اور مزاج میں نمایاں تبدیلیاں آچکی تھیں۔ وہ اکثر مراقبے میں گم رہتا' طبیعت زیادہ زور مارتی تو چلے کی چادر اوڑھ کر مدہوش پڑا رہتا۔ اس نے اپنے کار خرابات کی بیشتر ذمہ داریاں دوسرے کارندوں کے کندھوں پر ڈال دی تھیں۔ روز مرہ کے ملنے جلنے والے اب پہروں اسی کے منتظر رہتے' چہرہ سوچ اور سنجیدگی کے ہلکے ہلکے غبار سے اٹا رہتا۔

شاہ مراد نہا دھو کر درگاہ شریف حاضری کے لئے تیار ہو چکا تو تین چار اور ساتھیوں نے بھی چلنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ جلد سے جلد یہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ مشتوں کے بعد پانچ چھ روز کی ریلیز بھی مل چکی تھی لیکن ابھی وہ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ یہاں رہے گا یا گھر ہی جائے گا؟۔۔۔ ظہر کی اذان انہیں باہر دروازے پر سنائی دی' دروازہ میں داخل ہوتے ہی سائیں مولا بخش کی زیارت ہو گئی۔ وہ والہانہ انداز سے سلام اور دست بوسی کے لئے آگے بڑھا تو "حق مولا' سچ مولا!" کے نعرے نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے اپنا دست شفقت اس کے سر پر رکھا۔

"کیسے ہو مراد۔۔۔؟"

"آپ کی دعا' برکت ہے سرکار۔۔۔!" وہ مودب کھڑا ہو گیا۔

"بچہ' بہت دنوں سے دیکھا نہیں۔۔۔ کہاں تھے؟"

"سرکار! سرکاری بندہ ہوں' مشقوں پہ بہاولپور گیا ہوا تھا۔ آج ہی واپس لوٹا ہوں اور آتے ہی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں۔"

"اللہ بھلی کرے' جاؤ نماز پڑھو۔۔۔ اور ہاں' نماز کے بعد سورہ یوسف کی تلاوت کیا کرو۔۔۔"

"جو حکم سرکار۔۔۔!"

سلام کر کے وہ مسجد کی جانب چل دیا۔ نماز کے بعد وہ حافظ صاحب سے باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن انہیں کچھ لوگوں کے ساتھ کسی گہری بات چیت میں مصروف پا کر وہ قرآن شریف کھول کر تلاوت میں مشغول ہو گیا۔ تلاوت کے بعد بھی حافظ صاحب ان ہی لوگوں سے گفتگو کر رہے تھے۔ انہیں سلام کئے بغیر وہ باہر نکل آیا۔ اندر کافی بھیڑ تھی' فاتحہ پڑھ کر وہیں کھڑا ہو گیا جس جگہ شادو نے اس کی ہتھیلی پہ ڈوری رکھی تھی۔ گزری ہوئی ساعتوں کی خوشبو وہ اب بھی اپنے آس پاس محسوس کر رہا تھا۔ آنکھیں بند کئے دیر تک من مندر میں یادوں کی گھنٹیاں بجاتا رہا' دونوں ڈوریاں اب بھی اس کی نیم وا ہتھیلی پہ دھری تھیں اور وہ سرخ ڈوری والی کی من موہنی صورت دیکھنے کے لئے ترس رہا تھا۔ اس کے حالات جاننے کے لئے بے چین تھا کہ اس پہ کیا گزری' وہ کہاں ہے' کیسی ہے؟۔۔۔ کئی سوالوں کی ڈوریاں سانپوں کی مانند اس کے ذہن میں کلبلا رہی تھیں لیکن کسی بات کا کوئی جواب اسے نہیں مل رہا تھا۔۔۔ کس سے پوچھے' کہاں جائے؟۔۔۔ اس نے آنکھیں کھول لیں۔ ارد گرد بے شمار لوگ تھے۔ وہ باہر نکل کر کبوتروں کے چھوترے پہ آگیا۔ حسب سابق ایک کبوتری اس کے کاندھے پہ آ گئی۔۔۔ شاید یہ بے زبان ہی اس بے بس کا پتہ بتا دے' شاید یہاں وہ بچہ ہی مل جائے جو پہلے دن اس کو بلانے آیا تھا' وہ بوڑھی مائی مل جائے جس نے اس کے گاؤں کا نام بتایا تھا۔۔۔ سودائیوں کی طرح وہ چہرے تکتا ہوا ادھر سے ادھر گھوم رہا تھا۔ مایوسی کے اس عالم میں سائیں مولا بخش کی وہ بات بھی یاد آ گئی کہ تمہاری سنجوگ ریکھا کا رخ ادھر پچھم کی جانب ہے۔۔۔ تھک ہار کر وہ برآمدے میں ٹھنڈے فرش پر ڈھیر ہو گیا اور خالی خالی نظروں سے گنبد کی جانب دیکھنے لگا۔ ایک دیہاتی بزرگ بھی ستانے کی غرض سے قریب ہی بیٹھ کر اپنے صافے سے چہرہ پونچھنے لگے۔

"بڑی بھیڑ ہے پتر۔۔۔" انہوں نے اپنا صافہ جھولی میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں' آج جمعرات ہے نا!۔۔۔ آپ کس گاؤں میں رہتے ہیں؟" اس نے یونہی بات بڑھانے کے لئے پوچھ لیا۔

"پتر! میرے پنڈ کا نام دھیرو والی ہے۔ یہاں سے ادھر دس میل دور۔۔۔ تم کس پنڈ کے ہو "کاکا"؟"

"جی! میں فوجی ہوں اور پنڈ میرا سرگودھے کے پاس ہے' ایک چک میں۔۔۔"

"شاوا' بھئی شاوا' بڑا اچھا علاقہ ہے۔ زمینیں بڑی خاص ہوتی ہیں۔۔۔ نہری پانی تے تن تن چار چار فصلیں' واہ بھئی واہ۔۔۔"

"بابا جی! متراں والی کتھے وے۔۔۔؟"

"متراں والی۔۔۔ اوہو' ہمارے پنڈ سے کوئی دو میل دور اے۔۔۔"

"بزرگو! وہاں کوئی بس یا تانگہ۔۔۔؟"

"پتر! چھاؤنی دی پکی پلی تک تو پکی سڑک اے' آگے کچی سڑک تے تانگے مل جاندے نے' تو پنڈ پہنچا دیتے ہیں۔۔۔ کیوں توں جانا اے اوتھے۔۔۔؟"

"نہیں بابا جی! میں ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔۔۔ آج سے کوئی پانچ چھ مہینے پہلے وہاں کا ایک آدمی یہاں لایا گیا تھا' بڑا بیمار اور لاچار تھا۔۔۔ سنا تھا کہ وہ نشہ کرتا تھا' بے چارہ دوسرے دن مر گیا۔۔۔ بڑا افسوس ہوا تھا۔"

"ہاں' یاد اے۔۔۔ او فضلا' نشے نے ہی اس کو مار دیا۔ نشہ بڑی بری شے اے' رب بچائی رکھے' اس کا باپ بھی وچارہ جوانی میں مر گیا تھا۔ میرا یار تھا اس کا باپ' اللہ بخشے۔۔۔"

"اس کا کوئی دھی پتر تو ہوگا؟" وہ مزید ٹوہ لیتے ہوئے بولا۔

"نہیں' نشے نے اس کو اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ جو کوئی دھی پتر ہوتا۔۔۔"

"بابا جی۔۔۔!" وہ اور قریب ہوتے ہوئے بولا۔ "اس کی بیوی تو بیچاری جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی۔۔۔ مرنے والا تو مر کر چھوٹ جاتا ہے' مصیبتیں تو زندہ رہ جانے والے بھگتتے ہیں۔"

"ہاں پتر! جس پہ گزرتی ہے وہی جانتا ہے اور تو' میں تو بس باتیں ہی کرتے رہتے ہیں۔۔۔ فضلے کی ایک بہن بھی بیوہ ہونے کے بعد بچوں سمیت گھر آ بیٹھی ہوئی ہے۔ گھر کوئی کمانے والا نہیں' اسی واسطے فضلے کی بیوی کو اس کی بہن اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ اس کی بہن اپنے گھر بڑی سوکھی ہے' اس کا گھر والا پٹواری ہے' وہیں کہیں اس کا نکاح بھی پڑھوا دیں گے۔۔۔ عمر بھی بڑی رہے' روٹی تو پیٹ بھر کھائے گی۔" وہ اب اٹھتے ہوئے بولے۔ "اچھا جی! میں ہن چلاں۔۔۔ رب راکھا!"

یہ بزرگ اسے آسمان سے اتار کر کھجور میں اٹکا گئے تھے۔ یہ تسلی تو ہوئی کہ شادو خیریت سے ہے اور کہاں ہے لیکن اب اس تک رسائی کا کوئی وسیلہ نہیں تھا۔۔۔ سرکاری نوکری اور غیر علاقہ' میں وہ کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا جو اس کی رسوائی اور اس کی اپنی بدنامی' بربادی کا باعث بنے۔۔۔ عصر تک وہ وہیں بیٹھا ذہنی لفٹ رائٹ کرتا رہا اور پھر جیسے کسی حتمی فیصلے پہ پہنچ چکا ہو۔ اب وہ مسجد کی جانب بڑھا مسجد

کا تصور آتے ہی پھر وہی حافظ صاحب کی بات یاد آ گئی کہ "من مسجد بناؤ' مندر نہیں۔۔۔ مسجد' مندر' مندر' مسجد۔۔۔" کچھ سمجھ نہیں آیا مگر آج اس نے کھل کر حافظ صاحب سے مشورہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ مسجد کی جانب آتے ہوئے روضہ شریف کے دروازے پہ حافظ جی کو تلاش کیا' انہیں وہاں نہ پا کر وہ اندر مسجد میں آ گیا۔ وہاں وہ امام صاحب کے پیچھے بیٹھے تھے۔ خوش قسمتی سے اسے ان کے پہلو میں ہی جگہ مل گئی۔ وہ خاموشی سے وہیں بیٹھ گیا۔ نماز کے بعد بھی وہ دانستہ خاموش بیٹھا رہا۔ حافظ صاحب نے خود ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا' اٹھتے ہوئے وہ اسے ساتھ لے کر باہر صحن میں آ بیٹھے۔

"سناؤ بھئی جوان! کیسے ہو؟۔۔۔ تم تو عید کا چاند بن گئے ہو۔ کہاں تھے اتنے دنوں' نظر نہیں آئے۔۔۔؟"

"الحمد للہ' حافظ صاحب! سب خیریت ہے۔۔۔ سرکاری نوکر ہوں' مشقوں پہ بہاولپور گیا ہوا تھا' آج ہی واپس آیا ہوں' آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"شکر ہے سوہنے رب دا' جس حال میں رکھے۔۔۔" انہوں نے پاؤں سیدھے کرتے ہوئے کہا۔

"حافظ صاحب! ایک بات بتائیں۔۔۔ آپ نے مجھے کیسے پہچانا جبکہ میں نے کوئی بات بھی نہیں کی؟"

"تم ظہر کی نماز کے بعد بھی میرے قریب سے گزرے تھے' نا؟" وہ مسکرانے لگے۔

"جی۔۔۔ آپ کچھ لوگوں کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھے' میں نے مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا۔۔۔ آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟"

"جوان۔۔۔!" وہ اس کے کاندھے پہ ہاتھ دھرتے ہوئے بولے۔ "عالم' عابد' عاقل اور عاشق۔۔۔ ان چاروں کی اپنی اپنی مخصوص خوشبوئیں ہوتی ہیں۔ عالم' باعمل عنبر کی مہک رکھتا ہے اور عابد باحقوق العباد عود کی مانند سلگتا ہے۔ عاقل باعقل سلیم کافور کی صفت رکھتا ہے اور عاشق باصدق' مشک کی مانند مشک مارتا ہے۔۔۔" وہ مسکرانے لگے۔

"مگر میرا ان چاروں سے کیا تعلق۔۔۔؟" وہ گھبرا کر بولا۔

"زیادہ تو میں نہیں جانتا لیکن ان چاروں میں سے ایک نہ ایک تو تم ہو ورنہ میں تمہیں کیسے پہچانتا؟۔۔۔ اگر ابھی پورے نہیں' ادھ وچہ تو ہو ہی۔۔۔" وہ مسکرائے۔

"حافظ جی! میں نمانا' نا کس کھاتے میں ہوں؟۔۔۔ میرے ایمان اور جذبے کی سلامتی کے لئے دعا فرمایا کریں اور ذرا یہ بھی سمجھا دیں کہ یہ عشق کیا ہوتا ہے۔۔۔" اس نے ڈرتے ڈرتے پھر سوال کر دیا۔

"وہ ٹھنڈی سانس لے کر اسے عشق کے متعلق بتانے لگے۔ "جوان! پہلے علامہ اقبال کا ایک شعر یاد آ رہا ہے' وہ سنو۔۔۔ ہے تو فارسی میں' ترجمہ بھی بتا دوں گا۔

عشق مرداں پاک و رنگین چوں بہشت
می کشاید نغمہ ہا از سنگ و خشت

اس شعر کا قریب قریب ترجمہ یہ ہے کہ دل والوں کا جذبہ عشق جنت کی مانند پاک صاف اور خوبصورت ہوتا ہے۔ اسی جذبے کی برکت سے پتھروں سے بھی زمزمے پھوٹ نکلتے ہیں۔۔۔ بیٹا! عشق ہی ابتدا ہے اور عشق ہی انتہا' یہ نعمت ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔ یہ چنگاری ہر اک کے سینے میں نہیں رکھی جاتی۔۔۔ تم نے بیلی بوٹی تو دیکھی ہوگی۔ اس بوٹی کو آکاس بیل' امر بیل اور عشقہ بھی کہتے ہیں اور "عشق" اسی عشقہ سے نکلا ہے۔ اس بیل کی ایک تند کسی درخت یا جھاڑ پہ ڈال دی جائے تو یہ پھیلتے پھیلتے پورے درخت کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے' آہستہ آہستہ درخت سوکھ کر ختم ہو جاتا ہے' عشق ختم نہیں ہوتا۔۔۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا ہے کہ انوار روحانی کے دس درجے ہیں۔ نور روح' نور عقل' نور معرفت' نور علم' نور یقین' نور توفیق' نور بصر' نور حیا' نور محبت اور آخر میں نور عشق۔۔۔ یہ آخری درجہ ہے اور سچا عشق مجاز کی منزلیں طے کرتا ہوا نور حقیقی سے متصل ہو جاتا ہے' اگر اس کی منتہا حقیقت نہ ہو تو وہ ہوس محض ہے اور انجام رسوائی' بربادی اور خرابی عاقبت پہ منتج ہوتا ہے۔۔۔" وہ سانس لینے کے لئے رکے۔

"حافظ جی! میں یہ گہری باتیں نہ تو سمجھ سکتا ہوں اور نہ ہی ان کا اہل ہوں۔ میں تو سیدھا سادا' صاف دل اور عملی آدمی ہوں جو کچھ میرے دل میں ہے وہ آپ سے چھپا ہوا نہیں۔۔۔ میں نہیں جانتا کہ کیا کر رہا ہوں اور میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ صرف اتنا جانتا ہوں کہ میرے من میں کوئی کھوٹ نہیں' نظر میں کوئی میل نہیں۔ میں چاہوں تو خوبصورت سے خوبصورت لڑکی سے میری شادی ہو سکتی ہے لیکن یہ لڑکی شادو جس کے بارے میں' میں کچھ زیادہ نہیں جانتا' میری روح اور دل میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ میں چاہوں بھی تو اسے نکال نہیں سکتا۔ اسے دیکھتے ہی یوں محسوس ہوا تھا جیسے یہی میری ساتھی ہے' یہی میری منزل ہے اور اس کی کیفیت بھی یہی تھی۔ ہماری ملاقات سے لے کر آج تک کے واقعات اور حالات کے بنانے یا بگاڑنے میں ہم دونوں کا کوئی دخل عمل نہیں رہا۔۔۔ وہ میرے پیچھے کھڑی تھی۔ ٹکر ہوئی' ہم دونوں بیک وقت جھکے' ڈوریاں بدلیں' اندر درگاہ شریف' کبوتروں والے چبوترے' ہمارے ملتے جلتے نام اور ملاقات کے دوسرے دن اس کے بیمار خاوند کا انتقال کر جانا۔ اس کا بے اولاد اور بے آسرا ہونا۔۔۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے قدرت قدم قدم پہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب کرتی رہی ہے۔ خوابوں میں' خیالوں میں' اشاروں میں اور یہاں تک کہ میری بے بے جی نے بھی مجھے اجازت دی ہے جبکہ ان کا ارادہ اپنی سگی بھانجی لانے کا تھا۔۔۔" اس نے مٹھی کھولی۔ "یہ دو ڈوریاں ہیں' کالے دھاگوں اور سرخ' فیروزی منکوں والی' یہ سرخ منکے والی ڈوری اندر درگاہ شریف میں اس نے خود میری ہتھیلی پہ رکھی۔ اس نے خود بتایا کہ بچپن سے لے کر اب تک لوگ اسے شادو مرادو کہتے آئے ہیں۔۔۔ بتایئے حافظ جی! یہ سب کیا ہے' کیوں ہے اور اس میں کوئی میرا دوش' میرا قصور یا ارادہ۔۔۔؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو بچے! تمہاری نیت پاک صاف ہے۔ اگر قدرت نے اس کی اور تمہاری بہتری کے لئے یہ سب حالات پیدا کئے ہیں تو آگے بھی وہی تم دونوں کی دستگیری کرے گی لیکن تمہیں صبر اور شرافت کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سے اپنے جذبے کے لئے صدق اور اس کی رحمتوں کے طلب گار رہو' یقیناً اللہ تمہارے اور اس کے لئے سلامتی اور بہتری کی کوئی راہ نکالے گا۔"

"آمین!" کہہ کر اس نے حافظ صاحب کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ ایسے میں ایک شاگرد لنگر خانے سے چاول لے کر آ گیا۔

* * *

صبح درگاہ شریف جانے کی نیت کر کے دونوں بہنیں کھا پی کر سونے کی تیاری کرنے لگیں۔ چھوٹے بچے کو ہلکا ہلکا بخار تھا' بڑی بہن اس کے ساتھ اندر کوٹھڑی میں لیٹ گئی۔ پٹواری کسی پڑوس کے گاؤں گیا ہوا تھا۔ شادو دوسرے بچوں کے ساتھ باہر برآمدے میں پڑ گئی۔ ہوا بند تھی' گھٹن اور حبس کے احساس کو کم کرنے کے لئے وہ ہولے ہولے کھجور کا پنکھا جھل رہی تھی۔ دیہاتوں میں رات شام کے فوراً بعد ہی اپنی زلفیں بکھرا دیتی ہے۔ اس کی بھی ڈھیر ساری زلفیں تکیے کی جگہ سر کے نیچے دبی پڑی تھیں' وہ خوش تھی کہ صبح درگاہ شریف سلام کے لئے جائے گی' سائیں سرکار سے دعا کرائے گی اور۔۔۔ اور اس کی زیارت کرے گی جس کو دیکھے ہوئے کئی صدیاں بیت گئی ہیں' آنکھیں ترس گئی ہیں۔۔۔ جانے وہ کس حال میں ہے' آیا بھی ہوگا یا نہیں' مجھے بھول تو نہیں گیا؟۔۔۔ نہیں' نہیں۔ وہ کیسے بھول سکتا ہے۔ وہ تو میری مراد ہے' میرا مراد ہے۔ میری ڈوری اس کے پاس ہے۔ میرا تو سب کچھ اسی کے پاس ہے۔۔۔ پاس بے سدھ پڑا ہوا بچہ بڑبڑایا تو وہ زور زور سے اسے پنکھا جھلنے لگی تھی۔۔۔ باہر دروازہ کھلا' پٹواری آ گیا تھا۔ وہ خاموشی دیکھ کر دہیں سے دہاڑا۔

"اوئے سوں گئے او' سنی سوئے۔۔۔"

اس کے ہاتھ میں کچھ سامان تھا' کتا بھی دم ہلاتا ہوا اس کے پیچھے کھڑا اس کی گٹھڑی کو سونگھ رہا تھا۔ وہ برآمدے میں شادو کے پاس پڑی ہوئی چارپائی کو بچھا کر بیٹھ چکا تھا۔ شادو اٹھ بیٹھی' کھانے کا پوچھنے لگی۔

"تیری بڑی کدھر ہے۔۔۔؟" وہ اندر دیکھتے ہوئے بولا۔ "کھانا لا جلدی' بڑی بھوک لگی ہے۔۔۔"

اندر سے آواز آئی۔

"کاکے کی دوا لائے ہو؟۔۔۔ صبح کے گئے' اب آئے ہو۔ پتہ بھی تھا کہ کل ہم نے سلام کے لئے جانا ہے۔۔۔ کاکا بھی بیمار ہے۔"

"ہاں' دوا بھی لایا ہوں۔ تم اٹھ کر میرے ہاتھ دھلاؤ--- سرکاری کارندہ ہوں' میرا کام گھر میں نہیں' باہر کھیتوں اور زمینوں پہ ہوتا ہے۔ اب دس بارہ دن تو بالکل فرصت نہیں ہوگی۔ تحصیلدار صاحب کی حاضریاں ہیں---"

شادو کھانا آگے دھر چکی تھی۔

"یہ کیا لائے ہو---؟" وہ گٹھڑی ٹٹولتے ہوئے بولی۔

وہ لقمہ نگلتے ہوئے بولا۔ "چائے کی پتی ہے' چینی اور گوشت لایا ہوں--- بے جا' سنبھال کر رکھ۔"

اس کی بیوی بھی باہر آچکی تھی' کتا بھی پاس کھڑا دم ہلا رہا تھا' گوشت کی خوشبو سے خوش ہو رہا تھا۔

"بچے سو گئے نے---؟"

"ہاں' سوں گئے نے---" اس کی بیوی دوا کی بوتل ہلاتے ہوئے لاپرواہی سے بولی۔

"لے یہ کھوئے کی برفی' بچوں کے لئے لایا تھا---" وہ ایک پھٹا سا لفافہ بڑھاتے ہوئے بولا۔

"راستے میں لفافہ گر گیا تھا' یہ دو ٹکڑیاں ہی بچی ہیں۔ ایک تو کھا لے اور دوسری شادو کو دے دے' بڑی سوادی ہے--- بچوں کے لئے کل اور لے آؤں گا۔"

"---اور چیزیں تو سنبھال کر لے آئے' برفی سنبھال نہیں جاتی تھی؟" اس کی بیوی ایک ٹکڑی شادو کے منہ میں ڈالتے ہوئے بولی۔ "کل اور ضرور لیتے آنا' کاکا بڑے شوق سے کھاتا ہے۔"

"کاکے کا بخار کیسا ہے؟--- اس کو اندر ہی سلانا' باہر پچھلے پہر تریل ہوتی ہے۔"

"بخار تو بڑا تیز ہے' ابھی شربت پلاتی ہوں--- رب کرے' سویرے تک ٹھیک ہو جائے۔"

شادو چلم لے کر چولہا کریدنے لگی۔ اس کی بیوی اندر داخل ہو چکی تھی۔ شاہ دین پٹواری نے کاغذ میں لپٹی ہوئی گوشت کی ایک بڑی سی بوٹی نکالی اور کتے کے آگے پھینک دی۔

رات دوپہر گزر چکی تھی۔ وہ حقہ ہٹاتے ہوئے دالان تک گیا' شادو کو شانے سے پکڑا' ہلایا پھر اندر گیا' بیوی کو ہلایا جلایا اور مطمئن ہو کر باہر نکل گیا۔ دروازہ کھولا تھا' کئی اندر آئے' شادو کو اٹھایا اور خاموشی سے تاریکی میں غائب ہو گئے۔ اس کی بندھی گٹھڑی' دوپٹہ' کھیس اور وہ ایک زیور جو پٹواری نے پہلے ہی بیوی کے صندوق سے اڑا لئے تھے' وہ بھی ساتھ لے گئے۔ کتا دروازے کے پاس بے سدھ پڑا تھا۔ پٹواری نے کنڈا چڑھائے بغیر دروازہ بھیڑ دیا۔

صبح جب اس کی بیوی کی آنکھ کھلی تو شادو اپنی کھاٹ پر موجود نہیں تھی' پٹواری وضو کر رہا تھا۔

"شادو نی شادو! کتھے گئی ایں؟"

نیند کا خمار ابھی پوری طرح ٹوٹا نہیں تھا' وہ برآمدے میں بچوں کے پاس نیم دراز ہو گئی۔ پٹواری اس کے پاس آیا۔

"میں نماز پڑھ آواں' تسی جلدی نال تیار ہو جاؤ--- شادو کتھے اے؟"

"پتہ نہیں--- کدھرے ہمسایاں ول ہوئی اے' او ہناں دی تے جاناں اے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

وہ باہر مسجد کی طرف نکل گیا--- واپس آیا تو اس کی بیوی رو رہی تھی' ساتھ گوانڈ سے بھی عورتیں بیٹھی تھیں۔ وہ گھبرایا گھبرایا آیا۔

"کیا ہوا--- کاکے کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

وہ اندر دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ روئے جا رہی تھی' عورتیں اسے تسلی دے رہی تھیں۔

"کچھ مجھے بھی بتاؤ' کیا سویرے سویرے رونا ڈال دیا ہے---؟"

ایک عورت رکتے رکتے بولی۔ "شاہ دین! شادو کا کہیں پتہ نہیں--- میں تو کہتی ہوں کہ وہ ادھر ادھر کسی کے گھر گئی ہوگی' یہ ایسے ہی رو رہی ہے---"

"او پاگلے! اٹھ' جا کے ادھر ادھر کسی کے گھر دیکھ' کسی کو بلانے گئی ہوگی---"

"کھے تے مٹی---" وہ پیٹتے ہوئے بولی۔ "اس کی گٹھڑی بھی یہاں نہیں--- میرا صندوق کھلا ہے--- ہائے میریاں ٹوہاں---"

"کی مطلب تیرا---؟" وہ پریشان ہو کر پوچھنے لگا۔

"مطلب صاف اے بھائی شاہ دین! شادو کدھرے منہ کالا کر گئی اے۔ اپنا کپڑا لتا تے تیری ووہٹی دیاں ٹوہاں وی لے گئی اے۔"

اب پہلی عورت نے انکشاف کیا۔ "پرسوں میں نے خود دیکھا تھا' ایک موٹر سائیکل والا دو تین بار ادھر لگا گیا۔ یہ دروازے کے پاس کھڑی اشارے کر رہی تھی' مجھے دیکھ کر اندر چلی گئی---"

"او کون سی ماسی---؟"

"پتر! مجھے تو دو قدم سے دور دکھائی نہیں دیتا' بھلا میں اسے کیسے پہچانتی---؟"

"ہائے نی لٹی گئی--- میریاں ٹوہاں--- ہائے نی! کتھے منہ کالا کر گئیں ایں---؟"

"چپ کر' دہائی رولا نہ پا--- لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ میں نے تو پار کے پنڈ اس کی شادی کی بات بھی چلا دی تھی۔ وہ لوگ کل جمعے کو اسے دیکھنے یہاں آ رہے تھے---"

"ہائے نی' تینوں کے دی آئی آوے--- نصیباں سڑیئے! نی تیرا بیڑا---"

"ماسی' اسے چپ کراؤ۔ میں منہ عزت والا آدمی ہوں' انہوں نے مجھے دو کوڑی کا کر دیا ہے--- خدا کا خوف کر کے اسے اپنے پاس لے آیا' سوچا تھا' اس کی کہیں شادی کر دوں گا لیکن--- خیر' میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ کہیں پتہ کرتا ہوں---"

سورج چڑھنے تک شادو کی بات ہر کسی کی زبان پہ چڑھ چکی تھی۔ گاؤں کے میراثی کو حتراں والی بھیج دیا گیا تھا کہ شاید وہاں چلی گئی ہو۔ ایک دو نے دبے دبے لفظوں میں پولیس میں رپورٹ کرنے کا مشورہ دیا۔۔۔ کب گئی کیسے نکلی کس وقت نکلی؟ چوکیدار سے سختی سے پوچھ گچھ کی گئی مگر اس نے قطعی لاعلمی ظاہر کی۔ شوقیہ کھوجیوں نے کھرا اٹھانے کی کوشش کی تو باہر مسجد کے چوک تک کھرا چلتا رہا وہاں سے کسی موٹر سائیکل کا کھرا شروع ہو گیا جو ظاہر ہے اٹھایا نہیں جا سکتا۔۔۔ اس دن بھی کھانا پڑوسیوں کے گھر سے آیا تھا۔ ٹھیک دوپہر تک یہ خبر شادو کے سسرال والوں تک بھی پہنچ چکی تھی مگر خس کم جہاں پاک کہہ کر انہوں نے مٹی ڈال دی۔ وہاں سے یہ خبر سائیں مولا بخش تک پہنچ گئی اور اصلی بم تو اس کے اندر پھٹا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے بم کے ٹکڑے اور بارود اس کی آنکھوں میں گھس گیا ہو۔ شاہ مراد اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا جیسے وہ بھاری توپ پہ بیٹھا دھنا دھن اس پہ گولے پھینک رہا ہو۔۔۔ صبح تو وہ اسے سلام کر کے گیا تھا یقیناً وہ ابھی تک حسب معمول اندر ہی کہیں موجود ہو گا۔۔۔ وہ کہاں گئی کس کے ساتھ گئی ابھی کہاں ہے؟ ایسے بے شمار سوالات اس کے دماغ میں کلبلا رہے تھے مگر سر دست ان کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ شدید قسم کی اندرونی توڑ پھوڑ کا شکار ہو چکا تھا۔ پریشان ہو کر وہ اڈے سے نیچے اتر آیا۔ اب وہ شاہ مراد کو تلاش کر رہا تھا۔۔۔ شاہ مراد اسے سماع کی محفل میں جذب ہوا مل گیا۔ اس نے بھی اسے دور سے دیکھ لیا تھا اٹھ کر قریب آ گیا۔

"السلام علیکم سائیں جی۔۔۔!"

سائیں مولا بخش نے وعلیکم کہتے ہی اس کو ساتھ لے لیا۔

"شاہ بیٹا کیسے ہو۔۔۔؟"

"اللہ کا شکر ہے آپ کی دعا کی برکت ہے۔۔۔ آپ ادھر کہاں تشریف لائے ہیں؟"

"ہم تو فقیر بندے ہیں من کی موج ہے۔ ادھر آ گئے تو تم نظر آئے۔۔۔ سوچا چلو تم سے دو باتیں کر لیں۔۔۔"

"جی بسم اللہ۔۔۔ میں آپ کا نوکر ہوں۔۔۔"

"اللہ خوش رکھے تمہارے لئے اللہ سے دعا کر رہا ہوں۔۔۔ وہ شادو والی پھر ملی کہ نہیں؟" وہ اسے ٹٹولتے ہوئے بولے۔

"نہیں سرکار! آپ کی نظر ہوتی تو بات بن گئی۔۔۔ بڑی بدنصیب ہے بیچاری اب تو بیوہ بھی ہو گئی۔ پتہ نہیں کس حال میں ہو گی؟"

"اس کا نہیں پتہ وہ تو نکاتا تھا۔۔۔" سائیں مولا بخش نے اسے ازیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں سرکار! میں خاندانی آدمی ہوں سرکاری بندہ ہوں۔ ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ مجھے جو کچھ بھی مانگنا ہے وہ آپ جیسے بزرگوں کے وسیلے اپنے رب سے مانگوں گا۔۔۔"

"شاباش۔۔۔!" وہ اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے بولے۔ "اللہ مرادیں پوری کرے۔"

"آمین۔ سرکار! آپ کی تو وہ مرید ہے آپ کو پتہ ہو گا کہ وہ کس حال میں ہے؟"

"ہاں مجھے اس کے حال کی خبر ہے۔۔۔ وہ اب شاید یہاں کبھی نہ آئے اس کے ستارے اپنا رخ تبدیل کر چکے ہیں۔ بہتر ہے کہ تم کسی نامحرم کا خیال چھوڑ کر اپنی نوکری اور آنے والی زندگی کی جانب دھیان دو۔۔۔"

وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا۔ "سرکار! ستارے رخ تبدیل کرتے رہتے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ ضرور کرتے ہیں۔"

"سائیں جی! میں مرد ہوں انشاءاللہ زندگی کی آخری سانسوں تک ستاروں کے رخ تبدیل ہونے کا انتظار کروں گا۔ دوریاں اگر بدل سکتی ہیں تو ستاروں کے رخ بھی بدل سکتے ہیں۔۔۔ ہم تو فوجی ہیں شکست کو فتح میں بدلنا خوب جانتے ہیں۔ بس آپ کی دعا کی برکت چاہیے اور اوپر والے کا کرم۔۔۔"

سائیں مولا بخش مراقبے میں جا چکے تھے دو چار درویش بھی پاس آ بیٹھے۔ کافی دیر بیٹھنے کے بعد اذان شروع ہوتے ہی وہ مسجد کے اندر تھا۔

***

کہیں دور سے آتی ہوئی اذان کی آواز اس کے کانوں کے پردوں سے ٹکرائی نیند اور غنودگی کے خمار سے بوجھل آنکھیں ابھی کسی چیز کی واضح تصویر کشی کے قابل نہیں تھیں۔ دماغ میں جیسے ہزاروں کیچوے کلبلا رہے ہوں۔ وہ ذبح کی مرغی کی مانند پھڑپھڑا رہی تھی جو خونخوار کتوں کے نرغے میں پھنس گئی ہو۔ اس کے کپڑے جا بجا پھٹے ہوئے تھے بازو اور گردن پہ نیل ابھرے ہوئے تھے اور کسی نامعلوم جگہ آبادی سے دور ٹیوب ویل کے ساتھ ایک کوٹھری میں چارپائی پہ بندھی ہوئی تھی۔ بند دروازے کے باہر ذرا ہٹ کر ٹیوب ویل کی حوض کے سامنے میں ایک شکستہ حال بوڑھا بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔۔۔ اس کی چندھیائی سی آنکھیں دروازے پہ گڑی تھیں اور کان اندر سے ابھرتی ہوئی سسکیوں پہ لگے تھے مگر اسے اندر جانے یا دروازہ کھولنے کی اجازت نہیں تھی اسے محض نگرانی کے لیے چھوڑا گیا تھا۔

"پانی۔۔۔ پانی"

اس کے کانوں سے آواز ٹکرائی یہ پہلی آواز تھی جو اس نے سنی۔ اس نے ان سنی کرتے ہوئے آنکھیں دوسری جانب پھیر لیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے وہ اپنی بے بسی اور حیثیت پہ خون کے آنسو بہا رہا تھا۔

"اللہ کے واسطے مجھے کوئی پانی دے۔۔۔"

درد اور التجا کی کاٹ میں لہراتی ہوئی ایک برچھی اس کی بوڑھی سماعت میں آگھسی' وہ کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ پھر تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا اور بغیر سوچے سمجھے دروازے پہ پہنچ گیا' تالہ کھول کر اس نے پٹ سرکایا اور ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا۔

"باباجی!---ایک گھونٹ پانی' صرف ایک گھونٹ---میں مر رہی ہوں۔"

"ابھی لایا---"

وہ الٹے پاؤں واپس پلٹا۔

"لے پتر' پانی پی---"

وہ پیالہ اس کے خشک پپڑیوں کے قریب لایا' دوسرے ہاتھ سے اس کو سہارا دیا۔ شادو نے بڑی مشکل سے دو گھونٹ پانی پیا اور نقاہت سے سر ڈال دیا۔ باباجی نے اس کا پلو بھگو کر اس کے چہرے' گردن اور سر کو تر کیا---بابا رو رہا تھا' اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"اللہ بھلا کرے باباجی---" وہ لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے بولی۔

"پتر! کسی کو بتانا نہیں کہ میں نے تجھے پانی پلایا---ورنہ وہ لوگ مجھے کتوں کے آگے ڈال دیں گے---"

"نہیں باباجی' میں کسی کو نہیں بتاؤں گی---ایک' صرف ایک مہربانی اور کر دو۔ مجھے کہیں سے زہر لا دو یا اپنے ہاتھوں میرا گلا دبا دو---" وہ رونے لگی۔

"نہ پتر' اے نہ منگ---رب تجھے حیاتی دے---"

"میں نے کیا کرنی ہے حیاتی' اب میرے پاس کیا رہ گیا ہے؟ میں بڑی منحوس ہوں' بڑی بدنصیب ہوں' بے مراد ہوں---"

وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ بابا بڑا پریشان ہو گیا' بار بار باہر نکل کر دیکھتا۔ اس کی بوڑھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس صورت حال کا کیسے سامنا کرے؟ اپنی بے بسی' بے کسی پہ اسے بھی رونا آ گیا' مری ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

"پتر' میں کمی کمین کیا کر سکتا ہوں؟---پٹواری مجھے زندہ گاڑ دے گا' کیوں میرا مردہ خراب کرتی ہو---"

"کون پٹواری---" پھر وہ خود ہی کہنے لگی۔ "شادو دین پٹواری---؟"

"ہاں' شادو دین پٹواری---یہ ٹیوب ویل' زمینیں اس کے دوست گرداور فتح یار کی ہیں۔ میں غریب اسی کا کاما ہوں---خدا دا واسطہ' میرا نام نہ لینا---"

وہ پھر باہر نکل گیا اور ادھر ادھر دیکھ کر دروازہ بند کرتے ہوئے اندر آ گیا---شادو کافی دیر چھت کی کڑیوں کو گھورتی رہی پھر بڑے سکون سے بولی۔

"بابا! تیری کوئی بیٹی ہے---کوئی لاڈو' شادو---کوئی دھی ہے بابا؟"

"پتری---آہو' میری بھی اک تیرے ورگی دھی تھی۔ بالی نام تھا اس کا' بڑی سوہنی' کالی---" وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ "دھیئے! دعا کر' رب کسے غریب دے گھر سوہنی دھی نہ دے---" بابا ہچکیاں لینے لگا۔

"بابا! کہاں ہے بالی' اس نوں بلا---میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"کہاں سے بلاؤں بالی کو' وہ اب نہیں آ سکتی---مر گئی پتر! کھوہ میں چھلانگ گئی تھی۔" وہ ہولے ہولے چارپائی کی پٹی پہ ٹکریں مار رہا تھا۔

"نہ باباجی! وہ کھوہ میں نہیں گری تھی۔ وہ بھی میری طرح پٹواری اور گرداور جیسے کتوں میں گھر گئی تھی' وہ میری طرح ایسی چارپائی پہ بندھی ہوئی مجبور نہ ہو گی---مجھے کھولو بابا' مجھے کھول دو۔ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ وہ کس طرح کھوہ میں گری تھی---خدا دا واسطہ باباجی' مجھے کھول دو۔ میں تمہاری بالی ہی ہوں' ہم ایسی بالڑیوں بالیوں کے کنویں' ریل کی پٹڑیاں' زہر دے پھکے تے دوپٹیاں دیاں پھائیاں ہی نصیب ہیں---"

"پتر---"

"مجھے پتر نہ کہو---اور اگر دھی پتر کہنا ہے تو مجھے کھول کر آزاد کر دو---بیٹیاں' ماں باپ کی عزت پہ قربان ہو سکتی ہیں تو کیا ماں باپ اپنی بیٹیوں کی عزت نہیں بچا سکتے؟---مجھے کھول دو' اپنی بالی کو بچا لو بابل---!"

بابا زمین سے یوں اٹھا جیسے آسمان کو چھونے کا عزم کر لیا ہو۔

"آج میں اپنی بالی نوں بچاواں گا---" وہ جلدی جلدی رسیاں کھول رہا تھا۔ "لے پتر---ایہہ چادر' اے تیری گٹھڑی' جتی پا تے نس جا---او سامنے ٹالیاں دے پرے' وڈی سڑک اے' جا تیرا رب وارث---"

وہ اسے جلدی جلدی درختوں کی جانب بڑھتا ہوا دیکھ رہا تھا جن کی اوٹ میں ایک پتلی سی سڑک شہر کی جانب سرک رہی تھی۔

پندرہ بیس منٹ میں وہ سڑک کے کنارے ایک پلی پہ بیٹھی تھی---انجان رستے سے بے خبر' وہ کہاں ہے' شہر کدھر ہے' کتنی دور ہے؟---وہ بڑی سی چادر میں اپنے آپ کو ڈھانپے کسی غیبی مدد کی منتظر تھی۔ اسے دور سے آتی ہوئی ایک گڈ دکھائی دی جس پر ڈنگروں کا سبز چارا لدا ہوا تھا۔ ایک بوڑھا سا آدمی اس پہ بیٹھا تھا' قریب آتے ہی اس نے کہا۔

"میں بیمار ہوں' شہر جانا چاہتی ہوں۔"

بوڑھے آدمی نے کہا۔ "بیٹی! تم تانگے یا بس میں بیٹھ جاؤ' جلدی پہنچ جاؤ گی۔"

اس نے بتایا کہ جسم پہ پھوڑوں کی وجہ سے وہ سخت جگہ یا بھیڑ بھاڑ میں سفر نہیں کر سکتی' آرام سے اوپر چارے پہ لیٹ جائے گی۔۔۔ اوپر ایک لڑکا پہلے ہی لیٹا ہوا تھا' وہ نیچے آگیا۔ یہ اوپر جا کر لیٹ گئی اور لیٹتے ہی نیم بیہوش سی ہو گئی۔

●●

چار چوٹ کی مار کھانے کے بعد بھی بابا نورا صرف یہی بتا سکا کہ شادو کے فرار ہونے میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں' وہ تو شور اور توڑ پھوڑ کی آوازیں سن کر اندر داخل ہوا جہاں وہ پہلے ہی آزاد تھی' اسے دھکا دے کر وہ بھاگ گئی۔۔۔ شاہ دین پٹواری کو بادل نخواستہ اس کی بات کا یقین کرنا پڑا نہ یقین کرنے کی بظاہر کوئی وجہ بھی نہ تھی کیونکہ بابا نورا بڑا اعتباری' ایماندار اور پرانا ملازم تھا۔۔۔ وہ نشاندہی نہ بھی کرتا تو بھی اس کی تلاش بہت ضروری تھی' اطراف میں صرف ایک ہی کچی پکی سڑک تھی جو شہر تک پہنچاتی تھی۔ مزید وقت ضائع کئے بغیر شاہ دین پٹواری اور فتح یار گرداور' بابے نورے کو ساتھ گھسیٹتے ہوئے شادو کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ ان کے پاس ایک ویگن تھی جو بڑی تیزی سے کچے پکے' اونچے نیچے راستے پہ ہچکولے لیتی ہوئی اڑی جا رہی تھی' بابا نورا زیر لب آیتیں پڑھتا ہوا ساتھ بیٹھا تھا۔ ویگن میں کھانے پینے کے سامان کے علاوہ دیسی شراب کی بوتلیں بھی موجود تھیں۔ ویگن فتح یار چلا رہا تھا' وہ اسے ہر قیمت پر پکڑنا چاہتے تھے ورنہ ان سب کی سلامتی خطرے میں تھی۔۔۔ انہوں نے بڑے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت یہ کارروائی کی تھی۔ شادو' شاہ دین پٹواری کے لئے ایک چیلنج بن چکی تھی' شادی سے پہلے ہی وہ اس کا دیوانہ تھا اور وہ شادی اس سے ہی کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی بڑی بہن آڑے آگئی۔ پھر اس نے بال بچے دار ہونے کے باوجود اسے شیشے میں اتارنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن قدرت نے ہر بار اسے ذلیل و خوار کیا۔ شادو کے بیوہ ہونے کے بعد اسے پھر امید کی کرن نظر آئی۔ اس نے پہلے تو اپنا کھویا ہوا اعتماد بحال کیا۔ تاک جھانک اور چھیڑ خانی سے پرہیز کیا' بظاہر اسے چھوٹی بہن کہنا شروع کر دیا اور اس کے لئے کوئی اچھا رشتہ تلاش کرنے کا ڈرامہ کیا۔ پھر بیوی کے زیور چرائے اور موقع پا کر بیہوشی کی دوا ملی برفی کھلا کے خود ہی اغواء کرا دیا۔ اس مذموم منصوبے میں فتح یار گرداور کے علاوہ ایک دو اور اسی طرح کے اوباش شامل تھے۔ یہ الگ تھلگ کوٹھری اور ٹیوب ویل فتح یار گرداور کی ملکیت تھا جہاں پہ وہ اندھیرے سویرے' پینے پلانے اور دیگر عیاشیوں کی محفل جمایا کرتے تھے۔ شاہ دین پٹواری کا گاؤں محض دو تین میل کے فاصلے پہ تھا' دس پندرہ منٹ کے درمیانی وقفے سے وہ بیک وقت دونوں جگہ پہ اپنی موجودگی کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔ بیوی سمجھتی کہ وہ باہر مسجد میں گیا ہے لیکن یہ حضرت اس کوٹھری میں ہوتے' نماز ختم ہونے تک وہ پھر گھر موجود ہوتا۔ اسی سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے یہ اغواء کا منصوبہ بھی ترتیب دیا تھا' اغواء کے دن بھی

یہ کئی دفعہ یہاں چکر لگا چکا تھا۔ اس نے بڑی کوشش کی تھی کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نکل آئے لیکن شادو نے ہڈیاں تڑوانے کے باوجود بھی اس کے کالے منہ پہ تھوک دیا۔ فتح یار گرداور کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اسے فی الحال بابا نورا کی نگرانی میں چھوڑ کر وہ شہر چلے گئے جہاں ان جیسا ایک اور شیطان موجود تھا۔ بابو خورشید تحصیل میں کلرک تھا۔ اول درجے کا راشی' اکل حرام کا پروردہ' جوڑ توڑ کا ماہر' جعلسازی کا استاد' عورت' شراب اور جوئے کا رسیا تھا۔ اس کا کرائے کا مکان شہر سے باہر نہر کے کنارے سے ذرا ہٹ کر محصول چنگی کے عقب میں تھا۔ وہ شادی کا جھنجھٹ پالنے کا عادی نہ تھا مگر اس کی بیوی یا رکھیل راحت جان نام کی ایک خوبصورت سی عورت عرصہ چار سال سے اس کے ساتھ موجود تھی' بچوں کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ یہ عورت پہلے کہیں نرس تھی' اپنے آپ کو ڈاکٹر کہتی تھی۔ بے باکی' چالاکی' ہوشیاری اور دلیری میں بڑے بڑوں کے کان کترتی تھی۔ بابو خورشید کا گھر ان کے لئے محفوظ پناہ گاہ تھی' منصوبے کی آخری تان یہیں پہ ٹوٹنی تھی۔ سارے انتظامات مکمل کرنے کے بعد وہ واپس شادو کو لینے پہنچے تھے لیکن وہاں پنجرہ خالی تھا۔

اب وہ کچے سے پکی سڑک پہ آپہنچے۔ سڑک خالی تھی' پلی کے پاس جہاں بس رکتی تھی' دو چار بوڑھے ایک عورت اور بچوں کے ساتھ بیٹھے بس کا انتظار کر رہے تھے مگر شادو وہاں نہیں تھی۔ آئے چیزہ رنگنے کے کارخانے والا بس اسٹاپ بھی خالی تھا' اس سے آگے بانسوں کے ذخیرے کے آس پاس بھی کوئی انسان نظر نہ آیا۔۔۔ آگے محصول چنگی سے ذرا پہلے ایک گدھا لوڈھی کھڑی تھی' شاید پہیہ اتر گیا تھا۔ وہ رک گئے۔

"بابا جی' کی ہویا۔۔۔؟"

"پہیہ نکل گیا ہے چودھری صاحب۔۔۔ مہربانی ہوگی' ذرا ہتھ تے پواؤ۔۔۔"

"بابا۔۔۔ کوئی کڑی تے ادھر نہیں دیکھی۔۔۔؟"

"چودھری جی' اک کڑی اتے بیمار پئی ہوئی اے' شہر ہسپتال جانا چاہوندی اے۔۔۔"

"بابا جی۔۔۔ اے کڑی تے اسی تلاش کرنے آں۔۔۔ اے میری سالی اے' وچاری دا دماغ کم نہیں کردا۔۔۔"

وہ اسے اتارنے کے لئے چارے کے اوپر چڑھ گئے۔۔۔ بابے نور کی آنکھوں میں آنسو آگئے' پتہ نہیں وہ منہ میں کیا کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

شادو نیم بے ہوش تھی' حرارت سے پنڈا پھنک رہا تھا۔ وہ کسی طرح اپنی مدافعت کے قابل [illegible] تھی' اس نے عجب بے چارگی کے عالم میں نیم وا آنکھوں سے ان ظالموں کو دیکھا اور ہلکی سی کراہ [illegible] ان کی باہوں میں جھول گئی۔

●●

دھیرے دھیرے اس آنکھوں سے اندھیرا چھٹ رہا تھا مگر حواس ابھی تک پوری طرح بحال نہیں وئے تھے' پسینے سے شرابور' نقاہت اور حیرت سے وہ بھاری متورم پپوٹے جھپکا رہی تھی۔ ایک ایک ر کے یادداشت اور واقعات کے دریچے کھل رہے تھے۔ اس نے اپنے گردوپیش پہ نظر ڈالی' ایک سجے جائے کمرے میں وہ ایک آرام دہ پلنگ پہ دراز تھی' ہاتھ پاؤں آزاد تھے۔ اس کے سرہانے ایک وبصورت بھاری بھرکم سی عورت' فیشن ایبل لباس' کٹے ہوئے بال اور بھاری میک اپ سے آراستہ' ں کے ماتھے پہ پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ کھڑکی کے پاس اس کا بہنوئی شاہ دین پٹواری' فتح یار گرداور کے لاوہ دو اور آدمی صوفے پہ بیٹھے شراب سے دل بہلا رہے تھے' سامنے تپائی پہ مچھلی' کباب اور سوڈے کی تلیں رکھی تھیں۔ کمرے میں سگریٹ کے دھوئیں کے علاوہ اک عجیب ناگوار سی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔

ں نے بڑی مشکل سے کروٹ لی' منہ سے اک آہ نکل گئی اور شاہ دین اس کی جانب لپکا۔

"میری جان' شادو!--- ہوش کر' ہوش--- رانی!"

راحت جان' شاہ دین کو پیار سے ہٹاتے ہوئے بولی۔

"چودھری صاحب! آپ مہربانی فرما کر ادھر ہی تشریف رکھیں--- دیکھتے نہیں' بے بی کی طبیعت ابھی ٹھیک نہیں---"

وہ انتہائی مکاری سے اس کے سر کو سہلانے لگی اور شاہ دین نے واپس اپنی جگہ پہ بیٹھ کر گلاس ونٹوں سے لگا لیا۔ شادو اسے دیکھ رہی تھی' اس کا نیا روپ--- اسے شراب پیتے ہوئے شادو نے لی بار دیکھا تھا۔ وہ مسلسل تکے جا رہی تھی یا شاید نظریں ہٹانے کی سکت نہیں تھی' اس میں تو یہ نظارہ یکھنے کی بھی ہمت نہیں تھی' جی کڑا کر کے بڑے جتنوں سے چہرہ دوسری جانب کرنے میں کامیاب ہوئی۔ ب جدھر اس کا چہرہ تھا' سامنے بابا نور دروازے کے پاس بیٹھا اس کی جانب ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ اس ی بوڑھی آنکھیں کسی بھی جذبے سے خالی اور خشک تھیں' شاید وہ سوچ رہا تھا کہ بند ہونے سے پہلے ان نکھوں کے لئے اور کیا کچھ دیکھنا باقی رہ گیا ہے؟--- وہ اس بی اور اپنی بے بسی پہ دھاڑیں مارنے لگی تو شاہ ین پٹواری گھبرا کر گلاس چھوڑ کر پاس پلنگ پہ آبیٹھا' راحت جان اسے تسلیاں دینے لگی۔

"بابا! پانی لاؤ---"

کسی نے کہا اور پھر بڑی مشکلوں سے اس نے دو گھونٹ پیا۔ راحت جان نے مردوں کو حکم دیا کہ آپ سب پرے بیٹھیں۔ اس نے شادو کو خود پکڑ کر اٹھایا' تکیے کے سہارے سے بٹھاتے ہوئے بولی۔

"کیوں رو رو کر ہلکان ہو رہی ہو؟--- ہم سب تمہارے ہمدرد ہیں' دشمن نہیں--- اٹھو' منہ ہاتھ ھو کر کپڑے بدلو' کچھ کھاؤ پیو--- عیش کرو---" وہ چوہدری شاہ دین پٹواری کو آنکھ مارتے ہوئے بولی۔

"ماشاء اللہ چوہدری صاحب ہیں' کس چیز کی کمی ہے ان کے پاس؟--- شہزادیوں کی طرح رہیں گے۔ چار دن کی زندگی رونے دھونے اور مرنے والوں کا ماتم کرنے کے لئے نہیں ہوتی۔ جو خوشی جب ملے' جہاں ملے اس کو سمیٹ لو' جانے نہ دو--- یہی زندگی ہے۔"

وہ خاموش تھی' کیا جواب دیتی؟--- بس سسکیاں بھر رہی تھی۔ شاہ دین پٹواری گلاس اٹھا لایا۔

"لو' ایک گھونٹ پیو اور پھر دیکھو' ہر دکھ درد دور ہو جائے گا--- شاباش!"

وہ گلاس پرے ہٹاتے ہوئے بولی۔ "مجھے صرف سادہ پانی دو---"

راحت جان نے پاس رکھا ہوا گلاس بھر اس کے خشک ہونٹوں سے لگا دیا--- اب وہ پوری طرح ہوش میں تھی۔ شراب اور شادو کے ہوش میں آجانے کے دو آتشہ نشے نے شاہ دین پٹواری کو خوشی سے پاگل کر دیا' لڑھکتا لڑھکتا شادو کے اور قریب ہو گیا۔

"شادو' میرے نال شادی کر لے۔ میں تجھے سونے سے پیلا کر دوں گا۔ تجھے---!"

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے کہنے لگی۔ "--- شرم کرو شاہ دین!--- دو بہنیں ایک خاوند کے پاس نہیں رہ سکتیں۔ پھر میں تو تیری بہن ورگی ہوں' تو میرا بہنوئی ہے---"

شاہ دین پٹواری نے ترنگ میں اس کے گالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ "اوئے سوہنیے! چھڈ ا ینہاں رشتیاں وشتیاں نوں--- توں عورت تے میں مرد' یہ رشتہ ہی سب سے بڑا رشتہ ہے۔"

راحت جان بولی۔ "شادو! ان باتوں کو چھوڑو--- بات دل کی ہوتی ہے' جہاں آجائے--- رشتے وشتے' بس دکھاوے کے ہوتے ہیں---"

وہ سنبھل کر بولی۔ "شاہ دین! تیری دو بیٹیاں ہیں' ابھی بھولی ہیں لیکن عورت کا روپ تو ہیں--- کیا ان سے بھی تو اپنے مرد ہونے کے حوالے سے یہ رشتہ قائم کر سکتا ہے؟"

"بکواس نہ کر' نی---!" ایک بھرپور تھپڑ شادو کے بائیں گال پہ پڑا۔ پھر اس نے بڑا سا گھونٹ لیا۔ "دیکھ' تیری یہ باتیں مجھے روک نہیں سکتیں۔ میں جان کی بازی لگا کر بھی تجھے حاصل کروں گا---" وہ کانپ رہا تھا۔

تھپڑ کھا کر وہ جیسے پرسکون ہو گئی' نہ روئی اور نہ چلائی۔ اس نے اپنی تندو تیز زہریلی نگاہیں اس کی مخمور آنکھوں میں تیر کی طرح پیوست کر دیں۔

"اچھا' شاہ دین! تم مجھ سے ہر قیمت پہ شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں' میں قسم اٹھا چکا ہوں---"

"پہلی بیوی اور بچوں کا کیا کرو گے؟"

"میں ہزار بیویاں اور لاکھ بچے تیری جوتی پہ قربان کر سکتا ہوں--- تو اک بار ہاں تو کر---"

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "شاہ دین! میری چار شرطیں ہیں' اگر تو ان کو پوری کرتا ہے تو میں شادی کے لئے تیار ہوں---"

"مبارک ہو چودھری صاحب! میں نہ کہتی تھی کہ بے بی مان جائے گی--- سمجھ دار ہے' کوئی بیوقوف نہیں جو آپ جیسے اچھے اور خاندانی آدمی کو ٹھکرا دے۔ مٹھائی منگاؤ جلدی---" یہ راحت جان تھی۔

شاہ دین پٹواری جلدی سے گلاس بھرتے ہوئے بولا۔ "بول شہزادی' بول--- مجھے تیری ہر شرط منظور ہے۔"

"پہلی شرط یہ ہے کہ تو اپنی بیوی کو طلاق دے گا لیکن وہ مکان اور زمین بچوں کے نام کرے گا' ہر ماہ ان کا خرچہ دے گا---"

وہ جلدی سے بولا۔ "منظور--- آخر تیری بڑی بہن ہے' میں ان کا پورا پورا حق دوں گا--- دوسری بول؟"

"میرا حق مہر بیس ہزار ہوگا۔ ایک مکان میرے نام ہوگا اور خرچہ علیحدہ---"

"منظور' شہزادی!--- آگے بول؟"

"تو شادی سے پہلے مجھے ہاتھ نہیں لگائے گا--- اور شراب چھوڑ دے گا۔"

اس نے گلاس زمین پہ دے مارا۔ "ایسی کی تیسی شراب دی--- یہ تو میری جان' تیرے غم کو بھلانے کے لئے پیتا ہوں--- آگے بول؟"

"آخری شرط یہ ہے کہ میرا نکاح درگاہ شریف میں ہوگا' سائیں مولا بخش سرکار میرا نکاح پڑھائیں گے۔ میرے گواہ بابا نورا اور بہن راحت جان کا خاوند ہوگا---" وہ راحت جان کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "یہ بہن کی طرح مجھے وداع کرے گی۔"

"بس کہ اور کچھ---؟"

"میرا نکاح آج ہی ہوگا--- درگاہ شریف پہلے سلام کروں گی' پھر نکاح کی رسم ہوگی۔ تم جانتے ہو کہ میں ہر جمعرات وہاں حاضری دیتی ہوں--- بس!"

"سب منظور--- اوئے' کھتے او۔ سارے آؤ' میینوں مبارکاں دیو---" وہ خوشی سے پاگل ہو گیا۔

راحت جان بولی۔ "ایک آخری شرط تو پوری ہو جائے گی لیکن باقی تین شرطوں کے لئے تو مہلت کی ضرورت ہے---"

شاہ دین نے ناگواری سے راحت جان کی طرف دیکھا اور آنکھ مارتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہاں' پہلے تین شرطیں پوری کرا لو پھر نکاح کریں گے--- مجھے اعتبار ہے' میں صبح ہی پہلے طلاق دیتا

ہوں اور دوسری شرطیں بھی پوری کرتا ہوں---"

شادو کہنے لگی۔ "اگر آپ کو مجھ پر اعتبار ہے تو مجھے بھی آپ پہ بھروسہ ہے--- نکاح آج کرو' باقی شرطیں بعد میں پوری کر لینا۔ میں بے نکاحی تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی---"

"ماشاء اللہ' کتنی اچھی بات کی ہے میری بہن شادو نے---" راحت جان نے لقمہ دیا۔

دوسرے لوگ بھی ہاتھوں میں گلاس تھامے ہونقوں کی مانند منہ پھاڑ کھولے اس بدلی ہوئی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"اوئے' سب کان کھول کر سن لو کہ آئندہ کوئی شراب نہیں پئے گا۔ یہ حرام ہے' یہ انسان کو حیوان بنا دیتی ہے--- پھینکو یہ گلاس' زمین پہ پھینکو اور مجھے مبارکیں دو--- جلدی جلدی تیاری کرو' آج میرا نکاح ہوگا---"

بابا نورا پیچھے کھڑا بیہوش سا لڑکھڑا کر گرنے والا تھا اور خدا جانے اس کی بوڑھی آنکھوں نے ابھی کیا کیا تماشے دیکھنے تھے؟--- راحت جان نے آگے بڑھ کر شادو کا منہ چوم لیا۔

"اٹھ میری بہن' نہا دھو' کپڑے بدل اور کچھ کھا پی--- دیکھ' میں تیرے لئے کیا کیا کرتی ہوں۔ تجھے اپنے ہاتھ سے دلہن بناؤں گی' سنگھاروں گی--- مجھے تو اپنی سگی بہن سمجھ---"

وہ اسے ساتھ لیتے ہوئے غسل خانے میں گھس گئی اور ادھر یہ سب مشورہ کرنے بیٹھ گئے۔ فتح یار کرداور نے اپنا خدشہ بیان کیا کہ ایسا نہ ہو' درگاہ شریف پہنچ کر یہ ہمارے لئے کوئی مصیبت کھڑی کر دے یا نکاح پڑھنے سے انکار کر دے۔ شاہ دین نے سرمستی میں ہلا کر اس کے خدشے کو رد کر دیا اور دلیل یہ دی کہ شادو اگر سچے دل سے راضی نہ ہوتی تو دنیا کی کوئی طاقت اس سے ہاں نہیں کروا سکتی تھی۔ میں اس کو اچھی طرح جانتا ہوں' وہ دھوکہ دینا یا ڈرامہ کرنا نہیں جانتی--- وہ بڑ ہانکنے لگا۔

"اصل میں وہ بھی مجھے چاہتی تھی' اب بھی چاہتی ہے لیکن بہن کی خاطر انکار کر رہی تھی کہ وہ برباد نہ ہو' اب جب میں نے اس کی بہن اور بچوں کے مستقبل کے لئے انتظام کرنے کا وعدہ کر لیا ہے تو وہ مطمئن ہو گئی ہے--- میں ذرا گاڑی لے کر گاؤں تک ہو آؤں تاکہ وہاں بھی حاضری لگ جائے۔ گاؤں والے اور گھر والے یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں شادو کو تلاش کرنے نکلا ہوا ہوں' نہ گیا تو شک ہو سکتا ہے لہٰذا تم سب تیاری مکمل کرو--- میں کچھ زیور اور روپے بھی لیتا آؤں گا۔"

شادو ابھی غسل خانے میں ہی تھی۔ اس نے راحت جان اور بابا خورشید کو بلا کر تمام پروگرام سمجھایا' سہاگ رات کے لئے کمرہ تیار کرنے کی ہدایت کی' بابے نورے کو پورا پورا خیال رکھنے کی تاکید کی۔

ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد فتح یار اور وہ چھاؤنی والی پلی کو پار کر رہے تھے۔

گھر جب قدم رکھا تو پانچ سات عورتیں اب بھی اس کی بیوی کے پاس بیٹھی تھیں۔ اس کو گھر داخل

ہوتے دیکھ کر کچھ مرد بھی اندر آ گئے۔ وہ تھکا ہارا سا' حقہ لے کر چارپائی پہ بیٹھ گیا۔

"کچھ پتہ چلا شادو دین۔۔۔؟" ایک بزرگ نے بڑی تشویش سے پوچھا۔

"چاچا!۔۔۔ کیا بتاؤں؟" وہ قدرے اونچا بول رہا تھا تاکہ عورتیں' خاص طور پہ اس کی بیوی بھی سنے۔ "کس سے پوچھوں' پوچھتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔۔۔ صبح سے خوار ہو رہا ہوں مگر کچھ پتہ نہیں چلا' صرف ایک ریڑھے والے نے بتایا کہ پہلی بس پہ ایک لڑکی اور لڑکا سوار ہوئے ہیں۔۔۔"

ایک عورت نے وہیں سے ہانک لگائی۔ "میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ کسی موٹر سائیکل والے کے ساتھ گئی ہے۔"

اس کی بیوی نے اس کے سامنے کھانا لا کر رکھا' وہ بے دلی سے نوالے توڑنے لگا۔ کچھ اور لوگ بھی آ گئے۔۔۔ کافی دیر بعد وہ اٹھا اور بیوی کو اشارے سے اندر بلایا۔

"میں نے پولیس میں بھی رپورٹ لکھوا دی ہے مگر کسی سے ذکر نہ کرنا۔۔۔ تم زیوروں کا کہہ رہی تھیں' کیا کیا لے گئی ہے؟"

"دو چھاپاں مندریاں نے اک تکہ۔۔۔" وہ یاد کرتے ہوئے بتانے لگی۔

"باقی زیور تو سنبھالا ہوا ہے نا؟۔۔۔ دیکھ' میں نے زیور کا بھی بتایا ہے کہ سارا ساتھ لے گئی ہے' شاید پولیس آئے' کوئی گھر تلاشی لے۔۔۔ باقی کا زیور بھی مجھے نکال دے۔ میں شہر جا رہا ہوں' وہاں رکھوا دوں گا۔ پولیس والوں نے مجھے پھر وہاں بیان دینے کے لئے بلوایا ہے۔۔۔ مجھے تو شک یار چند دے شوکت پہ ہے۔ تم اسے نہیں جانتیں' بڑا لوفر ہے۔ اسی کی موٹر سائیکل کا گھر املا ہے لیکن تم بالکل کسی سے ذکر نہ کرنا' اچھا۔۔۔ مجھے شاید شہر تھانے میں دیر ہو جائے' فکر نہ کرنا۔ میرے ساتھ فتح یار' ایک دو اور آدمی بھی ہیں۔ تمہیں پتہ ہے ایسے کاموں میں یانہ بازو ہی کام آتے ہیں اور پیسے بھی دے' پولیس کا کوئی بھروسہ نہیں۔۔۔ جلدی کر' اب نماز بھی پڑھنی ہے۔۔۔"

❂❂

ادھر بھی نماز ہو چکی تھی۔۔۔ شاہ مراد نے سورہ یوسف کھول لی۔ آج اس کا انہماک اور خشوع دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا' وہ "رانجھا رانجھا کہندی نی میں آپے ہی رانجھا ہوئی" کی تصویر بنا ہوا' اللہ جانے کتنی بار پڑھ چکا تھا۔ چاہت کے چاہ کنعان میں ڈوبا ہوا یہ یوسف ثانی کسی قافلہ فیض کا منتظر تھا۔ پھر جیسے بازار مصر لگا ہوا ہو اور اسے بکنے کے لئے کہیں کھڑا کر دیا گیا ہو۔۔۔ بولی پہ بولی' نظر پہ نظر۔۔۔ آگے بڑھ کر کسی دل والی نے اس کو محض ایک معمولی کالے سوت کی ڈوری کے عوض خریدنا چاہا ہو اور بکنے والا محض اس کی سادگی اور جذب صادق پہ صاد کرتے ہوئے اپنے طور پہ بک چکا ہو۔۔۔ سائیں مراد تک شادو کے غائب ہونے کی خبر پہنچ تو چکی تھی لیکن اس وقت تک وہ یہ جان نہیں سکا تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے اور وہ اکیلی گئی ہے یا کسی کے ساتھ بھاگی یا بھگائی گئی ہے؟ شاہ مراد بے وہ مطمئن تھا۔ صبح سے اس کے چھوڑے ہوئے کارندے اس کے متعلق پل پل کی خبر پہنچا رہے تھے' ہر آنے جانے والی پہ اس کی نظر تھی۔ اسے یقین تھا کہ شادو ضرور آئے گی یا اس کے متعلق کوئی اچھی بری خبر ضرور اس تک پہنچ جائے گی۔ اس کے ذرائع اور وسائل درگاہ شریف یا اپنے دھندے کے دائرے تک تو بے شمار تھے لیکن شہر کے اردگرد پھیلے ہوئے دیہاتوں تک اس کی رسائی یا کسی قسم کی کوئی مداخلت ممکن نہ تھی۔ وہ مجبور محض ہو کر وقت کے سمندر میں کسی تنکے کا سہارا تلاش کر رہا تھا' سوچ رہا تھا کہ شادو نے اسے ہر محاذ پہ شکست دی ہے۔ پہلے دن سے آج تک وہ اس کے لئے لاینحل مسائل پیدا کرتی رہی ہے' شاید اس کے ستارے ہی اس سے نہیں ملتے۔ اس نے سوچا بھی کہ اسے بھول جائے' اس کا خیال دل سے نکال دے۔ اسے تو ایسی باتوں پہ توجہ ہی نہیں دینی چاہئے اور خاص طور پر یہ دیہاتی اور یہ لوگ' ان کے ذاتی مسائل اور جھگڑے تو گاؤں کی چوپالوں اور پنچایتوں میں ہی حل ہوتے ہیں' یہ کسی دوسرے کی مداخلت برداشت نہیں کرتے۔۔۔ اسے یاد آیا کہ آج سے پچیس چھبیس برس پہلے علاقہ غیر میں وہ ایک دوست کے پاس مفروری اور مجبوری کے دن کاٹ رہا تھا' ایک روز چند عورتیں' مرد اور بچے مختلف علاقوں سے اغواء کر کے لائے گئے۔ ان عورتوں میں ایک عورت بہت خوبصورت اور عمر میں اس سے کافی بڑی تھی۔ پنجاب کی رہنے والی اس عورت کو بری امام کے میلے سے اغواء کیا گیا تھا۔ ان کے وارثوں کو اطلاع دے دی گئی' چند لوگ آئے اور تاوان کی رقم ادا کر کے اپنے اپنے بندے ساتھ لے گئے مگر دو بچے' ایک بوڑھا سا تاجر اور یہ عورت باقی رہ گئے۔ خاموش' چپ چپ سی یہ عورت بڑی صابر اور خدمت گزار تھی۔ دو تین مہینوں کے بعد اس عورت کا ایک گاہک آیا لیکن اک معمولی سی رقم کے فرق پہ یہ سودا طے نہ ہو سکا۔ پھر خدا جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ اس نے منہ مانگی رقم کے عوض اسے حاصل کر لیا۔ اس کے دوست نے مذاق اڑایا کہ اسے لے کر کیا کرو گے' یہ تو عمر میں کافی بڑی ہے لیکن یہ عورت اسے اچھی لگی۔ وہ بھی اسے پسند کرتی تھی۔ پھر چھ سات مہینے ایک ساتھ رہنے کے باوجود اس عورت نے اپنے بارے میں کچھ نہ بتایا لیکن اس کی خدمت گزاری اور عزت میں کوئی کمی نہ رکھتی تھی۔ ایک دن اس نے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ یہ خبر اس پہ پہاڑ بن کر ٹوٹی' وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان حالات میں کسی بچے کا باپ بنے۔ اس نے عورت سے کہا کہ میں خود غیر محفوظ ہوں' گھر بار نہیں بسا سکتا۔ تم اگر چاہو تو میں تمہیں' تمہارے وارثوں تک پہنچا آتا ہوں۔ تم نے میری بہت خدمت کی ہے' میں بہت خوش ہوں لیکن سردست میں اس سے زیادہ تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ تھوڑی سی ردوکد کے بعد وہ عورت راضی ہو گئی اور مناسب موقع پاتے ہی وہ اسے اپنے ساتھ چک لالہ لے آیا۔ اس کا خاوند وہاں کسی سرکاری عمارت میں مالی تھا۔ سیدھا سادا دیہاتی اپنی بیوی کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ مولا بخش نے انتہائی صاف گوئی سے تمام

حالات سے اسے آگاہ کیا' عورت نے بھی اس کے حسن سلوک کی تعریف کی۔ اس کے مرد نے بتایا کہ وہ اپنے حالات کے پیش نظر تاوان کی رقم ادا کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اپنی عزت کے خوف سے اس نے اپنی بیوی کی گمشدگی کے متعلق بھی کسی سے ذکر نہیں کیا۔ وہ اس کا انتہائی ممنون ہوا اور کہنے لگا کہ وہ اس تمام واقعہ کو فراموش کرکے نئے سرے سے زندگی کی شروعات کرے گا اور پیدا ہونے والے بچے کو اپنا سمجھے گا۔ سائیں مولا بخش نے ایک اچھی خاصی رقم اس کی پہلے سے موجود بچی کے ہاتھ رکھتے ہوئے وہاں سے رخصت لی۔۔۔ آج وہ پھر ایک دیہاتی لڑکی کے معاملے میں پھنسا ہوا تھا اور اس کے اچھے برے انجام سے بھی بے خبر تھا۔ اس نے اپنے تئیں ارادہ کرلیا کہ وہ اب شادو کے معاملے میں قطعی دلچسپی نہیں لے گا اور ایسے میں ہی اس کا ایک کارندہ پاس آگیا' یہ شاہ مراد کی جاسوسی پہ مقرر تھا۔

"سائیں جی! مجھے آپ نے کس مصیبت میں پھنسا دیا ہے؟۔۔۔ وہ فوجی تو قرآن شریف کو ہی نہیں چھوڑتا' کھاتا ہے اور نہ پیتا ہے' پتہ نہیں کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔ میں تو مسجد میں بیٹھے بیٹھے اوازار ہو گیا ہوں' کچھ نشے پانی کی اجازت دیں؟"

سائیں مولا بخش لگاتار اپنے معتقدوں کو بھی بھگتاتا رہا تھا اور اپنی سوچوں کے سپولیوں سے ڈنگ بھی کھاتا رہا تھا۔۔۔ یہ شاہ مراد تو ایک اژدھا بن کر اس کے سامنے پھنکار رہا تھا' وہ شدید قسم کی اندرونی بیرونی شکست و ریخت کا شکار ہو چکا تھا۔

اسے سامنے سے تاجا مخبر آتا دکھائی دیا' شاید وہ بھی کسی شکار کی تلاش میں تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں سلام دعا ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو گئی' ایسی چمک جو ڈوبنے والے کی آنکھوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اپنی جگہ ایک کارندہ کھڑا کرکے جلدی سے اس کے پاس آگیا۔

"سناؤ سرکاراں' کدھر راؤنڈ لگا رہے ہو۔۔۔؟" وہ تاجے مخبر کے کاندھے پہ بے تکلفی سے ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"جہاں آپ کی بادشاہی ہو' وہاں ہمارے جیسے خدمت گزار بھی تو ہوتے ہیں۔۔۔"

اس نے مکارانہ خوشامد سے جواب دیا اور دونوں ہنسنے لگے۔

"آؤ یار تاج دین! ڈیرے پہ چل کر ذرا تازہ دم ہوتے ہیں۔۔۔"

دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اوپر سیڑھیوں تک آگئے۔ یہاں پہنچ کر وہ ٹھہر گیا' کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"۔۔۔ ذرا مسجد کی طرف چلتے ہیں۔"

شاہ مراد دور سے ہی نظر آگیا۔

"تاج دین! وہ دیکھو' ایک جوان قرآن شریف کی تلاوت کر رہا ہے۔۔۔ ذرا قریب جا کر اس کے

درشن کر آؤ۔"

"کون ہے۔۔۔؟" وہ اپنے پیشہ ورانہ تجسس کے تحت پوچھنے لگا۔

"پہلے جا کر اس کو دیکھ لو' پوری بات پھر بتاؤں گا۔۔۔"

وہ اس کے آس پاس چکر لگا کر واپس آگیا۔

"اب چلو' ڈیرے پہ بیٹھ کر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔۔۔"

سائیں مولا بخش اس کو ساتھ لے کر ڈیرے پہنچ گیا۔ نشے پانی کے بندوبست کا حکم دے کر منہ ہاتھ دھونے بیٹھ گیا' اس سے فارغ ہوا تو بولا۔

"تاج دین! یہ ایک فوجی ہے' شاہ مراد اس کا نام ہے لیکن ہے آدمی دکھری ٹائپ کا۔۔۔" وہ خود ہی تشریح کرنے لگا۔ "میرا مطلب ہے کہ بندہ ذرا ہی دار اور ہٹیلا ہے' پڑھا لکھا اور بازو زور والا بھی ہے۔ ایک لڑکی شادو کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔۔۔"

پھر آگے پیچھے کی ساری کہانی اسے سنا دی۔ اس دوران دونوں پوری طرح پر ہو چکے تھے۔ سامنے مرغی کی بچی ہوئی ہڈیاں' روٹی کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ تاجا مخبر اب اٹھنے کے لئے پر تول رہا تھا۔ مولا بخش نے باج کے پانچ سو روپے اور اس کام کے چھ سو روپے اس کی جیب میں ٹھونس دیئے اور پورا کام اس تاکید کے ساتھ سمجھا دیا کہ آدمی سرکاری ہے اور ہتھ چھٹ بھی ہے' ذرا خیال رہے۔

"میرے مولا' فکر ہی نہ کرو۔ میرے آدمی چوبیس گھنٹے اس کے آگے پیچھے ہوں گے۔۔۔ پھوپی دائی اور سرداراں جوکاں والی' دونوں کی ڈیوٹی عورتوں پہ لگ جائے گی لیکن شادو کا حلیہ ذرا سمجھ میں نہیں آیا' یہ دیہاتنیں سب ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔۔۔"

وہ اب بات کرنے کے قابل نہیں تھا' سائیں مولا بخش اس کو ساتھ لے کر واپس اپنے اڈے پہ آگیا' مگر واپسی پہ وہ شاہ مراد پہ ایک نظر ڈالنا نہیں بھولا تھا جو ہنوز تلاوت میں مگن تھا۔ ترو تازہ' شاداں و فرحاں جیسے وہ قرآن شریف کے سمندر کی تہہ سے صدف نایاب نکال کر دم لے گا۔ اس کا فولادی عزم و استقلال اور یقین کی پختگی دیکھ کر مولا بخش کے ماتھے پہ پسینہ آگیا اور یونہی خیال آیا کہ شاہ مراد نے تو اپنا وسیلہ علیم و خبیر کو بنایا اور اس نے ایک لعین و خبیث کو' کچی ڈوریاں وہ دیتا ہے اور کچے بندھنوں میں ڈوبے بندھ جاتے ہیں' منکے وہ باندھتا ہے اور من دوسروں کے بندھ جاتے ہیں' دعائیں وہ دیتا ہے اور درد کی دولت دوسروں کو نصیب ہو جاتی ہے۔ سورہ یوسف سے فالیں وہ نکالتا ہے اور نکلتا کسی اور گلی نکل جاتی ہے' چلے وہ کھینچتا ہے مگر چاندنی کہیں کھلی ہوتی ہے' نیازیں ادھر ہوتی ہیں اور نظریں کہیں اور ہوتی ہیں' نشہ ادھر ہوتا ہے اور خمار کہیں اور چڑھتا ہے۔۔۔ وہ جھنجلا کر اپنی کنپٹیوں پہ مٹھیاں برسانے لگا۔۔۔ شاہ مراد۔۔۔ شاہ مراد۔۔۔ وہ سر جھکائے مراقبے میں چلا گیا۔

◆◆

شادو کا صندلی سراپا اس کے سامنے تھا' اس کی باجرے کے سٹے جیسی جوانی کا تصور اسے مدہوش کیے ہوئے تھا اور آنے والے لمحات کی رنگینیوں' شوق وصال کی بے تابیوں میں جل تھل وہ ایسی تیاریاں تو ساری تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ مردوں نے الگ بیٹھک میں محفل جمائی ہوئی تھی' تاش اور بوتل کھلی ہوئی تھی' سب کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔ پھول' ہار' چھوارے' مٹھائی' سب تیاری تھی اور اندر کمرے میں راحت جاں دلہن کو تیار کر رہی تھی۔ اس نے اندر داخل ہونا چاہا تو راحت جاں نے اپنا حق استعمال کرتے ہوئے کہا۔

"چوہدری صاحب! صبر اور شرم کریں--- فی الحال زیور مجھے دیں۔"

اس نے شرماتے ہوئے زیور کی پوٹلی اسے تھمادی اور بیٹھک میں بیٹھتے ہی باؤ خورشید نے گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

"اوئے یارو! کم از کم آج کے دن تو پرہیز کرو' شرط کے مطابق ہم نے وعدہ لیا ہے کہ شراب نہیں پئیں گے اور تم لوگ---"

فتح یار گرداور گلاس چومتے ہوئے بولا۔ "شادی اور شرطیں تمہاری ہیں' ہماری نہیں اور آج تو ہمارے یار کی شادی ہے۔ اس موقع پہ نہیں پئیں گے تو کیا تیرے قلاں تے پیاں گے--- لے' دو گھٹ توں وی پی---" زبردستی اس کو بھی پلا دی اور پھر بولا۔ "چوہدری' پیو گے تو مزا پاؤ گے--- پڑھنے والا نکاح تو تیرا ایک ہو چکا ہوا ہے۔"

اس بات پہ قہقہوں کا ایک طوفان امڈ پڑا۔

تھوڑی دیر بعد راحت جاں اندر داخل ہوئی' پیچھے پیچھے بابا نورا بھی اندر آ گیا--- آج راحت جاں کے رنگ بھی دیکھنے والے تھے جیسے شادو کی نہیں' اس کی شادی ہونے والی ہے۔ بابے نورے کی بے رنگی بھی ملاحظہ کرنے والی تھی۔ سفید لٹھے سی رنگت' اجڑی اجڑی بے نور سی آنکھیں' وہ وہیں دروازے کے پاس زمین پہ بیٹھ گیا۔ فتح یار گرداور' راحت جان کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"واہ' واہ--- آج تے بھابی ظلم ایڈاں ناں وی سوہنی لگدی اے---"

وہ ٹھنک کر بولی۔ "چھوڑو ان باتوں کو' کوئی کام کی بات بھی کرو--- شادو تیار ہے' سامان بھی تیار ہے۔ اب کیا پروگرام ہے---؟"

فتح یار گرداور بہکتے ہوئے بولا۔ "روٹی وی تیار اے' وہٹی وی تیار اے' ساڈی گھوڑی وی تیار اے--- یعنی میری گاڑی' کوئی اور مطلب نہیں---"

باؤ خورشید جلدی سے راحت جاں کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔

"ساڈی سوہنی وی تیار اے---" پھر اسے پاس بٹھا کر اپنا گلاس اس کے سرخی سے لتھڑے ہونٹوں کے قریب لا کر التجا بھرے لہجے سے کہنے لگا۔ "میری جان دی سوں' اج میرے یار دی خوشی تے صرف اک گھٹ---"

مصنوعی غصے کا اظہار کرتی ہوئی وہ پورا گلاس چڑھا گئی اور تلخی سے ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولی۔

"باؤ' تینوں وی میری جان دی سوں--- اگے توں اپنی جان دی سوں نہ پائیں۔ اے تے دو گھٹ کوڑا پانی اے' میں تے زہر دا سمندر وی پی جاواں---"

"ٹھکے بھی ٹھکے---" وہ تحسین طلب نگاہوں سے دوسروں کی جانب دیکھنے لگا۔

"عورت ہو تو ایسی' جواب سن کے مزا آ گیا ہے--- لیکن مزا نہیں آیا۔" فتح یار گرداور بولا۔

"کی مطلب--- مزا آیا' مزا نہیں آیا؟" راحت جان سرور سے ہلکورے لیتی ہوئی پوچھنے لگی۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "مزا اس لئے نہیں آیا کہ اس کمرے میں ایک آدمی اور بھی موجود ہے' اسے بھی تو اپنے موج میلے میں شامل کرو---"

"او کون اے؟" راحت جان نے پوچھا۔

"او' بابا نورا--- اوئے ویکھو تے سہی' ہے کہ گزر گیا؟"

بابا نورا کمرے میں تو کیا جیسے اس دنیا میں ہی نہیں تھا۔ فرش پہ یوں بیٹھا تھا جیسے تھانے والے جیب کتروں کو بٹھاتے ہیں' اکڑوں' پاؤں پہ بیٹھا روز حشر کا انتظار کرتا ہوا--- اس نے یہ گفتگو سنی یا نہیں' یا پھر وہ اس مقام سے گزر چکا تھا جہاں سود و زیاں کا احساس باقی رہتا ہے۔

"اوئے' بابا نورے---!" شاہ دین پٹواری نے ترنگ میں آ کر ہانک لگائی۔

"ہوں---" وہ ہڑبڑا کر اس منڈلی کی جانب دیکھنے لگا۔

"ادھر آ---" یہ بھی شاہ دین پٹواری تھا۔ بابا نورا بڑی دقت سے اٹھا' اس کے جوڑوں سے کڑاکوں کی آواز سب نے سنی۔ "لے' یہ دو گھونٹ تو بھی پی لے--- کھٹی لسی تے توں بڑی پیتی ہوئے گی' اج کوڑا پانی وی پی کے دیکھ--- اوئے' مڑ جوان ہو جاویں گا۔"

بابے نورے نے کانپتے ہاتھوں سے گلاس ہونٹوں سے لگا کر خالی کر دیا۔ شاید اسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کیا پی رہا ہے' نہ ہی پینے کے بعد کوئی رد عمل ظاہر ہوا۔ وہ واپس اسی جگہ جا بیٹھا۔

"لے بھئی' بابا تے ساڈے توں وی ود نکلیا---" شاہ دین پٹواری نے انکشاف کیا۔

"چوہدری صاحب! اے بابا میرا کما اے' کی ہویا جے بڈھا اے' ہے تے مرد نا! بھابی دے سامنے میری نک تے نہیں سی وڈہا سکدا---"

راحت جان' دوسرا گلاس ختم کر چکی تھی' اس نے اٹھ کر ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا اور باقاعدہ ناچنے کے

انداز میں کھڑی ہو گئی' کہنے لگی۔

"آج کے پروگرام کی آخری آئٹم شروع کرنے سے پہلے میں اک گل کرنی چاہنی آں--- کراں یا نہ کراں؟"

"کرو' کرو--- لکھاں گلاں کرو۔"

"گل اے وے کہ وہٹی بی نوں وی دو گھٹ پاؤ--- جس کی شادی ہے وہ کیوں پیاسی رہے؟"

"بالکل ٹھیک' بالکل ٹھیک---" گویا شاہ دین پٹواری نے اجازت دے دی۔ "لیکن صرف دو گھٹ' زیادہ بالکل نہیں---"

پھر شاہ دین پٹواری خود گلاس لے کر اندر جانے لگا۔

"نہیں' نہیں--- تم اندر نہیں جا سکتے' ابھی شادی نہیں ہوئی--- میں خود جا کر وہٹی بی کو پلاؤں گی۔"

وہ گلاس لے کر اندر چلی گئی' شادو وہیں سو گئی تھی۔ اسے جگایا' گلاس ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس سے پیشتر کہ وہ کچھ محسوس کرتی' گلاس خالی ہو چکا تھا۔

رات کا پہلا پہر جیسے تیسے گزر گیا۔ کھاپی' نہا دھو اور کپڑے بدل کر سب تیار تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ راحت جان اور شاہ دین پٹواری اندر جا کر شادو کو سلام کروائیں گے اور باقی لوگ باہر گاڑی میں انتظار کریں گے۔ باؤ خورشید' فتح یار گردادر' سائیں مولا بخش سے بات کریں گے اور اسے نکاح کے موقع پہ شریک ہونے کی دعوت دیں گے۔ چونکہ وہ اس سے واقف نہ تھے' یہی خیال تھا کہ وہ ایک عام سا خیرات لینے والا سائیں ہوگا' سو پچاس نذر نیاز دے دلا کر اپنا کام نکال لیں گے۔ بابے نورے کو لڑکی کا وارث ظاہر کیا جائے گا' باقی لوگ گواہ رہیں گے اور راحت جان بڑی بہن کا رول ادا کرے گی۔ ایک خاص مولوی کا انتظام باؤ خورشید نے پہلے ہی کر رکھا تھا۔ نکاح کے بعد شب بسری کا انتظام بھی مکمل تھا--- صبح سویرے شاہ دین پٹواری گاؤں چلا جائے گا' شادو فی الحال یہیں پہ رہے گی اور بعد میں حالات کی مناسبت سے دیکھا جائے گا۔

●●

تاجے مخبر کے آدمی آنے جانے والوں پہ نظر رکھے ہوئے تھے' عورتوں کے مخصوص حصے میں بھی دو عورتیں متعین تھیں۔ سائیں مولا ذرا کر سید ھی کرنے کی غرض سے اپنے ڈیرے' نشہ پانی سے پرباش لیٹا ہوا تھا۔ سارا دن وہ اسی ادھیڑ بن میں پریشان رہا' اسے شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ پتہ نہ کچھ ضرور ہونے والا ہے--- کیا ہونے والا ہے؟ وہ اس سے بے خبر تھا۔ بظاہر وہ اپنے ساتھ کئے ہوئے وعدے پہ ڈٹا ہوا نظر آتا تھا کہ شادو کے معاملے میں قطعی کوئی دلچسپی نہیں لے گا مگر یہ فیصلہ تو اس کے دماغ کا تھا اور دل

تو دل ہے' بادشاہ! اس کا تو عقل سے اینٹ کتے والا بیر ہے' اس کی اپنی الگ ڈگر ہے۔ اس ڈگر پہ چلتے ہوئے یہ راستے کے پتھروں' کانٹوں اور سختیوں کو پھول سمجھ کر چوم لیتا ہے۔ وہ دل اور دماغ کی اس جنگ میں تھکا ہارا' چور چور' کروٹوں پہ کروٹیں بدلتا رہا۔ خرمن دل پہ شادو کی یاد بجلی بن کر گر رہی تھی' ساتھ ہی دماغ پہ شاہ مراد کے عزم و یقین اور استقامت کے چھینٹے دیتے ہوئے بادل بھاری ژالہ باری کر رہے تھے کہ تبھی تاجا مخبر ہانپتا اندر داخل ہوا۔

"اٹھ بادشاہ! شہزادی آگئی--- جلدی کر یار!--- اٹھ---"

دونوں بھاگے بھاگے درگاہ شریف آگئے۔ صدر دروازے کے پاس ان کی گاڑی کھڑی تھی۔ باہر پھولوں والی دوکان سے وہ پھول اور چادر وغیرہ خرید رہے تھے اور شادو ایک بڑی سی چادر میں لپٹی ہوئی بے سدھ سی دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ راحت جاں اس کے ساتھ تھی' شاہ دین پٹواری پاس کھڑا باتیں کر رہا تھا اور باقی لوگ دوکان پہ خریداری میں مصروف تھے--- سائیں مولا بخش پوری صورت حال کو ایک نظر میں بھانپ گیا' تاجے مخبر کو مزید ہدایات دے کر اس نے اسے اندر درگاہ شریف کی جانب روانہ کر دیا اور خود اپنے اڈے پہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی عقابی نظریں اردگرد نگرانی پہ مقرر تاجے مخبر کے کارندوں کو پہچان رہی تھیں۔ اپنی جگہ کھڑے ہوتے ہی اس نے "حق اللہ' سچ اللہ" کی جھلی ماری۔ وہ اب ان کو اپنی جانب آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ قریب پہنچتے ہی شادو اس کے قدموں میں بیٹھ گئی اور سائیں مولا بخش' کمال بے نیازی سے اپنے قدموں پہ استادہ تھا۔ شاہ دین پٹواری' راحت جان اور باؤ خورشید نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ دست بوسی کے بعد شاہ دین پٹواری بڑی لجاجت اور آہستگی سے عرض کرنے لگا۔

"موتیاں والیو' ہم ذرا تنہائی میں کچھ کہنا چاہتے ہیں---"

سائیں مولا بخش کیا جواب دیتا؟--- اس کے پاؤں کے نیچے صندل کا برادہ سلگ رہا تھا جس کی اٹھتی ہوئی مسحور کن لپٹوں نے اس کے سارے اعصاب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور جسم کا سارا خون پاؤں میں جا کر جمع ہو گیا تھا۔ دل سینے سے اتر کر اس کے قدموں میں ترازو ہو گیا تھا اور دماغ جیسے پگھل کر قطرہ قطرہ نیچے ٹپک رہا تھا--- وہ حسب معمول مراقبے کی کیفیت میں تھا۔

"اللہ دے بندیو---!"

راحت جان نے خاموشی کو توڑنا چاہا لیکن ایک ملنگ نے اشارے سے منع کر دیا۔ سائیں مولا بخش مراقبے سے نکل کر ذرا پرے قبروں کے پاس ایک خالی جگہ پہ جا بیٹھا اور ہاتھ کی جنبش سے پاس آنے کا اشارہ دیا۔ راحت جان نے شادو کو سہارا دے کر اٹھایا اور پھر سب اس کے قریب حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔ شادو اب بھی خاموش' ٹکر ٹکر سائیں مولا بخش کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی حالت اور بجھے بجھے چہرے پہ غنودگی کا غبار دیکھ کر سائیں مولا بخش کو جاننے میں دیر نہ لگی کہ وہ مکمل طور پر اپنے ہوش و حواس میں

نہیں ہے۔ چادر کے نیچے سرخ رنگ کا عروسی جوڑا' زیورات' بناؤ سنگھار اور راحت جان کے کٹے ہوئے بال' چہرے پہ بے حیائی' تیز تیز حرکت کرتی ہوئی شرم و حجاب سے محروم آنکھیں' لباس کی تراش' بڑھے ہوئے پالش شدہ ناخن--- شاہ دین پٹواری کی بے قرار' مروت سے خالی اور ہوس سے بھری آنکھیں' نیا لباس' ہاتھ میں نئی سونے کی مندری' لال رومال' نئے جوتے' گلے میں ہار اور باؤ خورشید کا کردار اور قماش--- یہ سب کچھ وہ ایک نظر میں جان چکا تھا۔ ہر چیز آئینے کی طرح صاف اور روشن تھی۔ علم قیافہ اور انسانی نفسیات' خاص طور پہ مجرموں کی کمزوریوں اور دکھتی رگوں کا یہ ماہر اب پوری طرح ان سے نبٹنے کے لئے تیار تھا--- آنکھیں پھر بند ہو چکی تھیں' ڈر تھا کہ کہیں پھر غوطہ زن نہ ہو جائے لہٰذا ہاتھ جوڑ کر شاہ دین پٹواری عرض گزار ہوا۔

"موتیاں والیو! اج ساڈے پلے دی پاؤ' اسی تہاڈے قدماں وچ خیر لین لئی بیٹھے آں---"

"حق اللہ' یج اللہ--- خیراں ہی خیراں' مہراں ہی مہراں--- بول چوہدری' فقیر سے کیا کام آپڑا ہے۔ ہم گنہگار تیرے لئے کیا کر سکتے ہیں؟"

"اللہ والیو' گنہگار تو ہم ہیں جو آپ کے دوارے آئے ہیں۔" پھر وہ شادو کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "آج ہم نکاح کرنے والے ہیں اور چونکہ میری ہونے والی بیوی آپ کی ماننے والی ہے اس لئے آپ کی اجازت' دعا' برکتوں کے لئے حاضری دی ہے---"

وہ کپڑوں کا ایک جوڑا اور نوٹوں کی گڈی پیش کرتے ہوئے خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا--- راحت جان بھلا چپ کیسے رہتی۔

"سائیں جی' ان دونوں کے لئے دعا کریں--- اللہ ان کو رنگ بھاگ لگائے۔"

"رنگ ہی رنگ لگیں گے' دعائیں قبول ہوں گی--- برکتیں ہوں گی' رحمتیں ہی رحمتیں--- جاؤ اندر جاؤ۔ اس کرماں والے' عزتاں والے سے مانگو۔ میں تو اس کے در کا کتا ہوں' دروازے پہ بیٹھا' تھاں پلید کر رہا ہوں۔ جاؤ--- حق اللہ' یج اللہ---"

وہ سب الٹے پاؤں واپس آئے۔ اب وہ اندر سلام کے لئے جا رہے تھے۔ شادو اب بھی راحت جان کی گرفت میں تھی اور سائیں مولا بخش جان چکا تھا کہ شادو کسی نشے کے زیر اثر ہے' بلکہ یہ سب ہی نشے میں ہیں۔ ان کے جاتے ہی تاجا مخبر سامنے آگیا۔ مولا بخش اسے دیکھتے ہی کہنے لگا۔

"تاج دین! سب تیاری مکمل ہے نا---؟"

"سب کچھ مکمل ہے بادشاہو!--- لیکن وہ لوری اب مسجد سے باہر آگیا ہے' صحن میں شرین کے درخت کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ اپنا آدمی بھی وہیں ہے---"

"ٹھیک ہے' اس پہ نظر رکھو---" پھر مختلف ہدایات دینے کے بعد اس نے پوچھا۔ "سردارے کو سب سمجھا دیا ہے نا؟--- پھوجی دائی اور جوکاں والی کو کہنا کہ بڑی احتیاط اور سمجھداری سے کام کریں اور اپنے رضاکاروں اور صوفی دفتر والے کو بھی سب معاملہ سمجھا دینا---"

تاجے مخبر کے جاتے ہی وہ اپنے معتقدوں میں بظاہر مصروف ہو گیا۔

اوپر سیڑھیوں کے پاس ہی رضاکاروں نے ان کو روک لیا اور ادھر زنان خانے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے کہ بیبیاں ادھر چلی جائیں' جمعرات اور جمعہ کو یہ احتیاط برتی جاتی تھی۔ ان لوگوں نے ذرا ادھر ہٹ کر مشورہ کیا۔ پھر راحت جان بولی کہ تم دونوں سلام کے بعد یہیں صحن میں ہمارا انتظار کرو' میں شادو کو سلام کرا کے ادھر ہی آتی ہوں--- سردارا جیب کترا بھی سر پہ رومال باندھے مسکین سی صورت بنائے اپنے دو ساتھیوں سمیت ساتھ ساتھ تھا' دو تین رضاکار بھی آس پاس کھڑے ان پہ نظر رکھے ہوئے تھے۔ شاہ دین پٹواری اور باؤ خورشید باہر ہی سے سلام کرتے ہوئے ساتھ ہی صحن کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ روضہ مبارک کی دیوار کے سامنے یہاں کے مستقل واعظ مولوی بشیر احمد قصوری وعظ کر رہے تھے' اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ یہ دونوں ذرا ہٹ کر ماحول کا جائزہ لینے لگے۔ یکایک ان سامنے ایک آدمی بھاگتا ہوا آیا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ شاہ دین پٹواری نے فوراً آگے بڑھ کر اسے اٹھانا چاہا۔ اتنے میں دو تین رضاکار بھی آگئے اور بے تحاشا ڈنڈوں سے ان کی پٹائی کرنے لگے۔ لوگ اکٹھے ہو گئے' دھکم پیل شروع ہوئی' یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ کسی کی کچھ سمجھ نہ آیا' یہ کیا ہو رہا ہے؟--- پٹنے والا آہ و بکا کر رہا تھا اور اسی آہ و بکا میں ایک چیخ بھی شامل ہو گئی جس پہ کسی نے توجہ نہیں دی مگر شاہ دین کی جیب کے ساتھ بازو کے نیچے تھوڑا سا پیٹ بھی کٹ چکا تھا۔ یہ سردارے قصائی عرف سردارے دکھی پھاڑ کی بدنام زمانہ نہیں تو بدنام علاقہ کارروائی تھی۔ باؤ خورشید ہکا بکا اسے تھامے ہوئے زمین پہ بیٹھا تھا' کچھ اور ڈنڈوں والے بھی آگئے۔ لوگوں کو ادھر ادھر ہٹایا گیا' معلوم ہوا کہ کوئی جیب تراش اپنا کارنامہ دکھا گیا اور بلیڈ ذرا اوچھا پڑنے سے پیٹ کی کھال بھی کٹ گئی۔ شاہ دین پٹواری ہائے ہائے کر رہا تھا' نئی قمیض خون سے رنگین ہو رہی تھی۔ وہ پٹنے والا شخص کسی عورت سے چھیڑ خانی کر کے بھاگا تھا اور رضاکار اس کا پیچھا کر رہے تھے' اسی بھگدڑ میں یہ جیب کٹنے کی واردات بھی ہو گئی۔ شاہ دین پٹواری کو اٹھا کر نیچے انتظامیہ کے دفتر میں لایا گیا' باؤ خورشید اور پٹنے والا شخص بھی ساتھ تھا اور دو چار تماش بین ٹائپ لوگ بھی آگئے۔ قمیض اتاری تو دو اڑھائی انچ پیٹ کی کھال کٹی ہوئی تھی' خون بہہ رہا تھا۔ ایسے میں دو پولیس والے بھی کہیں سے نکل آئے اور اب کیس پولیس کے ہاتھ تھا۔ ساتھ آنے والے تماش بینوں میں شاہ مراد بھی شامل تھا جس کی آنکھوں کے سامنے یہ سارا ڈرامہ کھیلا گیا۔ شاہ دین پٹواری اور باؤ خورشید یہ بھول ہی چکے تھے کہ وہ کس مشن پہ یہاں آئے تھے' اچانک یاد آنے پہ شاہ دین نے باؤ خورشید سے کہا۔

"شادو اور راحت جان کہاں ہیں---؟"

باؤ خورشید نے جواب دیا۔ "میں تو تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔ وہ دونوں وہیں پہ انتظار کرتی ہوں گی۔"

شاہ مراد' شادو کا نام سن کر چونک اٹھا۔۔۔ اب پولیس والے میز پہ پڑے پستول کو دیکھ رہے تھے۔ ایک نے کہا۔

"چوہدری' یہ پستول تمہاری ملکیت ہے؟"

یہ سن کر دونوں چونک اٹھے' ایک دوجے کا منہ دیکھنے لگے۔

"جی نہیں' ہمارا نہیں ہے۔۔۔ ہمارا ایسے خطرناک ہتھیاروں سے کیا تعلق ہے جی؟"

شاہ دین پٹواری نے درد سے بے حال ہو کر جواب دیا۔ پولیس والا لمبی سی "ہوں" کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے تو تم دونوں مفرور ڈاکو لگتے ہو۔۔۔"

دوسرا سپاہی فالتو لوگوں کو باہر نکالتے ہوئے دفتر کے منشی سے کہنے لگا۔

"جلدی کرو صوفی جی' اسیں تھانے تے ہسپتال وی جانا اے۔۔۔"

صوفی عنایت جو ضابطہ کی کارروائی لکھ رہا تھا' بولا۔

"ہاں جی' آپ کا نام اور ولدیت' پتہ وغیرہ لکھوائیں۔۔۔"

انہوں نے اپنے نام پتے لکھوائے اور پھر شاہ دین ہاتھ جوڑتے ہوئے سپاہی سے کہنے لگا۔

"سنتری بادشاہ! ہم یہاں سلام کرنے آئے ہیں' کوئی ڈاکہ ڈالنے نہیں۔۔۔ میں علاقہ پٹواری ہوں' میرے پانچ ہزار روپے نکل گئے ہیں اور پیٹ الگ پھٹ گیا ہے۔۔۔ آپ یہ پستول کا مدعا ہم پہ کیوں ڈال رہے ہیں؟"

وہ ان تینوں کو چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"اے تے پتر' تجھے تھانے جا کر پتہ چلے گا کہ مدعا کیا ہوتا ہے۔۔۔ اگے لگو اوئے!"

سائیں مولا بخش ابھی تک لوگوں میں گھرا ہوا تھا۔ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے وہ اس قافلے کو دیکھ چکا تھا۔ پولیس والوں نے انہیں گریبانوں سے پکڑ رکھا تھا اور پستول بھی ایک پولیس والے کے گلے میں تھا۔ موقع کے دو گواہ رضاکار اور ڈیوٹی انچارج تھے۔ انجمن برائے بہبود زائرین کا صوفی عنایت اللہ بھی اپنے رجسٹر تھامے ساتھ تھا۔ اسے شاہ مراد بھی دوسرے تماشہ دیکھنے والوں میں نظر آیا۔ یہ لوگ سر جھکائے ہوئے اس کے سامنے سے گزر گئے۔ سامنے گاڑی بھی کھڑی تھی' فتح یار گرداور نے بھی انہیں اس حال میں دیکھ لیا تھا مگر اس کی نظریں شادو اور راحت جان کو تلاش کر رہی تھیں جو نظر نہیں آتی تھیں' اس نے جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور بھاگنے میں عافیت جانی۔ شاہ دین پٹواری اور باؤ خورشید

نے بھی اسے فرار ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ بابے نورے کی آنکھ بھی شور سن کر کھل گئی جو دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا' اسے خون آلودہ کپڑے نظر تو نہ آئے لیکن ان کا حال اور انجام اسے ضرور نظر آ رہا تھا اور نہیں نظر آ رہی تھی تو وہ شادو تھی یا راحت جان۔۔۔ ادھر نظر ڈالی تو گاڑی بھی غائب تھی۔ گھبرایا ہوا' دعائیں مانگتا ہوا اندر درگاہ شریف کی جانب چل دیا۔ شاہ مراد' پولیس اور ملزموں کو تھانے کو روانہ ہوتے دیکھ کر سائیں مولا بخش کو سلام کرنے آگے بڑھا اور دست بوسی کے بعد وہ خاموش کھڑا ہو گیا۔

"شاہ مراد! جاؤ' اس بوڑھے کو کھانا کھلاؤ۔ پھر اسے ساتھ لے کر میرے پاس آؤ۔۔۔" وہ بابے نورے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا جو آہستہ آہستہ دیوار کے ساتھ ساتھ درگاہ شریف کی جانب بڑھ رہا تھا۔

شادو اور راحت جان سلام کرنے کے بعد صحن کے اسی کونے پہ دروازے کے ساتھ انتظار کر رہی تھیں۔ شادو اسی نیم مدہوشی کے عالم میں قریب ہی دیوار کا سہارا لئے بیٹھی تھی۔۔۔ کہاں مر گئے یہ لوگ' راحت جان زیر لب بڑبڑائی۔۔۔ دو ایک رضاکار صحن میں خون گرنے والی جگہ صاف کر رہے تھے۔ پھر راحت جان کے پاس ہی کھڑی دو عورتیں زور زور سے باتیں کرنے لگیں۔

"کیا زمانہ آ گیا ہے بہن! ظالم لوگ ایسی پاک جگہوں پہ آ کے بھی ذلیل حرکتوں سے باز نہیں آتے۔۔۔ وچارے کا پیٹ بھی پھاڑ دیا' روپے بھی لے گئے۔ وہ دیکھو' صحن میں خون ہی خون تھا۔۔۔ توبہ!"

"کیا ہوا۔۔۔ کوئی لڑائی وغیرہ ہوئی ہے؟" راحت جان ٹھٹکی۔

"نہیں' کھیسہ کٹیا گیا اے۔ جیب کترے نے کھیسے نال ڈھڈ وی وڈ دتی اے۔۔۔ اللہ معافی' اے تکیا نہیں سی جاوندا۔۔۔"

"کون تھے وہ لوگ۔۔۔؟"

"پتہ نہیں بہن! نیچے دفتر لے گئے تھے' وہاں سے جا کر معلوم کر لو۔۔۔ دو آدمی تھے جو ان سے ایک کی مونچھیں تھیں اور سلیٹی رنگ کا۔۔۔"

راحت جان شادو کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "بہن! ذرا اس لڑکی کا خیال رکھنا' میں ابھی دفتر سے ہو کر آئی۔۔۔"

دفتر میں ایک نوجوان سالڑکا بیٹھا لنگر کے چاول کھا رہا تھا۔

"بھائی صاحب! یہاں ابھی ابھی دو آدمی آئے تھے جن کی جیب کٹ گئی تھی۔۔۔"

"ہاں بی بی جی! ان کو پولیس تھانے لے گئی ہے۔۔۔"

"بھائی' ان کے نام بتا سکتے ہو---؟"

وہ ایک رجسٹر نکال کر بتانے لگا۔ "ایک چوہدری شاہ دین ولد نواب دین عرف---"

"دوسرے کا نام---؟" وہ گھبرا کر جلدی سے پوچھنے لگی۔

"دوسرا--- ہاں' اس کا نام خورشید احمد ولد رشید احمد عرف---"

"اب وہ کس تھانے میں ہیں؟"

"بی بی جی! ٹنک منڈی والے تھانے گئے ہیں۔ ان سے پستول بھی برآمد ہوا ہے' کوئی ڈاکو لگتے تھے--- آپ کوئی اخبار رسالے والی ہیں؟" وہ اس کا فیشن' میک اپ اور بال دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں' میں اخبار والی ہوں--- یہ بتاؤ' زخمی ان میں کون ہوا ہے؟"

"جی' زخمی شاہ دین پٹواری ہوا ہے۔ اس کا آدھا پیٹ پھٹ گیا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے--- جی' اخبار میں میرا نام نہ دینا۔ مجھے تو اس کا بچنا مشکل نظر آتا ہے جی---!"

وہ باہر آ گئی--- بازی پلٹ چکی تھی۔ وہ شکر کر رہی تھی کہ وہ بھی ساتھ میں رگڑی نہیں گئی۔ اس کے مجرمانہ ذہن میں فوراً ایک خیال آیا--- شادو کا نہیں' شادو کو تو وہ درگاہ والے کے حوالے کر آئی تھی۔ وہ فوراً گھر جانا چاہتی تھی تاکہ جو کچھ بھی وہ اٹھا اور لے جا سکتی ہے' لے کر فوراً یہ شہر چھوڑ کر کہیں اور ٹھکانہ کر لے۔ اس نے سوچا کہ یہ دونوں پولیس کے چکر میں اب لمبے ہی پھنس چکے ہیں۔ شاہ دین پٹواری کی زندگی خطرے میں تھی' تھانے والے ان سے اور بھی سب کچھ اگلوا سکتے ہیں۔ اغواء بھی ثابت ہو جائے گا اور حبس بے جا بھی' دھوکہ' چوری' ناجائز اسلحہ--- وہ تیر کی سیدھ بھاگ کھڑی ہوئی۔ سائیں مولا بخش نے اسے بھی منہ چھپائے گزرتے دیکھ لیا تھا اور تاجا مخبر اس کے تعاقب میں تھا۔ سائیں مولا بخش کے پیچھے قبروں کی اوٹ میں شادو نیم دراز تھی اور وہی دو عورتیں پھوپھی دائی' سرداراں جو گلی والی اس کو کھانا پانی کھلا رہی تھیں--- ادھر بابا نورا شاہ مراد کے پاس بیٹھا کھانا کھاتے ہوئے شادو کی روداد الم رو رو کر سنا رہا تھا اور دور گاؤں میں شاہ دین کی بیوی بچے اس کا انتظار کرتے کرتے سو گئے تھے۔

● ●

چوہدری حق نواز انچارج تھانیدار' تھانے کے عین پیچھے اپنے چھوٹے سے گھر میں سویا ہوا تھا۔ چھوٹا تھانیدار ملک شیر علی دفتر میں محرر خادم حسین کے ساتھ چوری کی ایک تازہ واردات کے ملزموں کے بارے میں بات چیت کر رہا تھا جو باہر برآمدے کے فرش پہ بیٹھے اپنی اندرونی چوٹوں اور سر پہ کھڑے پولیس والوں سے معدوں پہ چیخ چلا رہے تھے۔ ان سے دس قدم ادھر' ایک کمرے میں باؤ خورشید ننگے فرش پر اکڑوں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے سامنے چارپائی پہ بیٹھا خوفناک مونچھوں والا ایک سپاہی سر کی مالش کروا رہا تھا۔ شاہ دین پٹواری سول ہسپتال میں سات عدد ٹانکے لگوانے کے بعد ایک بنچ پہ لیٹا اپنے نصیبوں کو رو رہا تھا۔ خون ضائع ہو جانے کی وجہ سے اسے خون لگانے کی ضرورت پیش آ گئی اور خون ٹیسٹ سے انکشاف ہوا کہ اس نے مقدار سے زیادہ شراب پی ہوئی ہے۔ نگران پولیس والے اسے خون خوار نظروں سے گھور رہے تھے اور وہ اپنے بازو' ہاتھ اور انگلی دیکھ رہا تھا جہاں ہتھکڑی اور خون والی نلکی لگی ہوئی تھی۔ انگلی میں موجود سونے کی انگوٹھی اب غائب تھی اور گھڑی تو درگاہ شریف میں ہی کہیں غائب ہو گئی تھی۔

تین ساڑھے تین گھنٹوں کے بعد جب یہ ملاحظہ رپورٹ لے کر تھانے داخل ہوئے تو چوہدری حق نواز نیند لینے کے بعد نہا دھو اور کھا پی کر واپس آ چکے تھے۔ دفتر میں چھوٹا تھانیدار' محرر' ہیڈ کانسٹیبل اور صوفی عنایت معہ دو رضاکار گواہوں کے موجود تھے۔ پستول اور اٹھارہ گولیاں بھی میز پہ دھری تھیں--- شاہ دین اور ایک سپاہی باہر برآمدے میں رک گئے' دوسرا سپاہی ملاحظہ رپورٹ لے کر اندر چلا گیا۔ چوہدری حق نواز نے رپورٹ پہ سرسری سی نظر ڈال کر ان لوگوں کو اندر لانے کا حکم دیا۔ باؤ خورشید کی حالت بہت بری تھی جیسے کسی مردے کو قبر سے کھینچ کر باہر نکالا ہو اور شاہ دین پٹواری بے چارہ تو دلہا بنتے بنتے پیٹ اور جیب پھڑوا بیٹھا تھا۔ وہ یوں اندر داخل ہوئے جیسے دو بھوکے پیاسے بکرے مذبح خانے میں دھکیلے جاتے ہیں--- چوہدری حق نواز کوئی دو منٹ انہیں گھورتا رہا۔

"تم میں شاہ دین کون ہے؟"

"جی' میں ہوں سرکار---"

تھانیدار نے اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔

"---اور تم خورشید احمد ہو؟"

"جی---" وہ نظر جھکاتے ہوئے بولا۔

"یہ پستول کس کا ہے؟" وہ پستول کو چھڑی سے آگے سرکاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"یہ پستول ہمارا نہیں ہے---" شاہ دین پٹواری پیٹ کے زخم پہ ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔

"تو پھر یہ میرے باپ کا ہے---؟" دھاڑتے ہوئے اس نے میز پہ چھڑی ماری۔ "اس سے پہلے کہ میں تم دونوں کی چمڑی ادھیڑوں' مجھے سچ سچ بتا دو کہ تم کس نیت سے درگاہ شریف آئے تھے--- اغواء' قتل یا کوئی اور واردات کرنے؟"

"تھانیدار جی! میں علاقہ پٹواری اور شریف آدمی ہوں' یہ میرا دوست باؤ خورشید' تحصیل میں انتقال اراضی کے دفتر میں کلرک ہے۔ ہم دونوں سلام کرنے کی غرض سے یہاں آتے رہتے ہیں۔ آج بھی ہم اسی غرض سے حاضر ہوئے تھے کہ کسی جیب کترے نے جیب کے ساتھ ساتھ میرا پیٹ بھی کھول دیا ہے' پورا پانچ ہزار روپیہ نکل گیا ہے---"

تھانیدار نے رپورٹ آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "تم شریف آدمی ہو اور شراب پی کے یہاں سلام

کرنے آئے' تمہاری جیب میں پانچ ہزار روپے تھے' تم پٹواری ہو اور یہ انتقال اراضی کے دفتر میں کلرک ہے--- انتقال تو تم دونوں کا یہاں ہوگا--- اوئے ملک شیر علی' اس کا ٹیسٹ کروایا ہے---؟" وہ چھڑی سے باؤ خورشید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"چوہدری صاحب' یہ بھی شرابی ہے۔ میں نے اس کا منہ سونگھا ہے--- ابھی ملاحظے کے لئے بھیج دیتے ہیں۔"

"جاؤ' ان کی ذرا خدمت خاطر کرو--- حوالات میں بند کردو' جب تک یہ پستول کے بارے میں اقبالی نہ ہوں--- اور فورا پارٹی تیار کرو' ان کے گھروں پہ چھاپہ مارو' ان کے گھر والوں کو بھی تھانے لے آؤ اور مجھے فورا رپورٹ کرو---"

دونوں دہاڑیں مار کر رونے لگے۔

"مائی باپ' شراب ہم نے ضرور پی ہے لیکن پستول ہمارا بالکل نہیں ہے۔ ہم سے غلطی ہوئی' ہمیں معاف کردیں۔ ہماری عزت خاک میں مل جائے گی---" یہ شادو دین تھا۔

"اوئے' اور کون کون تمہارے ساتھ ہے--- مجھے تو تم کوئی ڈکیت نظر آتے ہو۔"

اب باؤ خورشید بولا۔ "مائی باپ' ہمارے ساتھ اور کوئی نہیں--- شراب والی غلطی ضرور ہوئی ہے۔ جو چاہے' سزا دے لیں--- ہم پہلے ہی بہت ذلیل ہو چکے ہیں' اور بے عزت نہ کریں۔ چار لوگوں میں عزت ہے--- ہم ہر طرح کی خدمت کے لئے حاضر ہیں۔"

"بکواس بند کر اوئے' عزت دار الو--- شراب پی کر' پانچ ہزار جیب میں ڈالے' بھرے پستول کے ساتھ تم تماش بینی کرنے آئے تھے یا کوئی ڈاکہ' قتل کی واردات کرنے--- ذرا یہ تو بتاؤ کہ پانچ ہزار روپے کہاں سے لائے تھے' کدھر واردات کی تھی اور تمہارے ساتھ وہ دو عورتیں کون تھیں---؟"

"کون سی عورتیں جناب!--- ہمارے ساتھ تو کوئی نہیں تھا۔"

"یہ دونوں تمہارے باپ یہاں موجود ہیں---" وہ رضاکاروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ان دونوں کو دیکھو--- تمہارے ساتھ دو عورتیں تھیں' ان دونوں نے عورتوں کو زنانہ حصے کی جانب جانے کو کہا تھا--- کچھ یاد آیا یا یہ بھی پستول کی طرح غلط ہے---؟"

اب بازی بالکل ان کے ہاتھ سے نکل چکی تھی' وہ پوری طرح پولیس کے چنگل میں پھنس چکے تھے۔ تازہ گرم گرم چوری کا گڑ کھانے کے یہ شوقین چوہے اب پرانی گاڑھی راب میں گرے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔

"اوئے' خادم حسین!--- ذرا بلاؤ تو ان عورتوں کو---"

اگلے ہی لمحے راحت جان کے پیچھے پیچھے شادو اندر داخل ہوئی تو یہ تقریباً بے ہوش ہونے کے قریب

تھے۔

"یہ کیا لگتی ہیں تمہاری---؟"

دونوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

"بولو اوئے" یہ دونوں تمہاری کیا لگتی ہیں---؟"

اب تھانیدار اٹھ کر ان کے قریب آگیا۔ دونوں تھر تھر کانپنے لگے لیکن اب وہ خاموش تھے۔

"ان دونوں کو لے جاکر' الٹا لٹکا کر مرچوں کی دھونی دو اور اس کی شلوار میں چوہے ڈال دو جب یہ تینوں زبان کھولنے پہ راضی ہو جائیں تو میرے پاس لے آنا--- خادم حسین! اس لڑکی اور گواہوں کا بیان لکھو---"

شادو ایک کرسی پہ بیٹھی تھی۔ ان تینوں نے رونا شروع کردیا۔ پولیس والے ان کو ٹھوکریں مارتے ہوئے لے گئے۔

باہر ناجا مخبر دوسرے پولیس والوں کے ساتھ آج کی اس واردات پہ تبصرہ کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چوہدری حق نواز بھی باہر نکل آیا' دو سادہ کپڑوں میں سپاہی اور ناجے مخبر کو ساتھ لئے وہ تانگے میں بیٹھ کر باؤ خورشید کے گھر کی جانب چل دیا۔

●●

دو گھنٹے بعد سائیں مولا بخش' ناجا مخبر اور چوہدری حق نواز دفتر میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

"سائیں مولا بخش! اس سردارے قصائی کی دمی اب میں نے چھاڑ دینی ہے--- کئی بار وارننگ دے چکا ہوں' اس کو بندے دا پتر بناؤ۔ اس نے پھر جیب کے ساتھ اس کا پیٹ بھی کاٹ دیا ہے' میں اس کو اندر کردوں گا---"

"چوہدری صاحب! اس کا ہاتھ ہی اوچھا پڑتا ہے' اس کا ہاتھ پہ کنٹرول ہی نہیں---"

"دیکھ مولا بخش! اس دفعہ معاملہ بڑا سنگین ہے۔ میں نے ابھی تک ایف آئی آر نہیں کاٹی اور معاملہ ابھی میرے ہاتھ میں ہے لیکن مجھ سے اوپر بھی افسران بیٹھے ہیں' مجھے ان کا بھی ڈر ہے۔ پھر یہ لوگ بھی کوئی معمولی نہیں' قانون اور قانونی چکروں کو جانتے ہیں--- بولو' تم کیا بولتے ہو؟"

"چوہدری صاحب! اس علاقے میں آپ سے بڑا کون ہے؟ جو آپ چاہیں وہی ہوتا ہے' ہم تو آپ کے نوکر ہیں--- ان لوگوں کے پاس حرام کا بہت سا مال اکٹھا ہے' میں ان پہ ہاتھ نہیں ڈالتا لیکن میری اس مریدنی پہ انہوں نے بڑے ظلم توڑے ہیں' اس کی سزا انہیں ملنی چاہئے تھی--- اس باؤ خورشید اور اس کی بے نکاحی راحت جان کی کرتوتیں بھی آپ کے سامنے ہیں۔ یہ گندی تصویریں' شراب اور چرس جو ان کے گھر سے برآمد ہوئی ہے' اسی سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ کتنے شریف ہیں۔ اب آپ کا ہاتھ پکا پڑ گیا

ہے تو ان کو نبو کی طرح نچوڑ لیں چوہدری صاحب---!" اس نے ایک موٹی سی گڈی نوٹوں کی نکال کر میز پر رکھ دی۔ "یہ سودارے والی رقم اور کچھ میری جانب سے نذرانہ ہے---ان کے ساتھ جو بھی آپ حشر کریں' آپ کو اختیار ہے لیکن میری صرف ایک ہی درخواست ہے کہ وہ لڑکی شادو مجھے بخش دیں' وہ بڑی دکھی اور بیمار ہے---میں بھی اپنا گھر بساؤں گا' آپ کے بال بچوں کو دعا دوں گا۔"

"واہ بھئی' واہ---!" چوہدری حق نواز اس کو گہری نظروں سے تولتے ہوئے بولا۔ "تو یہ سارا ڈرامہ اس لڑکی کو حاصل کرنے کے لئے رچایا ہے؟"

"چوہدری صاحب! آپ تو جانتے ہیں کہ میں آپ کی اجازت اور حکم بغیر سانس بھی نہیں لے سکتا---میں یہ سب کچھ آپ کے علم میں لائے بغیر بھی کر سکتا تھا مگر میرا اصول ہے کہ مائی باپ' مائی باپ ہوتے ہیں۔ میں نے اتنا بڑا کیس آپ کے ہاتھ دیا ہے' لمبا ہی مال ہے--- سچی بات یہ ہے کہ میں اس لڑکی کو پسند کرتا ہوں اور وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے---"

ناجا مخبر بولا۔ "مائی باپ! مولا بخش ٹھیک کہتا ہے۔ اس کا جنازہ بھی جائز کروا دیں---اس لڑکی کا بھی آگے پیچھے کوئی نہیں' ایسے ہی بیچاری خراب ہوتی پھرے گی اور ویسے بھی یہ بیمار ہے' یہ اسے خود ہی ٹھیک کرے گا---" وہ ہنسنے لگا۔

"چپ اوئے' خواہ مخواہ سفارشاں نہ کر---"

سائیں مولا بخش ایک اور گڈی بڑھاتے ہوئے بولا۔ "آپ خود میرا نکاح کریں سرکار! ہر قسم کی ضمانت دینے کو تیار ہوں---"

"لڑکی راضی ہے---؟" چوہدری حق نواز نے گڈی کو تولتے ہوئے پوچھا۔

"پوچھ لیں مائی باپ!---اشٹام لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔"

●●

شام سے پہلے پہلے فتح یار کرداور بیس ہزار روپے لے کر تھانے پہنچ گیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک مال افسر کی سفارش بھی لایا---چوہدری حق نواز اپنے دفتر میں سب کو بٹھائے کہہ رہا تھا۔

"دیکھو بھئی' چوہدریو! تم سب سیدھے سیدھے سات سال کے لئے اندر تھے لیکن یہ شخص ایک ایسے مہربان کی سفارش لے کر آیا ہے جسے میں رد نہیں کر سکتا۔ میں اپنے طور پر ہزار رسک لے کر تم کو چھوڑ رہا ہوں---جب تک لترے کی تلاش جاری ہے' اس کا پتہ ملتے ہی تم کو خبر کر دیں گے۔ تم اب جا سکتے ہو' اس لڑکی شادو کو بھی اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو---لترے نے یہیں ڈالا پتہ پھینکا۔"

شادو دین جلدی سے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "چوہدری صاحب! یہ لڑکی بڑی منحوس ہے' اس کو ہم اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ یہ جہاں ہوتی ہے وہاں بربادی ہی بربادی ہوتی ہے---"

"ہم اس لڑکی کا کیا کریں؟---یہ تمہاری سالی ہے' اس کا تمہارے بغیر اور کون ہے---کل تک تو تم اس سے نکاح کرنے والے تھے۔ اب اتنی ہی منحوس ہو گئی ہے کہ تم اس کی شکل دیکھنا گوارا نہیں کرتے؟"

"بس' چوہدری صاحب! میرا دماغ خراب ہو گیا تھا---آج سے یہ میری ماں بہن ہے۔ اس کو کسی دارالامان میں داخل کرا دیں یا کسی لولے لنگڑے سے بیاہ دیں' ہماری طرف سے یہ فارغ ہے---"

"ٹھیک ہے---تو چوہدری! اس کاغذ پہ دستخط کرو---" پھر وہ سب کو اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "آئندہ میں نے تمہیں درگاہ شریف کے قریب بھی دیکھا یا شہر میں تمہاری غیر ضروری آمدورفت دیکھی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا---اور تم---!" وہ یاؤ خورشید کو گھورتے ہوئے بولا۔ "اس لنڈی کو تڑی سے یا تو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر نکاح کرو یا نکال دو اور مجھے یہاں اطلاع کرو۔ جو کرتوتیں تم اپنے گھر کرتے ہو' اگر پھر مجھے ان کی اطلاع ملی تو تم دونوں کا حشر کر دوں گا---اس لڑکی شادو کا فیصلہ اس کی مرضی کے مطابق ہو گا۔ اگر آئندہ تم میں سے کسی نے بھی اس لڑکی کے معاملات یا اس کی زندگی میں دخل اندازی کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا---"

آگے بڑھ کر شادو دین پٹواری نے دستخط کر دیئے۔

"چوہدری فتح یار! تمہارا لحاظ کرتے ہوئے میں نے یہ رسک لیا ہے اور تم سب لوگ اس واقعے کو بھول کر اپنی زندگی بسر کرو---اب تم سب جا سکتے ہو۔"

ان کے جاتے ہی اس نے سائیں مولا بخش' شادو اور ناجے مخبر کو بلایا۔ ان کے بیٹھتے ہی چوہدری حق نواز بولا۔

"دیکھ لڑکی! ان لوگوں سے تیری جان چھوٹ گئی ہے' اب وہ کبھی بھی تجھے اپنی شکل نہیں دکھائیں گے---اب تو نے اپنے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟"

شادو بڑی معصومیت سے بولی۔ "تھانیدار جی! میں واقعی بڑی منحوس اور بدنصیب ہوں اور میں کون ہوتی ہوں اپنا فیصلہ کرنے والی؟---اوپر رب ہے' نیچے سائیں سرکار اور آپ ہیں' جو چاہیں فیصلہ کر دیں---ویسے انسانی رشتوں سے میرا ایمان اٹھ گیا ہے۔"

"میرا وقت ضائع نہ کرو' جو پوچھتا ہوں اس کا صاف صاف جواب دو---اگر بہن کے پاس جانا چاہتی ہو تو بندوبست کر دیتے ہیں' دارالامان میں جانا چاہتی ہو تو پھر بھی بتاؤ؟---وہاں حفاظت بھی ہو گی کام بھی اور مرضی ہو تو شادی بھی ہو جاتی ہے---"

"کھل کے بات کرو' شادو---!" سائیں مولا بخش نے اسے تسلی اور اشارہ دیتے ہوئے کہا۔

"آپ خاموش رہیں سائیں جی!---مجھے اس کی مرضی معلوم کرنے دیں۔"

"مجھے آپ درگاہ شریف بھیج دیں---"

"تم سائیں مولا بخش کے ساتھ جانا چاہتی ہو---؟"

"جی--- میں ان کی ملنگنی بن کر اللہ اللہ کرنا چاہتی ہوں---"

"ٹھیک ہے---" چوہدری حق نواز نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں اپنی ذاتی ضمانت پر بھیج رہا ہوں' تم اپنے حالات سے مجھے باخبر رکھنے کی پابند رہو گی---"

● ●

سائیں مولا بخش اس کو لے کر سیدھا اپنے ڈیرے پہ پہنچا۔ آج اس کے انگ انگ سے خوشیوں کی پھواریں پھوٹ رہی تھیں' اس کے کانوں میں کامرانیوں اور شادمانیوں کے شادیانے گونج رہے تھے۔ شادو کو حاصل کرنے کے لئے اس نے جو منصوبہ اور حکمت عملی اختیار کی تھی اس میں وہ سو فیصد کامیاب رہا تھا۔ دوسروں کے کاندھے پہ بندوق رکھ کر اس نے سارے دشمن اپنے راستے سے ہٹا دیئے تھے' اپنا چہرہ دکھائے بغیر دوسروں کو سربازار ننگا کر دیا تھا۔ ایک لمبی زندگی جرم کے جنگل میں گزارنے کے بعد اس نے یہ گر سیکھ لیا تھا کہ کبھی آگے بڑھ کر خود شکار نہ کرو بلکہ بڑے بڑے درندوں اور طاقت والوں کو آگے بڑھ کر شکار کرنے کی ترغیب دو' ان کے سائے اور پناہ میں رہ کر کھاؤ پیو--- اس سارے ڈرامے میں کوئی بھی نہ جان سکا کہ اصل بدایتکار کون ہے؟ اسے خدا بھی مل گیا اور وصال صنم بھی' اب اس کے راستے میں صرف ایک پتھر رہ گیا تھا اور وہ تھا شاہ مراد!--- یہ خطرناک اور مضبوط پتھر اس کی راہ کی ایک بھاری رکاوٹ ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ اس کی جڑیں یقین' استقامت اور پر خلوص پیار کی زمین میں تھیں اور پھر یہ سرکاری بندہ بھی تھا۔ اس پتھر کو عیاری' مکاری یا کسی قانونی طاقت کے بارود سے اڑانے کی بجائے وہ اسے حالات' سرکاری نوکری یا کسی ذاتی وجہ کے تیزاب سے پانی پانی کرنا چاہتا تھا اور صورت انتظار کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں تھا۔

● ●

شاہ مراد بدستور اپنی لائن پہ لگا ہوا تلاوت میں مصروف تھا۔ اس کی نگرانی بھی جاری تھی۔ بابا نور بھی بیٹھا اونگھ رہا تھا' حافظ صاحب آرام کی نیت سے اپنے حجرے جا چکے تھے--- سائیں مولا بخش نے چند ملنگوں اور عورتوں کو شادو کی نگہداشت اور آرام و آسائش پہ مامور کرتے ہوئے اپنے اڈے کا رخ کیا۔ حسب معمول وہاں پہ رونق تھی' معتقدوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔ راستے میں ہی تاجے مخبر سے مڈھ بھیڑ ہو گئی' وہ اسے ساتھ لیتا ہوا ساتھ کی دیوار پر بیٹھ گیا۔

"مولا بخش! لکھ لکھ مبارکاں--- دیکھ لو میں نے تمہاری سفارش کر دی تھی۔ اب تو لمبے ہی جشن ہوں گے---"

"یار' تاج الدین! تمہاری اور چوہدری صاحب کی مہربانی ہے جو یہ مشکل کام بڑی آسانی سے ہو گیا--- پستول واپس کر دیا ہے یا ابھی تھانے ہی پڑا ہے؟"

"پستول واپس کر دیا ہے--- سردار ادھی پاڑ بھی آیا تھا۔ رضا کاروں' سپاہیوں اور عورتوں کو بھی فارغ کر دیا ہے--- پورے ایک ہزار سات سو خرچ ہوئے ہیں۔"

"یہ لو چار ہزار---" وہ اسے نوٹوں کی گڈی دیتے ہوئے بولا۔ "باقی تمہارا نشہ پانی ہے۔ اب شاہ مراد کی نگرانی ختم کرا دو--- ایک اور مشورہ بھی کرنا ہے' ذرا ٹھہر جاؤ۔ اب میں اڈے پہ چلتا ہوں---"

اڈے پہ پہنچتے ہی ایک آدمی' شاہ مراد اور بابے نورا کو بلانے کے لئے دوڑا دیا۔ وہ آئے تو سائیں مولا بخش گرم گرم چائے کی کیتلی سامنے رکھے ان کا انتظار کر رہا تھا۔ شاہ مراد ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش' تروتازہ اور پر عزم دکھائی دے رہا تھا۔ تلاوت' صدق دلی اور جوانی کا نور اس کے چہرے پہ کھلا ہوا تھا۔ مولا بخش کے کان میں آہستگی سے ایک سرگوشی ابھری جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ اس کے راستے کا پتھر بننے کی کوشش نہ کرنا' ایسا کرو گے تو نیست و نابود ہو جاؤ گے۔ ان کی ڈوریوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ مت کرنا ورنہ یہ ڈوریاں تمہاری گردن کے گرد پھندا بن جائیں گی۔ اس کا دل اور یقین پامال نہ کرنا ورنہ--- شاہ مراد سلام کرکے جواب کا انتظار کر رہا تھا اور مولا بخش ورنہ' ورنہ کے ساعت پاش آہنگ سے لرز رہا تھا۔ پھر مراقبے سے باہر آتے ہی اس نے حال احوال پوچھا۔ بابے نورے اور اس کو چائے دی۔

"ہاں بھئی جوان' سورۂ یوسف کی تلاوت جاری ہے---؟"

"جی' سائیں جی! جاری ہے--- اور جب تک آپ کا حکم ہو گا' جاری رہے گی۔ اب ادھ وچہ کی زبانی بھی یاد ہو گئی ہے---"

"ہاں' اس لڑکی شادو کے بارے میں تمہیں سب کچھ معلوم ہو گیا ہو گا---؟"

"ہاں جی' بابے نورے سے مجھے سب باتوں کا علم ہو چکا ہے--- سرکار! میں اس پٹواری' اکرو اور ان کے دوست' کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ان لوگوں نے ایک معصوم' بے بس بیوہ کے ساتھ جو سلوک کیا--- خدا کی قسم' سائیں جی! اگر میں آپ کے حکم کا پابند نہ ہوتا تو آج یہ آپ کو زندہ دکھائی نہ دیتے--- مجھے شادو کے گاؤں کا علم تھا سرکار! میں وہاں جا سکتا تھا مگر نہیں' میں اس کو بدنام نہیں کر سکتا۔ آپ کے حکم سے باہر نہیں جا سکتا تھا--- میں اپنے پیچھے پہ لکیر نہیں لگاؤں گا۔" شاہ مراد کی آنکھیں خون بار اور چہرہ پر سکون تھا۔ سائیں مولا بخش اس کے اندر کے طوفان اور باہر کے سکون کو بڑی وحشت اور دہشت سے دیکھ رہا تھا۔ "سائیں جی! ہم وار کرتے ہیں تو سامنے متھے پر' بات کرتے ہیں تو کھری منہ پر--- من پسند عورت کو حاصل کرنے کے لئے اگر قتل کرنے پڑیں تو گنتی بھول جاتے ہیں--- سائیں جی! آپ کی بخشی ہوئی اس شادو کے لئے تو میں سارے پہاڑے بھی بھول سکتا ہوں۔ ہمارے خاندانوں

میں تو اس موڈ کو شادی ہی نہیں دیتے جس نے دو چار قتل نہ کئے ہوں۔"

"بس جوان! زیادہ جذباتی نہ ہو۔۔۔" مولا بخش کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "جانتے ہو' شادو اس وقت کہاں ہے؟"

اس نے فوراً مٹھی کھول کر آگے کر دی۔ "یہ دیکھئے' یہاں۔۔۔" پھر سینے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں۔۔۔ میری آنکھوں میں' میرے روئیں روئیں میں ہے سرکار! وہ یہیں موجود ہے' اسی درگاہ شریف میں۔۔۔ میں نے مسجد میں ہی اس کی خوشبو محسوس کر لی تھی۔ آپ اسے ساتھ لے کر آئے ہیں' مجھے پتہ ہے کہ آپ نے میرے ستاروں کا رخ بدل دیا ہے اور اگر کوئی کسر رہ گئی ہو تو حکم کریں سرکار! میں پھر مسجد میں چلا جاتا ہوں' پھر تلاوت شروع کر دیتا ہوں۔ آج' کل' پرسوں' سو سال بعد۔۔۔ جب بھی میرے ستارے گردش سے نکل آئیں' مجھے کوئی جلدی نہیں۔۔۔"

"تم نے نوکری پہ واپس بھی تو جانا ہے۔۔۔ کب واپس جاؤ گے؟"

"میری چھ سات چھٹیاں ہیں' مشقوں کے بعد چھٹی ملتی ہے۔۔۔ میں یہیں آپ کے قدموں میں ہوں' گھر نہیں جاؤں گا۔"

"۔۔۔ گھر کیوں نہیں جاؤ گے؟۔۔۔ وہاں ماں باپ' بہن بھائی سب ہیں۔۔۔ جاؤ' ان کو بھی مل آؤ۔ یہاں بے آرامی سے بیمار پڑ جاؤ گے۔"

"آپ جو حکم کریں' وہی ہو گا۔۔۔" شاہ مراد بولا۔

"شاباش!۔۔۔ تم ابھی اپنے گاؤں چلے جاؤ۔ ایک آدھ دن بعد اپنی والدہ یا اور جسے چاہو' ساتھ لے آؤ۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔۔۔ بابا نورا یہاں ہی رہے گا' شادو کے پاس۔۔۔"

"جو حکم سائیں جی!۔۔۔ اگر آپ اجازت دیں تو جانے سے پہلے تھوڑی دیر کے لئے۔۔۔"

"نہیں' یہ مناسب نہیں۔۔۔ ویسے بھی اس کی طبیعت خراب ہے۔ وہ آرام کر رہی ہے۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ جو آپ کا حکم۔۔۔"

وہاں سے اٹھ کر شاہ مراد سیدھا درگاہ شریف آ گیا۔ اب مزار شریف کے قریب بیٹھا وہ رو رہا تھا' لب ساکت اور دل کھلا ہوا تھا۔

"اے اللہ کے پیارو! آپ دلوں کے بھید جانتے ہیں۔۔۔ میں ایک بے کس اور مظلوم کا سہارا بننا چاہتا ہوں۔ اگر میرا جذبہ صادق ہے تو جھولی میں شادو کی بھیک ڈال دیں اور اگر میرے من میں کوئی کھوٹ ہے تو اس بے سہارا کے لئے کوئی بہتری کر دیں' میری خوشیاں بھی اس کی جھولی میں ڈال دیں۔۔۔ اس کی حفاظت فرمائیں۔ وہ آپ کے قدموں میں بیمار پڑی ہے' اس کو صحت عطا کر دیں۔۔۔"

پھر "آمین" کہہ کر وہ سورۂ یوسف تلاوت کرنے بیٹھ گیا۔ تلاوت کے بعد پھر اس کے ہاتھ اٹھے

ہوئے تھے' ڈوریاں لرز رہی تھیں۔

"اے اللہ! تو کرم کر۔۔۔ ان بزرگوں کے صدقے' حضرت یوسف علیہ السلام کے صدقے جن کو کنویں میں ڈالا' آزمائشوں سے گزارا گیا اور پھر تیرے ہی کرم و فضل سے وہ سرخرو ہوئے۔۔۔ مولا! ہم دونوں کو بھی اتنی ہی آزمائش میں ڈال جو ہم سہہ سکیں' ہم پہ بھی اپنا فضل و کرم کر۔۔۔"

پھر وہ آنسو پونچھتا ہوا باہر نکل آیا اور کبوتروں کے چبوترے پہ آ بیٹھا۔ اس کے شانے پہ ایک کبوتری آج بھی آ بیٹھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد حافظ صاحب کو تلاش کرتا ہوا وہ ان کے حجرے میں آ گیا۔ وہ چارپائی پہ لیٹے ہوئے تھے۔ شاہ مراد خاموشی سے چارپائی کی پٹی پہ آ بیٹھا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ جوان' آ گئے۔۔۔؟"

"السلام علیکم حافظ جی۔۔۔!" وہ مسکرا رہا تھا۔ "میں نے تو سلام کیا نہیں اور آپ نے جواب دے دیا۔۔۔"

وہ پھر "وعلیکم السلام" کہتے ہوئے بولے۔ "میں جانتا ہوں کہ تم آج کل شرارتی ہوئے ہو۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ میں تمہیں پہچانتا ہوں یا نہیں' تم جان بوجھ کر ایسا کرتے ہو' لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ تم سے پہلے تمہاری خوشبو پہنچ جاتی ہے۔۔۔ سناؤ' کیا خبر ہے؟"

وہ ان کے پاؤں ہلکے ہلکے دباتے ہوئے بولا۔ "حافظ جی! میں آج گاؤں جا رہا ہوں۔"

پھر اس نے ساری کتھا کہانی ان کے گوش گزار کی اور وہاں سے باہر نکل آیا۔

●●

گاؤں میں شادو دین پٹواری کے گھر دو روز سے چولہا نہیں جلا تھا۔ دو دن غائب رہنے کے بعد جب وہ گھر آیا تو اس کی بیوی اس کی حالت دیکھ کر اپنا سر پیٹنے لگی۔ بہن کے بیوہ ہونے اور پھر فرار ہونے کا دکھ' بدنامی' زیورات کے جانے کا غم۔۔۔ رہی سہی کسر اور جمع پونجی فتح یار گروار کے ذریعے بیس ہزار کی رقم تاوان کی صورت نکل گئی۔۔۔ شادو کا واپس آنے سے انکار' آنے جانے والوں کی باتیں' ان کے سوالات' شادو کی نحوست اور کرتوتیں' ہمہ وقت یہی کچھ زیر بحث رہتا۔ شادو دین پٹواری' شادو کے نام اور ذکر سے بیزار ہو چکا تھا' بات بات پہ کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ وہ اب بیوی سے کم بات کرتا' جس کی بہن کی وجہ سے اسے آج یہ دن دیکھنا پڑا تھا۔ تحصیل یا باہر کے دورے سے واپس آ کر اکیلا پڑا حقہ گڑگڑاتا رہتا۔ ایک بار باؤ خورشید بھی راحت جان کے ساتھ پھیرا ڈال گیا تھا جس کے ساتھ اس نے دوسرے روز ہی نکاح پڑھوا لیا تھا۔۔۔ شادو دین کی بیوی کئی روز سے درگاہ شریف سلام کا پروگرام بنا رہی تھی لیکن گھر کا رونا دھونا اور شادو دین کی طبیعت کی وجہ سے ٹالتی رہی۔ ایک دن کسی دوسرے گاؤں کی عورت نے بتایا کہ اس نے شادو جیسی لڑکی درگاہ شریف کے آس پاس دیکھی ہے' اسے شک ہے کہ وہ شادو ہی تھی۔ یہ اطلاع سن

کر خوشی یا کوئی دکھ تو نہ ہوا البتہ اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ اس جمعرات کو سلام کرنے ضرور جائے گی۔ اس نے اپنی خواہش کا اظہار شاہ دین پٹواری سے بھی کیا تو اس نے نہایت رکھائی سے جواب دیا۔

"مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟--- شادو کی طرح جہاں تمہارا دل چاہتا ہے' چلی جاؤ۔"

وہ اپنا دل مسوس کر رہ گئی کہ وہ کر اور کہہ بھی کیا سکتی تھی' اپنا برتن ہی گندہ ہو تو کتے کو بھلا کوئی کیا کہے؟--- کتا اپنے زخم چاٹ رہا تھا۔ وہ زبانی کلامی تھانے میں دس آدمیوں کے درمیان کچے کاغذ پہ شادو کو اپنی ماں بہن بنا چکا تھا اور اپنے تمام کردہ' ناکردہ کرتوتوں کا پول چار ثقہ گواہوں کی موجودگی میں کھول کر کچے کاغذ پہ دستخط کر کے' اپنے ہاتھ کاٹ کر تھانے کی میز پہ رکھ آیا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی زبان کھولنے یا کوئی عملی چارہ جوئی کرنے سے معذور تھا اور لے دے کے ایک بیوی ہی تھی جو اس کے عتاب کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔

تیسرے روز ظہر کی نماز سے پہلے شاہ مراد درگاہ شریف کے صدر دروازے پہ تانگے سے اتر رہا تھا۔ سائیں مولا بخش اپنے اڈے پہ موجود نہیں تھا۔ شاہ مراد کے ہمراہ اس کی بے جی' والد صاحب اور ایک بڑا بھائی تھا--- وہی سیدھے سادے دیہاتی لوگ جن کے ہاں شہر کے رہنے والوں کی طرح مصنوعی پن نہیں ہوتا' منافقت ریا اور ظاہری نمائش و نمود سے کوسوں دور' ان کی ایک علیحدہ ہی خوشبو اور شان ہوتی ہے جیسے یہی لوگ اس دھرتی کے اصل وارث اور باسی ہوں--- معلوم ہوا کہ سائیں مولا بخش کی طبیعت ناساز ہے اور وہ ڈیرے پہ آرام کر رہے ہیں۔ پھول اور نذر نیاز کی چیزیں خرید کر وہ لوگ آگے بڑھ گئے' سلام اور فاتحہ کے بعد حافظ جی سے سرسری ملاقات ہوئی اور شام کی نماز کے بعد تفصیلی ملاقات کا طے کر کے وہ کبوتروں کے چبوترے پہ پہنچے۔ دانہ دنکا ڈال کر وہ باہر صحن میں سائے تلے ٹھنڈے ٹھنڈے فرش پہ آرام کی غرض سے بیٹھ گئے۔ پھر بڑے بھائی کو لنگر خانے کی جانب روانہ کر کے شاہ مراد ڈیرے پہ پہنچا۔ بوڑھے کے بوڑھے درخت کی داڑھی تلے سائیں مولا بخش ایک کھاٹ پہ سیدھا سیدھا لیٹا پڑا تھا اور ایک بوڑھا سا ملنگ سرداب رہا تھا' تین چار اسی وضع قطع کے ملنگ ارد گرد حلقہ بنائے باتیں کر رہے تھے اور کچھ غرض مند بھی نزدیک و دور' زیارت اور ملاقات کے منتظر تھے۔ اسے دیکھتے ہی ملنگ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے' سلام کر کے وہ بھی پاس زمین پہ بیٹھ گیا پھر پاس بیٹھے ہوئے ملنگ سے خیریت دریافت کی تو معلوم ہوا کہ آج ہی چلے سے فارغ ہوئے ہیں' کمزوری اور بخار ہے اس لئے کسی سے بھی ملاقات کا حکم نہیں۔ تھوڑی دیر بعد شاہ مراد اٹھا اور پائنتی کے پاس بیٹھ کر پاؤں دابنے لگا۔ ایک دو بار جھونپڑے کی جانب بھی نگاہ دوڑائی' باہر دروازے پہ پردہ پڑا ہوا تھا--- سائیں مولا بخش نے کروٹ بدلی' ہولے سے آنکھیں کھولتے ہوئے اسے دیکھا۔

"السلام علیکم سائیں جی! طبیعت کیسی ہے؟"

سلام کا جواب دیتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"--- آ گئے جوان!"

"جی' سائیں جی!--- بے جی' والد صاحب اور بڑے بھائی بھی آئے ہیں۔ وہ تھک گئے تھے' اوپر بٹھا آیا ہوں--- حکم ہو تو کسی ڈاکٹر کو لے آؤں یا کوئی دوا وغیرہ لے آؤں؟"

"نہیں' نہیں--- بس ذرا کمزوری سے بخار ہو گیا ہے۔ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا--- تم نے کچھ کھایا پیا ہے یا نہیں؟ جاؤ' کچھ لنگر و نگر کھاؤ اور آرام کرو۔ میں خود تمہیں بلاؤں گا---" وہ دوبارہ لیٹ گیا۔

"سرکار! میں بالکل ٹھیک ہوں--- اجازت ہو تو بیٹھ کر پاؤں دباتا رہوں؟--- میرا دل چاہتا ہے سرکار!"

"یہاں کافی لوگ ہیں--- جاؤ' اپنے والدین کا خیال رکھو--- کوئی ضرورت ہو تو بتاؤ؟"

"کسی چیز کی ضرورت نہیں' اللہ آپ کو صحت دے--- ویسے میں دعا مانگ کر آیا ہوں۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ایک نظر جھونپڑے پہ ڈالتے ہوئے قبرستان کی جانب چل دیا اور دعا' فاتحہ سے فارغ ہو کر اوپر چلا آیا۔

جھونپڑے کے اندر خاموشی تھی۔ نرم اور آرام دہ بستر پہ شادو نیم غنودگی کے عالم میں ادھ کھلی مرجھائی ہوئی آنکھوں سے روشنی کی کرنوں کے غبار کو تک رہی تھی جو ایک کھڑکی کے راستے اندر پھیل گیا تھا--- کئی روز سے وہ اسی حالت میں یہاں پڑی تھی۔ دو ہمدرد سی بوڑھی عورتیں اور بابا نورا چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہتے اور کوئی مرد تو کیا' سائیں مولا بخش بھی اس جھونپڑے کے قریب نہیں آیا۔ کھانا پینا' دوا دارو' کپڑا لتا' ہر چیز کا خاطر خواہ انتظام موجود تھا اس کے باوجود جیسے اس کے سوچنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت مفقود ہو چلی تھی۔ بظاہر وہ پرسکون تھی لیکن دماغ میں ہلکی سی دھند چھائی ہوئی تھی۔ خاموش' سہمی سہمی آنکھوں میں لاتعداد سوالوں کی پرچھائیاں ابھرتیں' ڈوبتیں اور غائب ہو جاتیں۔ وہ ایک ایسی شکستہ کشتی کی مانند تھی جو ملاح کے بغیر حالات کی لہروں کے رحم و کرم پہ کسی نامعلوم منزل کی جانب بڑھ رہی ہو۔ ایک موہوم سی امید کی لرزتی ہوئی کرن اسے ضرور دکھائی دے رہی تھی' اسی امید کی چھوٹی ہوئی کرن سے وہ اپنے خدشات اور جھونپڑے کے اندھیروں میں اجالا کئے ہوئے تھی---- سائیں مولا بخش نے گو میدان مار لیا تھا لیکن اس کے اپنے گھر' یعنی دل و دماغ میں خانہ جنگی چھڑی ہوئی تھی۔ وہ اپنی ذات' معاملات کی حد تک خود مختار ضرور تھا لیکن وہ شدت سے محسوس کر رہا تھا جیسے اس جیسا بے اختیار' بے بس پورے جہاں میں اور کوئی نہ ہو۔ جیسے وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکنے پہ مجبور ہو' کوئی غیبی طاقت اس کو روک رہی ہو۔ کئی دن سے اس نے شادو کی صورت تک نہیں دیکھی تھی لیکن اس کے آرام'

کھانے پینے اور دیگر آسائشوں کا ہرپل خیال رکھا جیسے وہ اس کے پاس کسی کی امانت ہو۔ اس کی حفاظت کا وہ ذمہ دار ہو--- ایسا وہ کیوں کر رہا ہے' کون سی طاقت ایسا کرنے پہ مجبور کر رہی ہے؟ وہ تو اسے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہے' اس کے صندلی رنگ و بو والے سراپے سے اپنے ارمانوں کے شبستان مہکانا اور سجانا چاہتا ہے' وہ اس کے اختیار میں ہے۔ پھر ایک آواز کہیں سے آئی--- نہیں' تمہارے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں۔ سب کچھ اسی صاحب اختیار کے اختیار میں ہے۔

عصر کی نماز کے بعد اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو بابا نورا اسے پاس بیٹھا نظر آیا۔

"بابا! شادو کیسی ہے' اس نے کھانا وغیرہ کھایا؟"

"ہاں جی--- پتری دی طبیعت ہن ٹھیک اے' روٹی ٹکر وی کھادا سی--- رب تساں نوں وی آرام دے۔"

وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

کچھ لوگ اور بھی بیٹھے ہوئے تھے' وہ ان سے باتیں کرنے لگا۔ اسے تاجا مخبر بھی نظر آیا۔ اس کے ساتھ ذرا پرے' سردارا جیب تراش بھی کھڑا تھا۔ یہ لوگ بھی اس کی بیمار پرسی کے لئے آئے تھے۔ اس نے اشارے سے انہیں قریب بلایا۔

"شاہ مراد' اوپر کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے---" تاجے مخبر نے گویا اسے اطلاع دی۔

"ہاں' مجھے معلوم ہے۔ تم جا کر ان لوگوں کو میرے پاس لے آؤ' بڑی عزت کے ساتھ---"

"کوئی کارروائی ڈالنی ہو تو بتاؤ---" وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔

"نہیں' اس کی ضرورت نہیں پڑے گی---" پھر وہ سردارے وکھی پاڑ سے مخاطب ہوا۔ "اوئے قصائیا! یہ میرے مہمان ہیں' خیال کرنا---"

ان کے روانہ ہوتے ہی اس نے ایک آدمی کو چائے پانی کا بندوبست کرنے کا حکم دیا اور ملنگوں کو تاکید کی کہ کوئی بھی آدمی مہمانوں کی موجودگی میں اس کے قریب نہ آئے--- وہ آئے تو اپنے ساتھ کئی سوغاتیں بھی لائے۔ گھی' باداموں کھوئے اور میووں والا گڑ' السی کے لڈو' گھر کے کاتے ہوئے سوت کا کھیس' کمیوں کے پھول' سنگھاڑے' میٹھی تلی اور کپڑے--- سائیں مولا بخش نے بڑی خندہ پیشانی سے ان کی پذیرائی کی' حال احوال پوچھا۔ شاہ مراد کی تعریف کی' پر تکلف خاطر تواضع کی۔ بے تکلف بات چیت کے دوران' شاہ مراد کے بزرگ والد نے بڑی سادگی سے اپنے خاندانی حالات اور پس منظر پہ روشنی ڈالی۔ اپنی زمین داری' ٹیوب ویل' ٹریکٹر' ٹریلر' گائے' بیل' بکریاں' ہر چیز کی تفصیل سے آگاہ کیا اور یہاں تک کہ شاہ مراد کے ماموں کی لڑکی کے متعلق بھی بتایا کہ اس کی ماں وہاں شادی کرنے کا ارادہ رکھتی تھی مگر شاہ مراد راضی نہیں ہے۔ اس کی ہٹ دھرمی' مرنے مارنے کی عادت' وطن پرستی' دینی رجحانات' کردار کی

پاکیزگی' ہر چھوٹی چھوٹی بات پہ لمبی لمبی بات کی گئی۔ اسی دوران شاہ مراد نے بڑے ادب سے گزارش کی کہ وہ واپس اپنی یونٹ میں جانا چاہتا ہے۔ اس کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں' کوشش کر کے مزید چھٹی لے کر آنے کا کہہ کر وہ رخصت ہو گیا' ان لوگوں نے بھی اس کی غیر موجودگی میں سہولت سے بات چیت کی غرض سے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

مغرب کی نماز پڑھ کر وہ لوگ واپس آئے تو انہیں جھونپڑے کے اندر زمین پر بچھی سفید چادر پہ بٹھایا گیا۔ دیوار کے ساتھ مجھی بستر پہ شادو لیٹی ہوئی تھی' بابا نورا پاس بیٹھا پنکھا ہلا رہا تھا۔ سائیں مولا بخش ایک تکیے کے سہارے نیم دراز تھا--- کھانے کے اہتمام میں خاصا تکلف برتا گیا۔ موسمی پھل' شربت' چائے' مٹھائی' ہر چیز وافر تھی۔ مہمان سائیں مولا بخش کی کشادہ دلی' خاطر داری اور اچھے برتاؤ سے بڑے متاثر نظر آتے تھے۔ آخر ایک بار پھر بات چیت کا دور شروع ہوا اور اس بار شاہ مراد کے بڑے بھائی شاہ جمال نے پہل کی۔

"مراد نے اپنی ماں سے کسی لڑکی شادو کا ذکر کیا تھا--- جیسا کہ آپ کو بتایا جا چکا ہے کہ بے جی کی مرضی اپنی بھتیجی سے بات پکی کرنے کی تھی۔ لڑکی گھر کی اور خوبصورت' پانچ جماعتیں پڑھی ہوئی ہے لیکن مراد نے انکار کر دیا۔ اس نے اس بات کا بھی احساس نہیں کیا کہ ہماری بہن ان کے بیٹے کے ساتھ بیاہی ہوئی ہے اور اس انکار سے اس کی زندگی پر بھی اثر پڑ سکتا ہے---"

اب ان کی بے جی بولیں۔ "پیر جی! میں نے اپنے پتر کے آگے بڑے ترلے پائے ہیں مگر اس پہ کوئی اثر نہیں ہوا--- کہتا ہے کہ وہ لڑکی اسی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ وہ اسی سے شادی کرے گا' نہیں تو ساری عمر کنوارہ رہے گا۔ میں اپنے پتر کو جانتی ہوں' وہ ایک بار کسی چیز کے لئے ضد کر لے تو جان کی بازی لگا کر بھی اسے حاصل کر لے گا---"

والد صاحب بولے۔ "جناب! اسی لئے تو ہم نے اسے فوج میں ڈال دیا' بڑا اتھرا اور ہتھ چھٹ ہے---"

سائیں مولا بخش بڑی توجہ سے یہ ساری باتیں سن رہا تھا' موقع پا کر بولا۔ "مناسب تو یہی ہے کہ اس کی شادی وہیں ہو جہاں ان کی والدہ چاہتی ہیں--- گھر کا رشتہ ہے' نہ ہوا تو آپ کی بیٹی پہ اثر پڑ سکتا ہے اور ہمیشہ کے لئے تعلقات بھی ختم ہو سکتے ہیں۔"

"اللہ آپ کا بھلا کرے' پر یہ عقل اس مورکھ کو کون دے؟" ان کے والد صاحب کھانستے ہوئے بولے۔

شاہ جمال جھٹ بولا۔ "بابا جی! اس نے تو ہمیں یہ دھمکی بھی دی ہے کہ اگر ہم راضی نہ ہوئے تو وہ خود ہی شادی کر لے گا' جائیداد کا بٹوارہ کروا کر علیحدہ ہو جائے گا--- وہ بڑا اڑیل اور ضدی ہے۔"

سائیں مولا بخش لوہا گرم ہوتے دیکھ کر بڑی نرمی سے بولا۔ "بتایئے' میں کیا کر سکتا ہوں--- اگر وہ ماں باپ' بھائیوں کی بات نہیں سنتا تو میری کیا سنے گا؟"

"پیر جی! آپ تو بڑی کرنی والے ہیں' کوئی ایسا تعویذ دیں کہ میرا پتر' ترکلے وانگوں سیدھا ہو جائے---" بے جی نے کہا۔

"مائی جی! چرخے کا ترکلہ تعویذوں سے نہیں' جوتوں سے ٹھیک ہوتا ہے اور پھر یہ ترکلہ چرخے کا نہیں' عشق کا ہے جو جوتوں سے اور بھی ڈنگا ہو جاتا ہے---ویسے میں کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں۔"

"پیر جی! او کڑی کتھے دی اے' کون اے تے ذات برادری؟--- سنا ہے کہ کوئی بڑی کرماں ماری یتیم تے بیوہ اے۔"

"لڑکی تو یہ ہے---" وہ نیم خوابیدہ شادو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یتیم اے وچاری' آگے پیچھے صرف ایک بہن ہے۔ یہ پانچ چھ مہینے پہلے بیوہ ہو گئی' کوئی بچہ وچہ نہیں--- پچھلے ہفتے اس کے اپنے بہنوئی نے اسے اغواء کر کے نکاح پڑھانا چاہا۔ اسے زبردستی شراب پلائی' بیہوش کیا' بے حرمتی کی مگر سوہنے رب نے اسے بچا لیا۔ اب پولیس نے اسے میرے سپرد کر دیا ہے کہ میں کہیں اسے بٹھا دوں--- ویسے یہ بڑی شریف اور دکھیاری لڑکی ہے۔"

وہ سب شادو کی جانب اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے کسی کوڑھ والے کو دیکھا جاتا ہے۔ ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی اور منہ کھلے ہوئے تھے۔ سائیں مولا بخش کا تیر نشانے پر بیٹھا تھا--- شاہ جمال پوچھنے لگا۔

"اسے کیا تکلیف ہے' یہ لیٹی ہوئی کیوں ہے اور یہ بابا کون ہے؟"

"یہ بابا نورا ہے' اس کی بہن کے سوہرے پنڈ کا رہنے والا ہے۔ اس بابے نے اس کی بڑی مدد کی' اس کو بیٹی کی طرح سمجھتا ہے---" پھر وہ شادو کی طرف دیکھتے ہوئے بتانے لگا۔ "ان ظالموں نے اس وچاری کو کوئی ایسا نشہ پلایا ہے جس کا اثر ابھی تک اس کے دماغ سے نہیں اترا--- ویسے یہ بڑی سیانی' عقل والی اور نیک ہے۔"

بابا نورا سسکیاں بھرنے لگا۔ بے جی توبہ توبہ کرنے لگیں اور پھر اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر کہنے لگیں۔

"میرا خیال اے' ایس کڑی نے ساڈے بچے تے تعویذ کرائے نے' جیہڑا او ایس پچھے جھلا ہویا پھردا اے---"

"نہیں' نہیں--- یہ لڑکی ایسی ویسی نہیں بس مقدراں دی ماری اے--- شاہ مراد اس کو دکھی اور مظلوم سمجھ کر اس کو سہارا دینا چاہتا ہے۔ یہ تو بڑا ثواب ہے' بڑا درجہ ہے۔ آپ بھی بیٹیوں والے ہیں' ذرا سوچیں کہ اگر یہ آپ کی بیٹی ہوتی تو---"

"توبہ' توبہ---" بے جی پھر کانوں کو ہاتھ لگا کر بولیں۔ "ساری دنیا میں ہم ہی رہ گئے ہیں پیر جی' درجے اور ثواب والے---؟"

"بے اجازت ہو تو بات کروں---؟" بابا نورا آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہاں بابا نورے' بات کرو--- کیا کہنا چاہتے ہو؟" سائیں مولا بخش نے کہا۔

وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "بندہ وچھوٹا ہوں' آپ سب کا کمین! رب کو جان دینی ہے--- یہ لڑکی بڑی مظلوم ہے' بڑی غیرت والی اور سمجھ دار ہے۔ یہ دونوں بچے ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں--- پیار رب کا روپ ہے۔ خدا دا واسطہ اے' ان دونوں کو جدا نہ کریں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے' آگے آپ لوگوں کی مرضی---" سائیں مولا بخش نے ایک ترپ کا پتا پھینکا۔

مایوسی اور بدمزگی سے سب کے چہرے لٹک رہے تھے۔ چند لمحے وہ ایک دوسرے کو تکتے رہے پھر شاہ جمال بولا۔

"میرا خیال ہے کہ شاہ مراد کو ایک بار پھر سمجھاتے ہیں' شاید اسے عقل آ جائے---"

بے جی جلدی سے بولیں۔ "پتر' اس نے نہیں ماننا۔ میں اس کی نسل کو جانتی ہوں--- پیر جی! آپ اتنی پہنچ والے ہیں۔ اس کا کسیں نکاح پڑھوا دیں' کہیں اور بھیج دیں کہ مراد اسے تلاش نہ کر سکے اور اس سے ہماری جان چھوٹ جائے---"

"مائی جی' آپ اب اس مسئلے پہ مزید بات نہ کریں--- آپ لوگ میرے مہمان ہیں اس لئے میں کچھ نہیں کہتا' بہتر ہو گا کہ آپ لوگ چلے جائیں اور ہو سکے تو اپنے بیٹے کو سمجھائیں۔ مجھے مشورے دینے کی ضرورت نہیں--- میرے وظیفے کا وقت ہو گیا ہے۔"

بڑی بدمزگی سے یہ مجلس برخاست ہو گئی۔

شادو کا ایک ایک رواں جیسے کان بنا ہوا ہو' وہ سب کچھ سن رہی تھی بلکہ سنتے سنتے سن سی ہو گئی اور کئی برف کی یخ بستہ سلیں اس کے چاروں طرف دھری ہوں جیسے حبس اور گرمی کی شدت سے محفوظ رکھنے کے لئے کسی لاش کے گرد رکھی جاتی ہیں لیکن وہ کسی طور زندہ تھی' زندہ رہنا چاہتی تھی مگر ان جیسے زندہ لوگوں میں شامل ہونے کے لئے جانے کتنی اور موتیں اس کے نصیب میں لکھی تھیں--- زندہ دماغ کے آگے سارے راستے مردہ تھے۔

سائیں مولا بخش نے اپنے مخصوص طریقہ واردات کے تحت طویلے کی بلا بندر کے سر ڈال دی' یہی اس کا کمال فن اور یکتائے روزگار ہنر تھا کہ جس چیز کو حاصل کرنا چاہو اس سے کوسوں دور ہٹ جاؤ' بظاہر

لاپروا اور لاتعلق ہو جاؤ' نفرت سے بیزاری کا اظہار کرو اور پھر ایسے حالات پیدا کر دو کہ وہ چیز پکے ہوئے پھل کی مانند خود بخود تمہاری جھولی میں آگرے۔ یہی کسی مقصد یا چیز کو حاصل کرنے کا محفوظ طریقہ ہے اور آج بھی ان سیدھے سادے دیہاتیوں سے یہی کھیل کھیلا گیا۔ ان کی خاطر مدارت' آؤ بھگت اور بات چیت میں یہی تاثر دیا کہ وہ شادو کا ہاتھ شاہ مراد کو دینے کے لئے تیار ہے لیکن جو حالات اس نے پیدا کر دیئے' جن واقعات کا بطور خاص ذکر کر دیا ان کو دیکھ اور جان کر ان کا انکار کرنا عین اس کی منشا کے مطابق تھا۔

شاہ مراد کو مزید چھٹی حاصل کرنے میں وقت تو پیش آئی لیکن والدین کے آنے کی وجہ سے چھٹی مل گئی' بڑی آس امیدیں اور مستقبل کے لئے سہانے خواب بنتا ہوا وہ واپس پہنچا تو صورت حال کو یکسر مختلف پایا۔ گھر والے اس کی تلون مزاجی سے خوب واقف تھے اس لئے بڑے آرام اور دلائل کے ساتھ اسے اس ارادے سے باز رہنے کی تلقین کرنے لگے لیکن وہ بھوت ہی کیا جو سر سے اتر جائے۔ اس مارشے میں عقل کی دلیلیں' سماج کے رسم و رواج' ذات پات' حسب نسب' رنگ و روپ' عمر و قامت' رسوائی بدنامی' زندگی موت' کسی چیز کا احساس اور اہمیت نہیں رہتی اور مریض عشق کے لئے یہ سب کچھ بیکار ہوتا ہے' اس کی شفایابی تو شربت دیدار اور جام وصال سے ہوتی ہے۔ انہوں نے بھی جب نصیحتوں اور فہمیوں کے نیم کا کاڑھا اسے پلایا تو اس نے بلا لحاظ رشتہ و مرتبہ سب کی طبیعت صاف کر دی۔ انہوں نے جب بازی الٹتے ہوئے دیکھی تو فوراً افہام و تفہیم کی راہ پر اتر آئے اور نیم رضامندی سے اس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے' مزید مشورے کے لئے حافظ صاحب کے حجرے کی جانب آنکلے۔ وہ ان کی خاطر مدارت کا انتظام کئے ان کے منتظر تھے۔ فراغت کے بعد ان کے سامنے سارا معاملہ بیان کیا۔ انہوں نے انتہائی سکون' سادگی اور عام فہم لب و لہجے سے انہیں سمجھایا کہ عزت و ذلت وہی دینے والا ہے' کسی کو امتحان اور مصیبتوں میں پڑا دیکھ کر اس سے نفرت اور علیحدگی اختیار نہیں کرنا چاہئے بلکہ خدا کی پکڑ سے ڈرتے ہوئے اسے سینے سے لگانا چاہئے۔ کسی یتیم' بیوہ' بے سہارا کو سہارا فراہم کرنا اللہ کی رحمتوں اور رزق میں برکتوں کی ضمانت ہوتا ہے۔ چھوٹے بڑے' اچھے برے' سب اس رب کی مخلوق ہیں جنہیں وہ اپنے خزانوں سے رزق اور زندگی عطا کرتا ہے۔ اصل عبادت صرف نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ یا کلمہ پڑھنا ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ اللہ کا خوف' اللہ کی مخلوق سے محبت' خدمت اور اپنا ہر وقت محاسبہ کرتے رہنا ہے۔ آپ لوگ' خاص کر یہ جوان' خوش نصیب ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس سعادت سے نوازنا چاہتے ہیں جس کی تمنا بڑے بڑے پیغمبروں اور نیک انسانوں نے کی اور عملی طور پر معاشرے سے ایسے افراد کو تلاش کر کے انہیں عزت' تحفظ اور آبرو مندانہ پروقار زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج یہ دنیا ایسے نہ ہوتی' کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی۔۔۔ ان کے پر اثر بیان کا اثر یہ ہوا کہ اس کی بے جی اور والد صاحب رونے لگے' توبہ استغفار کرنے لگے۔ عرض کی کہ آپ سائیں مولا بخش سے بات

چیت کے ذریعے اس مسئلے کو حل کریں۔ ہمارا پتر خوش تو ہم خوش اور ہمارا خدا خوش' ہم راضی ہیں۔

"جزاک اللہ' آپ لوگوں نے اپنی عاقبت سنوار لی ہے۔۔۔ میں تو مراد کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتا ہوں' اللہ ایسا نیک پتر سب کو دے۔۔۔"

"آپ کے کتنے پتر ہیں حافظ جی؟" بے جی نے پوچھا۔

"بہن جی! اللہ نے اپنی رحمت سے چار بیٹیاں دی ہیں۔۔۔ بڑی رحمتیں ہیں اس کی' اب جا کے اس بڑھاپے میں خدا نے ایک بیٹا دیا ہے۔"

وہ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔۔۔ بے جی بولیں۔

"حافظ صاحب! ایس عمرے پتر ہویا اے۔۔۔ ربا تیریاں شاناں!"

"ہاں' بہن جی! اللہ جب بھی دے' اس کی مرضی۔۔۔" وہ مسکرا رہے تھے۔ "نام بھی اس کا بہت پیارا ہے۔۔۔"

"کی ناں اے سوہنے دا۔۔۔؟" بے جی نے دریافت کیا۔

"اس کا نام شاہ مراد ہے۔۔۔"

سمجھنے میں کچھ دیر لگی' بعد میں سب ہنسنے لگے۔۔۔ شاہ مراد ان کے سینے سے لگ گیا۔

تھوڑی دیر بعد شاہ مراد' حافظ صاحب کا ہاتھ تھامے آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ والدین اور بھائی پیچھے پیچھے آرہے تھے۔

"حافظ صاحب! دعا مانگیں کہ اب کوئی بدمزگی نہ ہو۔۔۔ سائیں جی ناراض ہو گئے ہیں۔ میں موجود ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ اب آپ ہی اپنے انداز میں ان سے بات کریں گے۔۔۔" شاہ مراد نے التجا کی۔

"جوان! مجھ پہ یا سائیں جی کی بجائے اللہ پہ بھروسہ رکھو۔ تمہارا مقصد نیک اور نیت اچھی ہے' اللہ بہتر کریں گے۔۔۔"

سائیں مولا بخش جھونپڑے کے باہر اسی جگہ لیٹا ہوا تھا' بہت سے لوگ ارد گرد حلقہ بنائے موجود تھے۔ سائیں مولا بخش نے انہیں ادھر آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا' ہاتھ کی حرکت سے لوگوں کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک ملنگ سے چارپائی لانے کو کہا۔ سلام دعا کے بعد حافظ صاحب نے ان کی صحت کے لئے دعائیہ کلمات کہے اور کچھ علیحدگی میں بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

"بسم اللہ' آپ سب اندر تشریف لائیں۔۔۔ آپ مجھے کہلوا دیتے' میں ادھر آجاتا۔۔۔"

"نہیں سائیں جی! ہم گنہگار تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔۔۔ ویسے ہم جس نیک مقصد کے لئے حاضر ہوئے ہیں اس کے لئے چل کر جانا حق بھی ہے' ثواب اور سنت بھی۔۔۔"

وہ سب فرش پہ بیٹھ چکے تھے۔ شادو اپنے بستر پہ لیٹی تھی۔ دو عورتیں بھی موجود تھیں' ایک پنکھا جھل

رہی تھی اور دوسری سر کے بال درست کر رہی تھی۔ بابا نورا بھی پڑا اونگھ رہا تھا۔

"جی فرمایئے حافظ صاحب! کیا حکم ہے---؟" اس نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"سائیں جی! یہ لوگ پہلے بھی یہاں آچکے ہیں' سادہ سے نیک دیہاتی لوگ ہیں اور یقیناً ان کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل گئی ہوگی جو بدمزگی کا باعث بنی۔ اس میں ان کی سادگی کا دخل تو ہو سکتا ہے نیت کا نہیں' لہٰذا میں ان بزرگوں کی جانب سے معذرت پیش کرتا ہوں---"

"حافظ صاحب! آپ ایسا نہ کہیں' آپ سید بادشاہ ہیں اور ہم تو آپ کے جوتوں کی خاک ہیں--- رہی ان لوگوں کی بات تو چونکہ یہ مجھے نہیں جانتے' نہ ہی میرے اصولوں اور مزاج سے واقف ہیں--- خیر چھوڑیئے' فرمایئے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"آپ جانتے ہیں کہ شاہ مراد شادو کے لئے اپنے دل میں بڑے پاکیزہ' خلوص بھرے جذبات رکھتا ہے۔ یہ دونوں بچے ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہیں اور ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں--- شادو جن افسوسناک حالات سے گزری اور جن حادثات کا شکار ہوئی' ان کو جان اور سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ بچی جوان اور بے آسرا' بے سہارا ہے۔ اب اگر اسے اچھی زندگی بسر کرنے کا موقع اور خلوص بھرا تحفظ فراہم ہوتا ہے تو ہمیں مل جل کر اس کار خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہئے---" وہ سانس لینے کے لئے رکے۔

شاہ جمال بولا۔ "سائیں جی! ہم پھر ایک دفعہ معافی مانگتے ہیں' بے جی اپنی سادگی میں وہ باتیں کر گئی تھیں۔ ہم انشاء اللہ آپ کے تابعدار ہیں اور اس بچی کا بھی ہر طرح سے خیال رکھیں گے۔ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی---"

شاہ مراد کے والد صاحب بولے۔ "سرکار! جیسے یہ آپ کی بیٹی' ویسے ہی ہماری بچی--- ہم تابعدار ہیں۔"

سائیں مولا بخش کے کانوں میں جیسے پگھلایا ہوا سیسہ انڈیل دیا گیا ہو۔ وہ جھٹکا کھا کر ان کی جانب دیکھنے لگا' ماتھے پہ تریلی سی آگئی۔

"ہاں سائیں جی! بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں اور گاؤں کی کھلی فضاؤں میں رہنے والے لوگ شہر کے گھٹے گھٹے ماحول میں بیمار ہو جاتے ہیں---" حافظ صاحب کا اشارہ شادو کی طرف تھا۔ "اس لئے آپ جلد سے جلد اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو کر اس بچی کو اللہ کے سپرد کر دیں---"

سائیں مولا بخش ابھی اس جھٹکے سے سنبھلنے نہیں پایا تھا' سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور شاہ مراد باہر چارپائی پہ بیٹھا اپنی سوچوں کے سمندر میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا' اس کی مضطرب نگاہیں بار بار اس جھونپڑے کی عدالت کی جانب اٹھتی تھیں جہاں اس کے نصیبوں کا کوئی فیصلہ ہو رہا تھا اور اندر شادو بھی

سانسوں کی سولی پہ ٹنگی ہوئی کسی فیصلے کی منتظر تھی۔ بابا نورا بھی چہرے کی جھریوں میں دھنسی ہوئی نیم نور آنکھوں سے نیرنگی وقت کی نو ٹنگی دیکھ رہا تھا--- حافظ صاحب نے پھر خاموشی توڑی۔

"سائیں جی! نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے--- آپ بھی کچھ فرمائیں؟"

"جی--- یہ لڑکی قانونی طور پر میری سرپرستی میں ہے۔ میں اس کا باپ نہیں' یہ فیصلہ میں اکیلا نہیں کر سکتا--- لڑکی عاقل و بالغ ہے' مجھے اس کی مرضی معلوم کر لینے دیں پھر کوئی بات ہوگی---" مولا بخش نے کچھ سوچ کر کہا۔

"آپ نے درست کہا ہے--- لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں' لڑکی بہ رضا و رغبت آمادہ ہے۔ پھر یہ لوگ بھی بہت دور رہتے ہیں--- اگر آپ مناسب سمجھیں تو ابھی لڑکے کی موجودگی میں اس کی منشا معلوم کر لیں۔"

"حافظ جی! لڑکی بیمار ہے' کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہے اور پھر اگر یہ آپ کی بیٹی ہوتی تو کیا آپ اس طرح کرتے جیسے مجھے کرنے کو کہہ رہے ہیں؟"

"سائیں جی! اچھی بات تو یہ ہے کہ اگر یہ میری بیٹی ہوتی تو میں اسے اس ماحول اور حالات میں ایک پل بھی یہاں نہ رکھتا--- میں جانتا ہوں کہ آپ اسے اسی ماحول میں رکھنے پہ مجبور ہیں لیکن آپ اس کا نکاح کر کے رخصت کرنے پہ مجبور تو نہیں ہیں---"

سائیں مولا بخش زچ ہو کر بولا۔ "آپ ٹھیک فرماتے ہیں' لیکن اس حالت میں جب کہ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر صحت مند نہیں' اس قسم کے اہم معاملے پہ بات چیت کرنا میں مناسب نہیں سمجھتا--- دوسری بات یہ کہ اسے اس ماحول اور ان حالات میں یہاں رکھنے سے میری ذمہ داریوں اور مصروفیات میں بہت اضافہ ہو گیا ہے جو میرے لئے پریشانی کا باعث ہے لیکن بہر طور مجھے ہی یہ سب کچھ برداشت کرنا ہے--- میں آپ کو ہاں یا ناں کا جواب دوں گا' انتظار کریں---"

کچھ اور رسمی سی بات چیت کے بعد وہ لوگ باہر آگئے۔ شاہ مراد کو ساتھ لئے ہوئے وہ پھر سب حافظ جی کے حجرے کے باہر چارپائیوں پہ آبیٹھے اور ادھر کافی دیر اس موضوع پہ بات چیت ہوتی رہی۔ اس کے بعد صبح صبح واپس جانے کا ارادہ کرتے ہوئے وہ سو گئے لیکن شاہ مراد ان حالات میں کیسے سو سکتا تھا؟--- وہ اوپر درگاہ شریف کے صحن میں آگیا۔ وہ اپنی بدنصیبی پہ آنسو بہا رہا تھا کہ اتنا قریب ہو کر بھی وہ ایک نظر شادو کو دیکھنے کے لئے ترس رہا ہے--- ادھر سائیں مولا بخش کی کیفیت بھی اس سانپ کی سی تھی جس کے حلق میں چھچھوندر پھنسی ہوتی ہے کہ نہ اگلے بنے نہ نگلے جان چھوٹے--- جس لڑکی کو وہ ذہنی رانی بنانا چاہتا ہے' لوگ اسے اس کی بیٹی سمجھ کر اس کا ہاتھ مانگ رہے ہیں۔ آج تک تو یہ کمال ہشیاری سے دوا کے نام پہ ایک مخصوص نشہ آور محلول پلا کر اسے نیم بیہوشی کے عالم میں رکھے ہوئے تھا اور شادو! وہ

زندوں میں نہ مردوں میں، قوت فیصلہ اور گویائی سے محروم تھی۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں یہ نشہ مستقل شادو کی ضرورت نہ بن جائے یا اس کے مضر اثرات سے یہ بالکل پاگل ہی نہ ہو جائے لیکن اگر نشہ نہ دیا جائے تو کہیں آزاد نہ ہو جائے؟۔۔۔ وہ تو پروگرام کے مطابق پہلے شاہ مراد اور اس کے والدین کو شادو سے بددل اور مایوس کرنا چاہتا تھا اور اسی نیم دیوانگی کی حالت میں اس سے نکاح کرنا چاہتا تھا، اس کے بعد وہ شاہ مراد اور شادو سے آسانی سے نبٹ سکتا تھا مگر صورت حال یکسر مختلف ہو چکی تھی۔ اب وہ درگاہ شریف کے لوگوں، پولیس والوں، شاہ مراد اور اپنے ضمیر کی نظر اور گرفت میں آ چکا تھا۔ تاجا مخبر اور چوہدری حق نواز تھانیدار بھی اس کی شادی کے منتظر تھے، کئی بار پوچھ چکے تھے۔ ان لوگوں کو زیادہ دیر ٹال کر وہ اپنی پوزیشن مشکوک نہیں بنانا چاہتا تھا، اسے کوئی جلدی فیصلہ کرنا تھا۔۔۔ کیا کرے، کیا نہ کرے؟ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔۔۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سانپ بھی مرجائے، لاٹھی بھی نہ ٹوٹے مگر ایسی لاٹھی ل نہیں رہی تھی اور سانپ سرہانے بیٹھا تھا۔۔۔ وہ خود بھی تو ایک سانپ بنا اپنی بانبی کے باہر بیٹھا تھا۔ ناسازی طبع تو محض بہانہ تھی، اصل مقصد تو شادو کی نگرانی اور حفاظت تھی۔۔۔ شاہ مراد آسیب کی طرح آس پاس منڈلا رہا تھا، وہ جانتا تھا کہ جس گھڑی یہ دونوں آمنے سامنے ہو گئے پھر کوئی طاقت ان کو علیحدہ نہیں کر سکے گی۔ ابھی تک تو یہ جن اس کی نام نہاد روحانیت کی بوتل میں بند تھا مگر جس دن یہ اس بوتل سے آزاد ہوا تو جاتے وقت نشانی کے طور پر اس کے ٹکڑے کر جائے گا، بس اسی خیال سے وہ لرز جاتا تھا۔۔۔ تاجا مخبر ادھر ہی آ گیا تھا۔

"کیا بات ہے سائیں جی! ادھر اڈا خالی ہے، ادھر تم خالی خالی بیٹھے ہو۔۔۔ طبیعت خراب ہے یا کوئی اور معاملہ ہے۔۔۔ کوئی پریشانی ہو تو کھل کر بات کرو، یار کس لئے ہیں؟"

اس نے ایک ملنگ کو نشہ پانی کا بندوبست کرنے کا حکم دیا اور بولا۔

"بس یار تاجے! طبیعت بھی خراب ہے اور معاملہ بھی۔۔۔ خیر، تم اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟"

"سائیں جی! تھانے سے آ رہا ہوں، وہاں آپ کے دو شاگرد بیٹھے ہوئے ہیں، سردارا قصائی اور بلا شربت والا۔۔۔ دونوں نے کل کارروائیاں ڈالیں تھیں۔ کچھ آپ کو خبر ہے؟"

"نہیں یار! میں تو ہفتہ بھر سے اڈے پر ہی نہیں گیا، نہ ہی وہ لوگ میرے پاس آئے۔۔۔ ہوا کیا؟"

"۔۔۔ وہی جو ان کے کسب ہیں۔۔۔ سردارے نے کسی کی وکھی تو نہیں پھاڑی لیکن لمبی رقم لے اڑا، آسامی نے نو سو روپے رقم بتائی ہے اور یہ صرف پچاس روپے قبول رہا ہے۔۔۔ بلے نے ایک عورت کے گلے سے سونے کی زنجیری اتاری تھی، اس کے بھائی نے وہیں پہ پکڑ لیا۔ اس نے نظر بچا کر زنجیری پیٹ میں ڈال لی۔۔۔ اب دونوں تھانے بیٹھے ہیں، چوہدری صاحب نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔"

"اس وقت، یار!۔۔۔ طبیعت بھی ٹھیک نہیں، اندر شادو بھی بیمار ہے۔۔۔ صبح نہیں ہو سکتا یہ کام؟"

"جناب! بلے کو کسٹر آئل پلا کر اینٹوں پہ بٹھا رکھا ہے اور چوہدری صاحب وہیں دفتر میں موجود ہیں، آسامیاں بھی بٹھا رکھی ہیں، دو تین معتبر بھی موجود ہیں۔ میں بھی اس وقت گلی پہ ٹنگا ہوا ہوں۔۔۔ چلو اٹھو۔"

سائیں مولا بخش نے ایک دو ملنگوں کو پاس بلا کر کچھ ہدایات دیں اور پھر دونوں اٹھ کر تھانے چلے گئے۔

● ●

رات کا دوسرا پہر ختم ہو چکا تھا، اکا دکا لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ جھونپڑی کے باہر مدہم سی روشنی کے نیچے چار پانچ ملنگ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے، دائیں بائیں کچھ سوئے ہوئے بھی تھے اور کسی کسی قبر پہ چراغ آخر شب ابھی تک جھلملا رہے تھے۔ دو سائے ایک قبر کے پیچھے سے نکلے، انتہائی پھرتی اور خاموشی سے جھونپڑے کی پچھلی کھڑکی کے پاس آ کر رک گئے۔ دائیں بائیں جائزہ لے کر ایک سایہ کھڑکی کے اندر پھلانگ گیا، چند منٹوں میں چادر سے لپٹا ہوا ایک بوجھ کھڑکی سے باہر کے سائے کے کندھوں پہ تھا۔ اسی خاموشی اور پھرتی سے وہ سائے قبرستان کی دیوار پھلانگ کر اندھیرے میں غائب ہو چکے تھے۔

● ●

تھانے سے فارغ ہو کر سائیں مولا بخش درگاہ شریف پہنچا تو حسب معمول صحن کی رونق پہ اک نظر ڈالنا نہ بھولا۔۔۔ اپنی مخصوص جگہ پہ شاہ مراد بیٹھا تسبیح کر رہا تھا، لوگوں کی ٹولیاں بیٹھی اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھیں اور اکثر لوگ تھک ہار کر آرام کی غرض سے لیٹے ہوئے بھی تھے۔ رضا کار، چور اچکے، نظرباز، سب ہی تھے۔ وہ کچھ سوچ کر شاہ مراد کے پاس آ گیا اور شاہ مراد اپنی محویت میں یہ بھی نہ جان سکا کہ سر پہ کون کھڑا ہے؟ سائیں مولا بخش نے کھانس کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو اس نے آنکھ اٹھا کر سائیں مولا بخش کو دیکھا اور بوکھلاہٹ سے کھڑے ہونے کی کوشش میں دھڑام سے نیچے گر گیا۔ سائیں مولا بخش اسے سنبھالتے ہوئے پاس ہی بیٹھ گیا۔ شاہ مراد اپنی ٹانگ سہلا رہا تھا۔

"معاف کرنا سائیں سرکار! مسلسل بیٹھے بیٹھے ٹانگیں سن ہو گئیں۔۔۔"

"تم ابھی تک جاگ رہے ہو، آرام کر لیتے۔۔۔ بزرگ کہاں ہیں؟"

"جی، وہ سب حافظ صاحب کے حجرے، مسجد میں آرام کر رہے ہیں۔۔۔ آپ کو معلوم ہے کہ مجھے یہیں بیٹھ کر سکون ملتا ہے۔ یہاں رونق بھی ہوتی ہے اور سامنے روضہ شریف بھی دکھائی دیتا ہے۔۔۔ ویسے آپ کے آنے سے پہلے میں نے کچھ آرام کر لیا تھا۔" وہ ان کے ہاتھ تھام کر بولا۔ "سائیں جی! مجھے

نہ تو اب نیند آتی ہے اور نہ ہی چین۔۔۔ خدا کے واسطے اپنے اس غلام پہ رحم فرمائیں' مجھے میری مراد دے دیں۔ میں ساری زندگی آپ کی غلامی کروں گا۔۔۔" وہ سسکیاں بھرنے لگا۔

"مراد! میں نے بڑی کوشش کی' بڑی دعائیں کیں' چلے کاٹے مگر تمہارے ستارے آپس میں ملتے دکھائی نہیں دیتے۔۔۔ ویسے بھی ان ظالموں نے اس کی حالت ایسی کر دی ہے کہ وہ اب شاید مشکل سے ہی درست ہو۔ اس کی عزت برباد کر دی اور خدا جانے اسے کیا کھلایا پلایا کہ اس کا دماغ ہی مارا گیا ہے' صحت ہے کہ دن بدن ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتی جا رہی ہے۔۔۔ میرا خیال ہے کہ وہ اب شادی کے قابل نہیں رہی۔ میرا مشورہ مانو تو اپنی جوانی اور زندگی برباد نہ کرو اور انسان کی بہتری کس میں ہے' وہ اوپر والا بہتر جانتا ہے' ہم نہیں جان سکتے۔۔۔ میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا کہ تمہارے ستارے اور سنجوگ ریکھا کا رخ اس طرف نہیں' دوسری طرف ہے۔ تمہارے اپنے خاندان کی طرف۔۔۔ تمہاری بہتری اور سب کی بھلائی اسی میں ہے کہ تم اپنے خاندان میں شادی کرو۔ میرے حساب سے یہی تمہارا مقدر ہے' آگے تمہاری مرضی۔۔۔"

"سرکار! آپ کا حکم سر آنکھوں پہ۔۔۔ لیکن دل پہ میرا اختیار نہیں ہے۔ میں اس راستے پہ اتنا آگے بڑھ گیا ہوں جہاں سے واپس آنا میرے لئے ممکن نہیں۔۔۔ وہ جیسے اور جس حال میں ہے' مجھے قبول ہے۔ میں نے اس کی جوانی اور خوبصورتی کو نہیں دیکھا' میں نے تو اس کے درد اور احساس محرومی کو محسوس کیا ہے۔ وہ بانجھ ہو جائے' کوڑھی ہو جائے' اندھی' لولی یا اپاہج ہو جائے' ہر حال میں میری ہے۔۔۔ سرکار! میں آپ کا بیٹا ہوں۔ میں نے کئی دنوں سے اس کی شکل نہیں دیکھی۔۔۔ وہ سخت بیمار ہے' میں ہمدردی اور تسلی کے دو بول ان تک نہیں پہنچا سکا صرف اس لئے کہ آپ اس کے مرشد اور پیشوا ہیں۔ وہ آپ کی بیٹی جیسی ہے' آپ کا مقام اور حیثیت ہمیشہ میرے پیش نظر رہے ہیں۔ مجھے اپنے سے زیادہ آپ کی عزت اور شادو کی خوشیوں کا خیال رہتا ہے۔۔۔ میں نے اپنا معاملہ خدا پہ اور آپ پہ چھوڑ دیا ہوا ہے' میرا ایمان ہے کہ میں مایوس نہیں ہوں گا۔"

سائیں مولا بخش تو "بیٹی" کا لفظ سن کر ہی مراقبے میں اتر گیا تھا' آگے وہ کیا کہتا رہا؟ اس کے کانوں تک نہیں پہنچا۔۔۔ وہ اٹھا اور بغیر کچھ کہے اپنے ڈیرے کی طرف چل دیا۔۔۔ ڈیرے پر تاش کی منڈلی ابھی تک جمی ہوئی تھی' اس کو دیکھتے ہوئے وہ سب کھڑے ہو گئے اور چارپائی کی چادر جھاڑنے لگے۔ مولا بخش نے ایک ملنگ سے پانی طلب کیا' پانی پی کر حجرے کی جانب نظر ڈالی اور آواز دے کر ایک عورت کو طلب کیا لیکن اندر تو بے ہوش میں ہوتا تو جواب دیتا۔۔۔ دوبارہ آواز دینے سے جب کوئی باہر نہ آیا تو خود اندر گیا۔ دونوں عورتیں بے ہوش پڑی تھیں اور بابا نورا اوندھا منہ کھولے پڑا تھا' شادو کا بستر خالی۔۔۔ چند لمحے تو وہ مبہوت کھڑا آنکھیں پھاڑے صورت حال پہ غور کرتا رہا اور پھر ایک دم چوٹ کھائے

ہوئے چیتے کی طرح دھاڑا' باہر بوڑھ کے درخت پہ آنکھیں موندے پرندے چیخنے اور پھڑپھڑانے لگے' ملنگوں کی ٹانگیں کپکپا گئیں۔۔۔ جانے والوں نے اپنا کوئی نشان پیچھے نہیں چھوڑا تھا۔ اتنی مہارت' آہستگی اور پھرتی سے یہ کارروائی ہوئی تھی کہ باہر والوں کو پتا کھڑکنے کی آواز تک نہ آئی۔ پانی کے چھینٹوں اور تھپڑ مار مار کر ان عورتوں اور بابے نورے کو ہوش میں لایا گیا۔ پھر ان سے معلوم یہ ہوا کہ یہ لوگ آنکھیں بند کئے' سوئے جاگے لیٹے ہوئے تھے کہ ایک دھپ سی آواز آئی۔ اس سے پیشتر کہ وہ کچھ دیکھ پاتے' مضبوط سے ہاتھ گردنوں کے پیچھے پڑے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ بابا نورا تو منہ کھولے دیوانوں کی طرح آہ' آہ کر رہا تھا۔ دونوں عورتوں کی گردنیں پیچھے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ سائیں مولا بخش فوراً باہر نکلا اور ایک مخصوص ملنگ کو تاجے مخبر کی طرف روانہ کر کے خود مسجد کی طرف آ گیا۔۔۔ حجرے کے باہر وہ لوگ سوئے ہوئے تھے' واپسی پہ صحن میں شاہ مراد کو دیکھا اور اب وہ پھر اپنے ڈیرے پہ تھا۔ ملنگ تھر تھر کانپ رہے تھے' کچھ رو بھی رہے تھے اور تاجے مخبر کا انتظار تھا۔۔۔ یہ کارروائی کون ڈال سکتا ہے؟ شاہ مراد اور اس کے ماں باپ' بھائی' خارج از امکان تھے۔ شاہ دین پٹواری' فتح یار گرداور' باؤ خورشید۔۔۔ ایک ایک چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے شناخت پریڈ کر رہا تھا۔ غصے اور طیش سے اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ وہ اپنے تئیں اس سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا جس کی گردن کسی جانور کے سوا سیر بھاری دیسی چھتر کے نیچے دبی ہوئی ہو۔

تاجے مخبر کے آتے ہی وہ دونوں تھانے کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔ چوہدری حق نواز پیچھے صحن میں سو رہے تھے۔ نائب تھانیدار ابھی باہر برآمدے میں خراٹے لے رہا تھا' کچھ عملہ اور محرر بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ انہوں نے آتے ہی اپنی کہانی سنائی۔ چھوٹے تھانیدار کو جگایا گیا تو اس نے چوہدری صاحب کو جگانے کا مشورہ دیا۔ بعد عجلت و وقت ہنگامی طور پر چوہدری صاحب کو زحمت دی گئی۔ انہوں نے فوراً چند سپاہی سفید کپڑوں میں لاری اڈے اور ریلوے اسٹیشن روانہ کر دیئے' دو پارٹیاں باہر جانے والی سڑکوں پہ ناکہ بندی کے لئے بھیج دیں اور خود چوہدری صاحب مع نائب' ایک سپاہی' تاجا مخبر اور سائیں مولا بخش گاڑی پہ باؤ خورشید کے گھر پہنچے۔ وہاں کوئی اور کرایہ دار تھے' معلوم ہوا کہ دو روز پہلے وہ مکان خالی کر کے کسی نامعلوم جگہ پہ منتقل ہو چکے ہیں' باہر محصول چنگی والوں سے بھی تصدیق ہو گئی۔۔۔ صبح سویرے وہ شاہ دین کے گھر پہ تھے۔ وہ بیچارہ پولیس پارٹی اور خاص طور پہ چوہدری حق نواز کو دیکھ کر گھبرا گیا' خاطر تواضع اور خوشامدوں میں لگ گیا۔ رات بھر گاؤں میں موجودگی کی تصدیق اور دیگر ضروری تفتیش کی غرض سے فتح یار گرداور اور اسے ساتھ لے کر وہ تھانے آ گئے' ادھر ادھر کی رپورٹیں بھی آ گئیں لیکن کوئی کام کی خبر ہاتھ نہ آئی۔ شاہ مراد اور اس کے والدین اور بھائی کا ذکر ضرور آیا لیکن انہیں بے ضرر اور فوجی ہونے کی وجہ سے شامل تفتیش نہ سمجھا گیا' کچھ دیر بعد ناکہ بندی والے بھی بے نیل و مرام واپس آ گئے۔

یہ سب کارروائی بغیر کسی ایف آئی آر کے تھی۔ سائیں مولا بخش باقاعدہ رپورٹ کس حیثیت سے کرواتا؟ نہ کوئی وارث' نہ مدعی' نہ کوئی گواہ' سب چور اور منہ کالے تھے اور کوئی ان سے بھی بڑا اپنی کارروائی ڈال گیا تھا' چور کو مور پڑ گیا تھا۔ فتح یار اور شادو دین پٹواری سے بھی ایک موٹی رقم کے علاوہ کچھ نہ نکل سکا۔ باؤ خورشید اور راحت جان کے متعلق بھی ان کی معلومات صفر تھیں' ان دونوں کو فارغ لیکن پابند کر کے رخصت کر دیا گیا۔ اب سارا ملبہ باؤ خورشید اور راحت جان پہ ڈال کر ان کی تلاش شروع کر دی گئی۔ صبح سارے ملنگ' دونوں عورتیں' بابا نورا بھی تھانے لائے گئے اور موقع ملاحظہ بھی کیا گیا۔ اس بات پہ سب ہی متفق تھے کہ یہ کارروائی کسی عام آدمی کی نہیں' واردات کرنے والے ایک سے زیادہ ہیں' تربیت یافتہ اور باخبر ہیں۔

سائیں مولا بخش واپس آ چکا تھا۔۔۔ اس نے سب کو ہدایت کر دی تھی کہ اس بات کا چرچا نہیں ہونا چاہئے۔ شاہ مراد' اس کے گھر والے اور حافظ صاحب ابھی تک اس واقعہ سے بے خبر تھے' جانے سے پہلے وہ پھر سلام کے لئے آئے۔ سائیں مولا بخش نے انہیں تسلی دی کہ بہت جلد ان کو جواب مل جائے گا' احتیاطاً اس نے ان کا پتہ بھی لے لیا اور شاہ مراد ان کو لاری اڈے چھوڑنے کے لئے ساتھ چلا گیا۔

مسلسل جاگنے اور اس واقعے سے مولا بخش واقعی بیمار پڑ گیا۔۔۔ ادھر اڈے پہ مسلسل غیر حاضریاں تھیں' زیادہ تر لوگ یہیں چلے آتے تھے اور دیگر قانونی اور غیر قانونی مصروفیات الگ متاثر ہو رہی تھیں' کچھ کارندے غائب بھی ہو گئے تھے۔ منشیات کی خرید و فروخت کے معاملات اب بدمعاملگی اور تاویندگی کی جانب بڑھنے لگے۔ پچھلے کئی مہینوں میں اچھی خاصی رقم پولیس اور تاجے مخبر کے علاوہ دیگر کرائے کے کارندوں کی جیبوں میں منتقل ہو چکی تھی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کا خود اپنے آپ سے اعتبار اٹھتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی تو اس کے اندر سے یہ سوچ بھی سر اٹھانے لگتی کہ واقعی یہ لڑکی شادو کوئی منحوس چیز ہے۔ جب سے اس کے سبز قدم اڈے پہ پڑے' اڈا ہی اجڑ گیا۔ جہاں دھن برستا تھا وہاں اب ایک دمڑی کی آمدن نہیں رہی۔ پریشانی' رت جگے' اغواء' وارداتیں' تھانہ' پیشیاں اس کا مقدر بن گئیں اور شاہ مراد کو جب اس سانحہ کا علم ہو گا' پتہ نہیں کیا قیامت توڑے گا؟۔۔۔ یہ سوچتے سوچتے اس کے اندر ہول سا اٹھنے لگا۔

کہتے ہیں کہ مصیبت جب آتی ہے تو اکیلی نہیں آتی' اپنے ساتھ پریشانیوں کا پورا کنبہ بھی لاتی ہے اور جب تک چاہے' پڑاؤ ڈالے رہتی ہے۔ اسی دوران اس کے پاس ایک بیوپاری آ گیا۔ اس منشیات کے بیوپاری کا تعلق بھی مصیبت کے اسی کنبے سے تھا' اس کے ساتھ اس کا پرانا لین دین تھا اور اب وہ کسی کیس میں مفرور ہو کر اس کی پناہ میں رہنا چاہتا تھا اور اپنے حساب سے ایک اچھی موٹی رقم کا بھی طلب گار تھا۔ ایک دو روز تو اس کی خوب خاطر مدارت' نشہ پانی کیا پھر اپنی پریشانیاں' بیماری' مندا وغیرہ سنا کر رقم کی

ادائیگی میں کچھ مہلت چاہی۔ وہ اپنی جگہ مجبور تھا' اس سے رقم حاصل کر کے کسی اور مناسب جگہ روپوش ہونا چاہتا تھا۔ اس تکرار و بحث کے دوران نائب' چوہدری حق نواز اور تاجا مخبر آ پہنچے۔ وہ شادو کے مسئلے میں باؤ خورشید کے متعلق بتانے آئے تھے کہ وہ اپنی نوکری سے مسلسل غیر حاضر ہے' وہ کہاں ہے؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ اصل مقصد ان کا بھی کچھ خرچہ پانی حاصل کرنے کا تھا۔ پولیس دیکھ کر بیوپاری نے بلا سوچے سمجھے ریوالور نکال کر فائر کر دیا اور ایک ہوشیار چیتے کی مانند جست لگا کر قبروں کو پھلانگتا ہوا درگاہ شریف کی جانب بھاگ نکلا۔ وہ شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ سائیں مولا بخش نے اس کی مخبری کی ہے۔ ادھر ادھر لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ نائب تھانیدار اور تاجا مخبر بیوپاری کے پیچھے لپکے لیکن وہ ان کی دسترس سے دور نکل چکا تھا' نزدیک سے فائر کی ہوئی جنس بور کی گولی مولا بخش کی کہنی کے جوڑ کو توڑتی ہوئی بوڑھے بوڑھ کی داڑھی میں جا لگی' سائیں مولا بخش کو فوراً ہسپتال منتقل کیا گیا۔ جھونپڑے پہ اب پولیس بیٹھ گئی۔ تلاشی کے دوران اس بیوپاری کے بریف کیس سے ہزاروں جعلی ڈالر' جعلی پاسپورٹ اور ہزاروں اصلی روپے نکلے۔۔۔ مسلسل چوبیس گھنٹے سائیں مولا بخش آپریشن کے بعد بے ہوش رہا۔ ہوش آیا تو بازو تو کاٹ چکا تھا' کہنی کے نیچے پوری کلائی اور ہاتھ غائب تھا۔ وہ بیان دینے کے قابل ہوا تو پولیس نے رپورٹ درج کی اور مفرور کے خلاف ارادہ قتل کا مقدمہ بنا کر تلاش شروع کر دی۔ بریف کیس کا مال بغیر کسی ڈکار کے ہضم ہو گیا۔ شادو کے اغواء والی واردات بھی اسی مفرور کے کھاتے میں ڈال دی گئی۔۔۔ اس واقعے سے درگاہ شریف کے ماحول میں اک بے چینی سی پھیل گئی تھی' لوگ مختلف قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ سائیں مولا بخش کے پروردہ کارندے' معتقد اور ملنے جلنے والوں میں خوف' ہمدردی اور پریشانی کا ملا جلا تاثر پھیلا ہوا تھا۔ پھر لوگوں کا ہسپتال میں آنا جانا لگ گیا۔ پھل پھول' مٹھائیاں' مختلف انواع کے نذر نذرانے وہاں پہنچنے شروع ہو گئے۔ ہسپتال والوں کے بھی دن پھر گئے۔ واقعہ کی سنگینی کے پیش نظر ایک دو پولیس والے بھی سادہ کپڑوں میں چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر تھے' حافظ صاحب بھی پھیرا ڈال گئے۔ شاہ مراد تو اپنی ڈیوٹی پر تھا' دونوں واقعات بلکہ حادثوں سے بے خبر' ورنہ جمعرات سے پیشتر ہی وہ یہاں پہنچ جاتا اور جمعرات میں ابھی ایک آدھ روز باقی تھا۔۔۔ جمعرات کے روز وہ آیا تو دروازے پر ہی اسے خبر مل گئی لیکن صرف ایک خبر۔۔۔ وہ پریشانی کے عالم میں حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا جہاں دوسری روح فرسا خبر اس کی منتظر تھی لیکن حافظ صاحب نے یہ خبر جس انداز اور جس اچھے طریقے سے اسے سنائی اس سے وہ حواس باختہ تو نہ ہوا لیکن اندر سے ٹوٹ ضرور گیا' آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان حالات میں کیا کرے' کہاں اسے تلاش کرے؟۔۔۔ حافظ صاحب نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے صبر اور برداشت کی تلقین کی اور فرمایا۔

"بیٹا! اس مسکین کی یہ بات پلے باندھ لو کہ صبر کا دامن تھامنے والوں کو وہ کبھی اپنی رحمت سے مایوس

نہیں کرتا۔ تمہاری طلب سچی ہے تو مراد ضرور ملے گی۔۔۔ اٹھارہ سال اس در کی خاک صاف کی ہے اور کچھ نہیں مانگا' اگر کچھ مانگنا پڑا تو پتر مراد! تیری مراد ہی مانگوں گا۔"

وہ ان کے سینے سے لگ کر دھاڑیں مار کر رونے لگا۔

"بس' آج کے بعد تم نے رونا نہیں۔۔۔ پتر! جب من مندر ہوتا ہے تو صنم روٹھ جانے کا احتمال ہر طور رہتا ہے' اسی لئے کہا تھا کہ من مسجد بنالو' رب کو راضی کرلو۔۔۔ ایک فانی انسان کے لئے تیری آنکھوں کے دروازے کھل گئے ہیں' تو چھم چھم رو رہا ہے لیکن کیا کبھی اس کی یاد میں بھی تیری آنکھوں کے بند ٹوٹے ہیں' تیرے دل کے کواڑ کھلے ہیں؟۔۔۔ دل میں پریتم بسائے گا تو یہی حال ہوگا اور اس پروردگار کو بسائے گا تو ہمیشہ شاد رہے گا۔۔۔"

"ہاں' ہاں حافظ صاحب! میں شاد رہنا چاہتا ہوں' ہمیشہ شاد۔۔۔ لیکن حافظ صاحب' مجھے شاد مل جائے گی نا؟"

"ہاں' اللہ کے حکم اور فضل سے ملے گی۔۔۔ صبر۔۔۔ چل' اب ذرا ہسپتال چلیں۔ کسی بیمار کی تیمارداری کرنا ثواب ہے۔"

پھل اور کچھ پھول لے کر دونوں ہسپتال پہنچے تو ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں پٹی تبدیل کر رہی تھیں۔ زخم سے خون کا رسنا ابھی تک بند نہیں ہوا تھا اس لئے ہر دو چار گھنٹے بعد پٹی تبدیل کرنی پڑتی۔ تھوڑی دیر بعد ان کو اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ سائیں مولا بخش بہت کمزور ہو چکا تھا۔ شاہ مراد اور حافظ جی کو دیکھ کر بہت خوش ہوا' کرسیوں پہ بٹھایا۔ شاہ مراد کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے' زبان گنگ تھی مگر وہ پوچھتا بھی کیا اور وہ بتاتے بھی کیا؟۔۔۔ باہر بہت سے ملنے والے اپنی باری کے منتظر تھے لہٰذا پھر حاضر ہونے کا کہہ کر واپس آ گئے۔

❀ ❀

دس پندرہ روز بعد سائیں مولا بخش ہسپتال سے فارغ کر دیئے گئے۔ ہڈی کے جوڑ کا زخم چند دن تو لیتا ہی ہے۔ زخم آہستہ آہستہ مندمل ہونا شروع ہو گیا مگر درد ابھی تک تھا اور ہلانے جلانے سے اور بھی تکلیف میں اضافہ ہو جاتا۔۔۔ حالات آہستہ آہستہ اپنے معمول پہ آنے لگے۔ ملنے ملانے والے جھونپڑے پہ ہی آ جاتے۔ اڈے پہ دوسرے اہلکار مقرر تھے۔ نشہ پانی اور دوسرے کالے دھندوں میں اب کمی آ گئی' آمدنی بھی اسی حساب سے محدود ہو گئی۔ اس کے زیرِ سایہ دھندا کرنے والوں نے بھی سردمہری دکھانا شروع کر دی تھی' اکثر معاملات میں کھیلے کرنے شروع کر دیئے تھے۔ نذر نیاز کی آمدورفت میں تو پہلے ہی کمی واقع ہو گئی تھی' اب لین دین والوں نے بھی ٹال مٹول شروع کر دی۔۔۔ یہ تیسرا ہفتہ تھا کہ تاجا مخبر بلا اجازت کے بغیر رخصت ہو رہا تھا اور آج بھی تاجا مخبر ہونے عجیب سے موڈ میں بیٹھا ہوا تھا' نشہ پانی سے بھی انکار

کر دیا۔

"کیا بات ہے تاجے' طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"خاک ٹھیک ہونی ہے جی' طبیعت۔۔۔ سچ کسی نے کہا ہے کہ رنڈی کا بھڑوا' پولیس کا مخبر اور دھوبی کا کتا' ان کی کہیں عزت نہیں ہوتی' ان کو ذلت اور جوتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا۔۔۔ سوچتا ہوں یہ کام چھوڑ دوں' یہ شہر چھوڑ دوں' کہیں اور چلا جاؤں اور محنت مزدوری کر کے زندگی کے دن پورے کروں۔۔۔"

"یار' کیا ہو گیا۔۔۔ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ؟"

"ہونا کیا ہے سائیں جی!۔۔۔ چوہدری صاحب نے اتنی بے عزتی کی ہے کہ آج ڈوب مرنے کو جی چاہتا ہے' رتی ماشہ لحاظ نہیں رکھا۔ میں نے بتایا بھی' وہ خود بھی جانتے ہیں کہ آپ کی حالت اور حالات کیسے ہیں۔۔۔ آج کہہ رہے تھے کہ اگر خالی ہاتھ ہوتا تو جوتے مار مار کر کھوپڑی پلپلی کر دوں گا۔ اب آپ ہی بتائیں سرکار' کیا کروں؟"

"یار' تاج دین! میری جان پہ بنی ہوئی ہے۔ جو کچھ میرے پاس تھا وہ تو میں آپ سب کو دے بیٹھا' راحت جان کا مال اور پھر بریف کیس والی ساری نقدی بھی تو ان کے پاس گئی ہے۔ شاہ دین پٹواری اور فتح یار گرداور کو بھی انہوں نے خوب صاف کیا' انہیں کچھ تو لحاظ کرنا چاہئے۔۔۔ یہاں میرا سلسلہ تو تمہارے سامنے ہے۔۔۔"

"تم اپنی جگہ پہ ٹھیک ہو' پر گھوڑا گھاس سے دلچسپی رکھتا ہے' حالات سے نہیں اور جو ایک مرتبہ پولیس کے کھلے لگ جائے یا گھوڑا خرید لے میری سرکار! پھر پولیس اور گھوڑے دونوں کو برابر کھلانا پڑتا ہے۔۔۔ اچھا' میں چلتا ہوں۔ تم سب کچھ مجھ سے زیادہ جانتے اور سمجھتے ہو۔۔۔"

سائیں مولا بخش سے نیند کوسوں دور تھی۔ بازو کے درد اور اس سوچ سے وہ بے حال تھا کہ آدھے بازو سے وہ کیسے زندگی بسر کرے گا؟۔۔۔ وہ نیم محتاج سا ہو گیا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے وہ سارے چہرے آ گئے جو بازوؤں' ٹانگوں' ہاتھوں' آنکھوں سے محروم تھے۔ اس نے خود کئی کے ہاتھ پیر توڑے تھے اور آج وہ خود ان جیسا ہو گیا تھا۔۔۔ کیا اس کا مقدر بھی کٹا ہوا بازو آگے بڑھا کر بھیک مانگنا بن چکا ہے؟۔۔۔ نہیں' ایسا نہیں ہوگا۔ ایسا کبھی نہ ہوگا۔۔۔ میں نے ہمیشہ شیروں جیسی زندگی گزاری ہے لیکن میرے ٹکڑوں پہ پلنے والے آج مجھے ہی آنکھیں دکھا رہے ہیں' یہ کیا ہو گیا ہے؟

اس نے ایک ملنگ کو آواز دی' کلیان بھرنے کا حکم دیا۔

صبح سویرے سادہ کپڑوں میں ایک سپاہی ڈیرے پہ آیا اور پیغام لایا کہ اپنے سارے ملنگوں سمیت تھانے حاضر ہو جاؤ۔ ساری رات کا جاگا ہوا بیمار یہ حکم سن کر سخت پریشان ہوا اور سوچا کہ یہ صبح صبح تھانے

ظلی، خالی از علت نہیں ۔۔۔ عظم حاکم مرگ مفاجات، چارو ناچار اٹھا اور مشٹلوں کا دیا ہوا تحفہ لئے داخل ہوا۔ چوہدری صاحب آرام فرما رہے تھے۔ وہ پہر تک بھوکے، نڈھال، نشے پانی سے ٹوٹے ہوئے ملنگ برآمدے میں پڑے انگڑائیاں توڑتے رہے، سائیں مولا بخش ایک کانٹے کی چارپائی پہ کمرے میں ہائے ہائے کرتا رہا۔ آخر آواز لگا کہ چوہدری صاحب دفتر تشریف لے آئے ہیں۔ پھر سائیں مولا بخش کو طلب فرمایا گیا۔

"ہاں بھئی سائیں بادشاہ! کیسے ہو۔۔۔ زخم وغیرہ بھرا ہے یا نہیں؟؟"

"بس جی! تکلیف تو بہت ہے، مجھ میں تو اٹھنے بیٹھنے کی بھی ہمت نہیں۔ آپ کا حکم تھا چوہدری صاحب! بڑی مشکل سے آیا ہوں۔۔۔ کیا حکم ہے؟"

"سائیں! تمہاری تکلیف کا احساس تو ہے پر کیا کریں، سرکاری بندے ہیں۔ قانون کے مطابق کارروائی تو کرنا پڑتی ہے۔۔۔ بات یہ ہے کہ میں نے کافی تفتیش کی ہے، ملزم ابھی قابو نہیں آیا۔ میرے پاس جو سرکاری رپورٹ آئی ہے اس کے تحت یہ ملزم بڑا خطرناک ہے۔ تین ضلعوں کی پولیس اس کے پیچھے ہے اور اس کی گرفتاری پہ انعام بھی مقرر ہے لیکن اس کا کھرا کچھ اغوا والی واردات کے کھروں سے نہیں ملتا۔ ایک تو مجھے سارے ملنگوں کے کھرے چاہئیں اور دوسرے یہ کہ یہ مفرور تمہارے پاس دو روز رہا تو تم نے اس کے متعلق رپورٹ کیوں نہیں کی؟ تمہارا اس کے ساتھ کیا تعلق تھا اور اگر کوئی تعلق تھا تو ہمیں کیوں بے خبر رکھا؟۔۔۔ مجھے تو یہ بھی شک ہے کہ اس لڑکی کو تم نے خود ہی کہیں فروخت کر دیا ہے۔" وہ کاغذات سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ "قانونی طور پر یہ لڑکی تمہاری نگرانی اور سپرداری میں تھی۔ اس کاغذ پہ تمہارے اور گواہوں کے دستخط موجود ہیں۔ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم اس لڑکی کو برآمد کرو ورنہ قانونی طور پر میں تمہیں پابند کرنے پہ مجبور ہوں۔"

سائیں مولا بخش کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ سارا معاملہ سمجھ گیا۔ آخر اس کی عمر کی سیاہی میں اس کے بال سفید ہونے کو آئے تھے۔ وہ اپنی ساری توانائیاں جمع کرتے ہوئے بولا۔

"مائی باپ! میری اتنی جرات کہاں کہ میں آپ کے حکم اور علم کے بغیر سانس بھی لے سکوں۔۔۔ میں اس مفرور کو پندرہ بیس برس سے جانتا ہوں، دو چار بار وہ میرے پاس وظیفے کے لئے آیا ہے۔ بڑا صاف کاروباری آدمی ہے۔ آپ کے تشریف لانے سے پہلے وہ جانا ہی چاہتا تھا کہ آپ کے اچانک آجانے پہ وہ گھبرا گیا یا شاید یہ سمجھا ہو کہ میں نے مخبری کی ہے۔ اس گھبراہٹ میں اس نے فائر کر دیا۔ وہ کس قسم کی واردات کر کے آیا ہے؟ میں بالکل لاعلم ہوں۔۔۔ رہی بات اغوا کی، خدا جانتا ہے کہ میں بالکل بے گناہ ہوں۔ میں اس لڑکی کو پسند کرتا تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو سب سے پہلے میں آپ سے اجازت لیتا، پر داری کچھ کر نہ دیتا۔ آپ کے قدموں میں رہ کر میں آپ سے ایسی

حرامزدگی نہیں کر سکتا۔" اس نے جیب سے ایک گٹھڑی نکال کر میز پر رکھتے ہوئے ہاتھ جوڑے۔ "چوہدری صاحب! مجھے ابھی پکڑ کر اندر کر دیں، میں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں تو جوانی ہی اسی کاروبار میں ہوا ہوں اور شاید مروں گا بھی اسی دھندے میں۔۔۔ مگر خدا کے واسطے میرے اوپر یہ بدنامی نہ ڈالیں۔ میں آپ کو اندھیرے میں رکھ کر کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔"

چوہدری نوٹوں کو ایک طرف کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے تیرا بڑا لحاظ ہے سائیں! اس مرتبہ تو میں کسی نہ کسی طریقے سے بچاؤں گا مگر آئندہ خیال رکھنا۔ ایسے لوگوں سے پرہیز کرو۔۔۔ ویسے میں ابھی مطمئن نہیں ہوا۔ وہ لڑکی کہاں گئی؟ اسے کون لے گیا ہے؟۔۔۔ خیر، پتہ چل جائے گا۔ تم جاؤ اور اپنی صحت کا خیال رکھو، کھاؤ پیو۔ اپنے دھندے کی طرف دھیان دو۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "جیب کٹی اور نہ کوئی واردات ہوئی ہے، یہی حالت رہی تو ہمیں بھی کسی اور طرف کے لئے چلا جانا چاہئے۔۔۔ یہ اچھی طرح یاد رکھو کہ چاندی جیسا اور دودھ دینے والی گائے کو کسی بھی وقت بیچا جا سکتا ہے، اچار ابھی کھلایا جا سکتا ہے مگر سوکھے تھنوں والی، سوکھے تنکے کھاتے ہوئے بھی دکھتی ہے۔ میرا خیال ہے تم میرا مطلب اچھی طرح سمجھ گئے ہو گے؟"

"۔۔۔ سمجھ گیا چوہدری صاحب! آپ کو شکایت نہیں ہو گی۔" اس نے سر جھکا کر سینے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ ہاں، یاد آیا۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اس فوجی کا؟؟"

"چوہدری صاحب! اس کا نام شاہ مراد ہے، بڑا شریف اور نیک لڑکا ہے جی!"

"سائیں جی۔۔۔؟" وہ کہنیاں میز پہ ٹکاتے ہوئے بولا۔ "نیکی اور شرافت کی طرح بدی اور خباثت بھی ہر شخص کے اندر موجود ہوتی ہے۔ ان دونوں میں سے وہ کس کو سامنے لاتا ہے، کس کو چھپا کے رکھتا ہے، اس پہ کوئی دوسرا فوری فیصلہ نہیں دے سکتا۔۔۔ لمبی لمبی داڑھیوں، پوشوں، تسبیحوں والے پیروں، مولویوں اور نورانی چہروں کے پیچھے تم نے اکثر بڑے بڑے شیطان صفت، ہوس پرست اور چور، ڈاکو، قاتل دیکھے ہوں گے اور اسی طرح داڑھی منڈھوں، عام سے بظاہر جاہل مزدوروں، پاگلوں اور برے نظر آنے والوں میں بڑے بڑے اللہ کے پیارے۔۔۔ سائیں جی! کسی کی شرافت دیکھ کر اسے شریف سمجھنے کی جلدی نہ کرو، وہ ذات شریف بھی ہو سکتا ہے۔۔۔" وہ ہنسنے لگا۔ "اس فوجی کو ذرا میرے پاس بھیجنا، میں بھی اس کی شرافت دیکھوں۔۔۔"

"بہت اچھا جیسے آپ کا حکم۔۔۔ میں اسے آپ کے پاس بھیج دوں گا۔"

وہ واپس آیا تو اس کی رہی سہی پھونک بھی نکل چکی تھی۔ وہ اچھی طرح جان چکا تھا کہ پولیس اور پیٹ کبھی کے دوست نہیں ہو سکتے۔ ان دونوں کو بھرنے کے لئے دولت چاہئے اور دولت کہاں سے آئے؟ اس سے دونوں کو کوئی سروکار نہیں۔۔۔ بازو کے درد اور کمزوری نے اسے بے حال کر رکھا تھا۔ چارپائی پہ

لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ وہ عجیب سی بے بسی' تنہائی اور بے کلی محسوس کر رہا تھا۔ بازو کٹنے سے جیسے وہ آدھا رہ گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یقیناً اسے شادو اور شاہ مراد کی بددعا لگی ہے' اس کے اپنے من کے کھوٹ نے اسے آج کھوٹا کر دیا ہے۔ شادو اس کی بیٹی جیسی تھی' اسے چاہئے تھا کہ بیٹیوں کی طرح اسے رخصت کرتا۔ شاہ مراد کی مراد بھی اسے مل جاتی اور وہ بھی کوئی نیکی کما لیتا لیکن اب تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا' نہ شادو رہی اور نہ عزت و صحت۔۔۔ اب آگے کیا ہوتا ہے؟ یہ اللہ جانے۔۔۔ کیوں نہ میں یہ برے کام چھوڑ کر باقی زندگی اللہ اللہ کروں کہ ایک بازو کے ساتھ سوائے بھیک مانگنے کے اور کر بھی کیا سکتا ہوں؟ اس کام میں تو بہت مضبوط بازوؤں کی ضرورت ہوتی ہے' اور پرائے بازوؤں پہ کہاں تک بھروسہ اور آسرا کیا جا سکتا ہے۔۔۔ کہیں چلا جاؤں مگر کہاں؟ یہی زمین' یہی روایات' یہی لوگ' یہی پولیس' صرف چہروں اور ناموں کی تبدیلی کے ساتھ یہی مسائل' یہی بکھیڑے' یہی سب کچھ۔۔۔ سوچتے سوچتے اس کا دماغ پلپلا ہو چلا تھا۔

بہت سے لوگ زیارت اور ملاقات کے لئے جمع ہو چکے تھے' اب وہ ان میں مصروف تھا۔

○ ○

شاہ مراد' تھانے پہنچا تو چوہدری حق نواز کسی پارٹی کے ساتھ گرما گرم بات چیت میں مصروف تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے انتظار کے بعد وہ اندر داخل ہوا تو چوہدری صاحب نے مسکراتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا' چائے منگوائی۔

"تمہارا نام شاہ مراد ہے؟"

"جی۔۔۔ میرا نام شاہ مراد ہے' باپ کا نام کرم الٰہی۔۔۔ میں سرگودھے کے قریب ایک چک کا رہنے والا ہوں۔ یہاں فوج میں ملازم ہوں۔ وہاں ہمارا زمیندارہ ہے' اللہ کا بڑا فضل ہے۔۔۔"

"ہوں۔۔۔" چوہدری اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "پڑھے لکھے بھی ہو۔۔۔؟"

"جی' میٹرک پاس ہوں۔ کالج میں ایک سال لگانے کے بعد چھوڑ دیا۔"

"آگے کیوں نہیں پڑھے۔۔۔؟"

"جی' لڑائی ہو گئی تھی جس میں گولی چل گئی۔ پھر والدین نے مجھے زبردستی فوج میں بھرتی کروا دیا۔۔۔"

"لڑائی کی وجہ۔۔۔؟"

"۔۔۔ وجہ یہ تھی کہ کچھ بدمعاش ٹائپ کے طالب علم ایک غریب سی لڑکی کو چھیڑتے تھے' وہ بے چاری ان سے بہت پریشان تھی۔ میں نے شرافت سے ان لڑکوں کو سمجھانے کی کوشش کی تو اسی بات پہ جھگڑا بڑھ گیا۔ انہوں نے فائر کھول دیا لیکن بچ بچا ہو گیا۔۔۔"

"سائیں مولا بخش کو کب سے جانتے ہو۔۔۔؟"

"بس یہی جی' آٹھ دس ماہ سے۔۔۔ بڑے اچھے بزرگ ہیں جی!"

"۔۔۔ اور شادو کو بھی جانتے ہو؟"

"ہاں جی' شادو کو بھی جانتا ہوں' بڑی مظلوم دکھوں ماری لڑکی ہے۔۔۔ سائیں صاحب کی موجودگی میں اتفاقاً ملاقات ہوئی تھی اور دو بار اندر دربار میں بھی ملی۔ اس نے مجھے اپنی تمام کہانی سنائی تھی' کچھ عرصے کے بعد اس کا نشئی خاوند مر گیا۔ پھر اس کے بعد ملاقات نہیں ہوئی۔۔۔"

"تم جانتے ہو کہ وہ دو بار اغواء ہو چکی ہے۔ پہلے اغواء کے بعد وہ سائیں مولا بخش کے پاس کئی روز رہی' کیا تم نے اس سے ملنے کی کوشش کی۔۔۔؟"

"اس کے اغواء کے بارے میں بابے نورے نے مجھے بتایا تھا' اس کی موجودگی کا بھی علم تھا مگر میں ایسا بے غیرت نہیں ہوں کہ اس سے ملنے کی کوشش کرتا۔۔۔"

"تم نے بتایا کہ تم پہلے بھی اس سے مل چکے ہو' اس وقت تمہاری غیرت کہاں تھی؟"

"جی نہیں' میں ارادتاً اس سے نہیں ملا' ہم اتفاقاً ملے۔"

"تم اس لڑکی کو چاہتے ہو۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ شادی کرنا چاہتے تھے؟"

"چوہدری صاحب! وہ لڑکی بڑی مظلوم ہے۔ اس کا ایک بہن کے علاوہ کوئی نہیں۔۔۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اس کو اپنا کر اس کا دامن خوشیوں سے بھرنا چاہتا ہوں۔ اس کی خاطر میں نے اپنے ماموں کے گھر کا رشتہ توڑ دیا ہے۔ میں شادو کو اپنی زندگی سے بھی زیادہ چاہتا ہوں۔۔۔"

"اس سلسلے میں تم نے کیا قدم اٹھایا۔۔۔؟"

"میرے والدین اور بھائی شاہ جمال' سائیں جی کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے' ہمارے ساتھ حافظ صاحب بھی تھے۔ ہم نے سائیں جی سے شادو کا رشتہ مانگا' ہر قسم کی تسلی بھی دی مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔۔۔ انہوں نے مجھے کئی بار کہا ہے کہ تمہارے ستارے نہیں ملتے' سنجوگ ریکھا برابر نہیں۔۔۔"

"تم جانتے ہو کہ وہ پھر اغواء کر لی گئی ہے۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ کس کا کام ہے؟"

"رب دی رب جانے جی' کہ یہ کس کا کام ہے۔۔۔ اگر مجھے معلوم ہو جائے تو وہ لوگ زندہ نہیں رہ سکتے۔"

"۔۔۔ کہتے ہیں کہ وہ لڑکی بڑی منحوس اور بدقسمت ہے' جہاں جاتی ہے برباد کر دیتی ہے اور پھر یہ بھی کیا پتہ کہ اس کی عزت بھی محفوظ رہی ہے یا نہیں۔۔۔ ایسی صورت میں اگر وہ تمہیں مل بھی جائے تو کیا تم اس سے شادی کرنے کو تیار ہو؟"

"چوہدری صاحب! ہمارے نبی پاکؐ کا فرمان ہے کہ بیٹیاں اللہ کی رحمت ہوتی ہیں اور وہ بھی تو کسی کی بیٹی ہے' وہ کیسے منحوس اور باعث زحمت ہو سکتی ہے؟--- اب رہا آپ کا دوسرا سوال' تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ہر حال اور ہر شکل میں میری روح ہے' انشاء اللہ ہم بامراد ہوں گے۔" وہ روہانسو ہو گیا۔

"آخری ایک بات--- اگر میں یہ کہوں کہ اس کے غائب کرنے میں سائیں مولا بخش کا ہاتھ ہے اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے--- تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

وہ کانپتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ "چوہدری صاحب! اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو پتہ نہیں میں کیا کر گزرتا--- سائیں صاحب میرے بزرگ ہیں اور شادو ان کی بیٹی جیسی ہے--- یہ دیکھئے!" وہ مٹھی کھولتے ہوئے بولا۔ "یہ ڈوریاں' یہ ان ہی کی دی ہوئی ہیں' ان کی ہدایت پر میں سورۂ یوسف کا وظیفہ کر رہا ہوں' وہ میرے لئے چلے کاٹتے ہیں پھر آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"جوان! جذبات میں آنے کی ضرورت نہیں' یہ تھانہ ہے جہاں تم سے ہر قسم کا سوال کیا جا سکتا ہے--- ایک سوال اور--- اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ لڑکی ماں بننے والی ہے اور ہونے والے بچے کے باپ کا پتہ نہیں تو---؟"

"چوہدری صاحب! میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ ہر حالت میں میرے لئے میری زندگی ہے۔" وہ ایک لمحے کو رکا پھر بولا۔ "اجازت ہو تو ایک سوال میں بھی کروں؟"

"ہاں' پوچھو--- کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"کیا شادو زندہ ہے اور محفوظ ہے--- آپ کو اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟"

"--- ویسے میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کے لئے پابند تو نہیں لیکن اتنا بتا سکتا ہوں کہ ہم پوری جانفشانی سے اسے تلاش کر رہے ہیں۔ تم احتیاطاً" اپنے گاؤں اور یہاں کا پتہ مجھے لکھوا جاؤ اور جب بھی شہر آؤ اور دل چاہے تو مجھے مل سکتے ہو' اس دوران اگر تمہیں کوئی معلومات ملیں تو بھی فوراً مجھے اطلاع کرو--- اچھا جوان! خدا حافظ--" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "یہ ساری گفتگو تم اپنے سینے میں رکھ لو گے' یہ بہت ضروری ہے۔"

شاہ مراد سینے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "انشاء اللہ!"

وہ باہر نکل آیا۔ سڑک پہ ایک تانگے سے حافظ صاحب اترتے ہوئے نظر آئے' ان کے ساتھ ایک سپاہی بھی تھا۔ انہیں اس جانب آتا دیکھ کر شاہ مراد بہت حیران ہوا' قریب پہنچ کر سلام کیا اور پوچھا کہ آپ ادھر کہاں تشریف لائے ہیں؟ وہ کہنے لگے۔

"بھئی یہاں بھی اللہ کی مخلوق رہتی ہے' ادھر میں چوہدری صاحب کے بچوں کو پڑھانے آتا ہوں--- تم ادھر کہاں گھوم رہے ہو؟"

"جی' مجھے چوہدری صاحب نے تفتیش کے لئے بلایا تھا---" شاہ مراد نے جواب دیا۔

● ●

شاہ مراد نے اپنے گاؤں اطلاع کر دی تھی۔ اس کے والدین اور بھائی شاہ جمال آئے ہوئے تھے' سائیں مولا بخش کے لئے وہ خاص طور پر دیسی گھی لائے تھے۔ پھر بہت سا وقت انہوں نے اکٹھے گزارا۔ سائیں مولا بخش کو ان کے آنے پر بڑی تقویت ہوئی۔ شادو کے غائب ہو جانے پہ انہیں بہت حیرت اور افسوس ہوا' وہ اندر سے خوش بھی تھے کہ قدرت نے خود ہی ان کی بہتری کے مطابق انتظام کر دیا اور آگے بھی بہتر ہی ہو گا۔ دو روز رکنے کے بعد وہ لوگ واپس چلے گئے۔ اس دوران وہ حافظ صاحب کے گھر' ان کی بچیوں سے ملنے کے لئے جانا چاہتے تھے جن کے لئے وہ گاؤں سے سوغاتیں بھی لائے تھے مگر حافظ صاحب کچھ گھریلو مجبوریوں کا ذکر کرتے ہوئے معذرت چاہنے لگے۔ گھر بھی ذرا دور تھا' ان کے مالی حالات بھی کچھ اچھے نہ تھے اور ویسے بھی وہ بیٹیوں کی وجہ سے گھر میں کسی کا آنا جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ بیٹا تو کوئی تھا نہیں' لے دے کر کی چار بیٹیاں تھیں۔ باپردہ' شرم و حیاء والی' دیندار' محلے میں کہیں آنا جانا نہیں بس گھر اور نماز روزہ' بڑی بیٹی کلثوم نے صرف سات جماعتیں پڑھی تھیں' اس سے چھوٹی زلیخا جو سکول تو گئی نہیں البتہ چھوٹی عمر میں قرآن حفظ کر لیا۔ اس سے دو چھوٹی بلقیس اور حنیفہ سکول بھی جاتیں اور قرآن شریف بھی حفظ کرتیں۔ ان کی اہلیہ سدا کی روگی' گنٹھیے کی مریض دیندار خاتون' ذرائع آمدن نہ ہونے کے برابر' بس اللہ توکل زندگی گزر رہی تھی۔ دور دور تک کوئی رشتہ دار نہ تھا بس محبت' مروت اور انسانیت کے ناتے بہت سے ہمدرد اور جاں نثار کرنے والے تھے' ان ہی لوگوں میں چوہدری حق نواز تھانیدار بھی تھا جو ان کی بے حد عزت کرتا۔ یہ اس کی بیٹیوں کو قرآن پڑھاتے اور اتفاق سے چوہدری حق نواز بھی چار عدد بیٹیوں کا باپ تھا۔ حق محنت کے طور پر انہوں نے کبھی بھی کچھ قبول نہ کیا' وہ کہتے کہ یہ علم فی السبیل اللہ ہو تو عاقبت سنوارتا ہے۔ یہی چند ایک خوبیاں تھیں جن کی وجہ چوہدری حق نواز ان کی باپ جیسی عزت اور قدر کرتا تھا اور لطف یہ کہ حافظ صاحب نے آج تک ان کے گھر سے پانی تک نہ پیا' نہ ہی کبھی کوئی تحفہ یا ہدیہ قبول کیا۔

● ●

شاہ دین پٹواری کی بیوی کئی ہفتوں سے درگاہ شریف سلام کرنے کا پروگرام بنا رہی تھی لیکن گھریلو پریشانیاں' مصروفیات اور خاص طور پر شادو کا غائب ہونا' شاہ دین کا زخمی ہونا' مالی طور پہ زیرباری آڑے آتی رہی۔ شاہ دین چڑچڑا سا ہو گیا تھا۔ جب بھی وہ جانے کا کہتی' اسے بری طرح جھاڑ پلا دیتا۔ شاہ دین چاہتا بھی نہیں تھا کہ اس کی بیوی وہاں جائے جہاں سے وہ برباد اور ذلیل ہو کر آیا' اسے یہ خدشہ بھی لاحق تھا کہ کہیں شادو والے معاملے کی بھنک اس کے کانوں میں نہ پڑ جائے--- اس روز بھی اس کی بیوی نے

دبے لفظوں میں درگاہ شریف جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو اس نے جھلا کر اس کی دھنائی کر دی مگر بیوی نے بھی صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ضرور جائے گی کہ منت مانی ہوئی ہے اور اسی لئے پریشانیوں پہ پریشانیاں ہیں۔۔۔ وہ گالیاں بکتا ہوا تحصیل چلا گیا اور بیوی بچے اٹھائے درگاہ شریف چلی آئی۔ آنکھ' منہ' ماتھے پر رو بڑے پڑے ہوئے تھے۔ گاؤں کی کچھ عورتیں' بوڑھیاں بھی ساتھ تھیں۔ وہاں پہنچتے پہنچتے دائیں آنکھ سوج کر بند ہو گئی' نیلے پیلے نشان ابھر آئے۔ وہ منہ چھپائے' بچوں کو ہنکاتی ہوئی بڑے دروازے میں داخل ہوئی' شیرینی پھول پتی خرید کر آگے بڑھی اور دوسری عورتوں بوڑھیوں کے ساتھ سائیں مولا بخش کے اڈے پہ حاضر ہوئی۔ سائیں جی وہاں نہیں تھے' وہیں پہ اسے ان کی علالت کا معلوم ہوا تو اندر سلام' نذر نیاز کر کے وہ ان کے ڈیرے پہ پہنچی۔ وہاں کافی بھیڑ تھی۔ اپنی باری کا انتظار کرتے کرتے دوپہر سر پہ آ گئی۔ وہ بھی منہ ڈھانپے ہوئے سرک سرک روتی بیٹھی رہی۔ پھر ظہر کی نماز سے پہلے اس کی باری بھی آ گئی' آگے بڑھی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اپنے خاوند اور بہن کے لئے دعا' تعویذوں کی طلب گار ہوئی۔ سائیں مولا بخش نے اس کی بگڑی ہوئی حالت کے پیش نظر خصوصی توجہ دی۔ اس سے پیشتر بھی یہ عورت آئی ہو' اسے مطلق یاد نہیں تھا۔ تعویذ لکھتے ہوئے اس کے شوہر اور بہن کا نام دریافت کیا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔۔۔ اس کے سامنے شادو کی بڑی بہن بیٹھی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اردگرد تمام لوگوں کو ہٹانے کا حکم دیا۔

"بی بی! آرام اور سکون سے بات کرو۔۔۔"

"آرام اور سکون کہاں سے لاؤں سائیں جی! میرے گھر کو تو جیسے بربادیوں نے دیکھ لیا ہے۔ خدا کا واسطہ ہے' میرے لئے دعا کریں اور کوئی ایسا تعویذ دیں جس سے میرا گھر اجڑنے سے بچ جائے۔۔۔" وہ بولی۔

"بی بی! میں کیا کر سکتا ہوں' کرنے والی تو اس کی ذات ہے۔۔۔ کیا کوئی خاوند سے تکلیف ہے؟" وہ کریدتے ہوئے بولا۔

"خاوند پہلے تو بہت اچھا تھا لیکن اب وہ بھی بگڑا بگڑا رہتا ہے اور سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتا' مار مار کر میرے پاسے توڑ دیئے ہیں۔۔۔"

"وہ ایسا کیوں کرتا ہے' کوئی وجہ تو ہو گی؟"

"جی' وجہ یہ ہے کہ ایک میری بہن بڑی نصیبوں ماری اور منحوس پہلے تو بیوہ ہو گئی پھر میرے گھر کا صفایا کر کے کہیں منہ کالا کر گئی' جو کچھ جوڑا سنبھالا ہوا تھا' کچھ ساتھ لے گئی اور کچھ اس کی تلاش میں خرچ ہو گیا۔ ہم عزت دار لوگ ہیں' میرا خاوند پٹواری ہے اور آلے دوالے ہماری بڑی بے عزتی ہوئی ہے۔۔۔ سائیں جی! کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔"

"لیکن وہ بھاگی کیوں۔۔۔ کہیں اور کسی کے ساتھ کوئی تعلق تھا یا کسی نے اسے زبردستی بھگایا ہے؟"

"پتہ نہیں جی۔۔۔ میں نے تو کئی بار اس سے پوچھا کہ شادو! اگر کہیں تیری مرضی ہو تو بتا' ہم تیری بات وہاں پکی کر دیتے ہیں لیکن اس نے اپنی زبان نہیں کھولی۔ یہ ضرور کہتی تھی کہ مجھے سائیں جی کے پاس لے چلو۔۔۔ وہ آپ کے پاس آنے کے لئے تڑپتی رہی' آپ کی بڑی عزت کرتی تھی۔۔۔"

"اس کا چال چلن کیسا تھا۔۔۔ کوئی بچہ وچہ بھی تھا یا نہیں؟"

"جی' وہ بڑی کھری اور اچھی تھی' بدنیت یا خراب نہیں تھی۔ اس کا خاوند نشئی تھا' میرا خیال ہے وہ یہاں آپ کے پاس بھی آیا تھا۔۔۔ بچہ وچہ کوئی نہیں تھا' اس کا خاوند ہی بیمار تھا۔"

"تمہارا اپنے خاوند کے بارے میں کیا خیال ہے۔۔۔ کہیں تمہاری بہن کے اغواء میں اس کا ہاتھ تو نہیں۔۔۔؟"

"نہیں جی' توبہ توبہ۔۔۔ وہ تو اسے اپنی چھوٹی بہن سمجھتا تھا بلکہ اس کے لئے تو اس نے ایک دو جگہ بات بھی چلائی تھی۔ وہ اس کی شادی کے لئے بڑا فکر مند رہتا تھا۔"

"اچھا یہ بتاؤ' کہیں اس کا پتہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔۔۔ کوئی رپورٹ وغیرہ کرائی تھی؟"

"رپورٹ تو میرے خاوند نے کرا دی تھی لیکن ابھی تک کوئی سوہ نہیں لگی کہ وہ کہاں ہے۔۔۔ اڑتی اڑتی خبر سنی تھی کہ کسی موٹر سائیکل والے کے ساتھ گئی ہے۔۔۔"

"اچھا۔۔۔ میں تمہیں تعویذ لکھ دیتا ہوں' اللہ فضل کرے گا۔۔۔ ایک تعویذ تو اپنے خاوند کے سرہانے کہیں رکھ دینا' دوسرا تعویذ کسی اونچی جگہ سرسبز درخت کی سب سے اونچی شاخ پہ لٹکا دینا۔ جیسے جیسے ہوا چلے گی' تیری بہن کا دل پکڑا جائے گا اور وہ واپس آنے پہ مجبور ہو جائے گی۔۔۔ کیا نام ہے اس کا' اس کی ماں اور باپ کا نام بھی لکھواؤ۔"

"نام شادو بی بی ہے' بے بے کا نام معراج بی بی اور باپ کا نام۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک سی گئی۔

"ہاں' باپ کا نام بتاؤ۔۔۔"

"کیا بتاؤں جی' آپ کے سامنے جھوٹ بول نہیں سکتی اور سچ بولتے ہوئے بڑی غیرت آتی ہے۔۔۔"

"میرا وقت ضائع نہ کرو۔۔۔ دیکھ رہی ہو' کتنے لوگ انتظار کر رہے ہیں۔۔۔ یہ ایک تعویذ لے جاؤ' دوسرے کو رہنے دو۔"

وہ ہمت کر کے بولی۔ "سائیں جی! بات دراصل یہ ہے کہ وہ میری سگی بہن نہیں تھی۔۔۔ اس کا باپ کوئی اور تھا۔" اس کا سر جھک گیا تھا۔

"اس کا باپ کوئی اور تھا---- وہ تمہاری سگی بہن نہیں تھی؟" وہ اسی کے الفاظ دہراتے ہوئے بولا اور پھر سوال کیا۔ "تم اس کے باپ کے متعلق کچھ جانتی ہو؟"

"زیادہ تو نہیں---- ایک دفعہ میرے لالہ بشتی اور بے بے جشتن کی لڑائی ہو گئی تھی۔ میرے لالے بشتی نے طعنہ دیا تھا کہ تمہاری اس ناجائز بچی کو میں نے اپنی بیٹی سمجھ کر پالا اور قبول کیا ہے اور تم میرے ساتھ لڑائیاں کرتی ہو----" وہ رک گئی اور کچھ سوچنے لگی۔

"بولو' بولو---- اس کا باپ کون تھا؟"

"جی' مجھے تھوڑا تھوڑا یاد ہے---- میں بہت چھوٹی تھی۔ ہم لوگ راولپنڈی' چک لالہ رہتے تھے۔ میرا لالہ بشتی وہاں پہ مالی تھا۔ میری بے بے جشتن' بہت دنوں کے بعد کہیں سے آئی' اس کے ساتھ ایک جوان سا لڑکا تھا۔ اس لڑکے نے مجھے بہت سے روپے دیئے---- پھر کچھ مہینوں کے بعد شادو پیدا ہوئی۔ میرے خیال میں وہی لڑکا شادو کا باپ تھا۔ میں اس کا نام نہیں جانتی۔ اس کی خوبصورت سی مونچھیں اور شکل مجھے ابھی تک یاد ہے۔"

سائیں مولا بخش نے منہ ادھر کر لیا جیسے وہ اپنا منہ چھپانا چاہتا ہو---- اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا جب وہ اس عورت کو لے کر چک لالہ آیا اور اس بچی کے ہاتھ روپے رکھے تھے۔

وہ مراقبے میں اتر چکا تھا۔

●●

دو روز مسلسل بے ہوش رہنے کے بعد آج اسے ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں پڑا ہوا تھا' دو چار لوگ ابھی بھی اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور بہت سے لوگ باہر اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے---- ڈاکٹروں کے مطابق فالج کا حملہ ہوا تھا۔ احتیاط' پرہیز کے علاوہ قیمتی ٹیکے اور دوائیں تجویز ہوئیں۔ فالج کا اثر سالم بازو والے حصے کی جانب ہوا۔ ابرو' آنکھ' چہرہ' ہونٹ' بازو' ٹانگ' ہر عضو متاثر ہوا۔ ہلکی ہلکی مالش جاری تھی' ہونٹ ایک جانب جھکائی کھا گیا تھا اور متاثرہ آنکھ یادٔ سے پر اور پھیلی ہوئی تھی۔ ہاتھ' بازو اور ٹانگ اور پیر جیسے برف سے سن ہو گئے ہوں۔ محسوس تو ہوتے لیکن کسی حرکت سے عاجز تھے---- ٹکر ٹکر چھت کو تکتے ہوئے اک عجیب سی مردنی اور بے بسی کی پرچھائیاں اس کے ستے ہوئے چہرے پہ پھیلی ہوئی تھیں جیسے وہ خلاؤں سے اترتی ہوئی کسی ہیبت ناک مخلوق کو آہستہ آہستہ اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ رہا ہو۔ تاجا منجر پاس بیٹھا اس کے بازو کی مالش کر رہا تھا' ہوش آنے کے بعد اس نے سائیں مولا بخش سے ایک دو بار بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ محض ہلکا سا سر ہلا کر رہ گیا' بات کرنے میں شاید وہ تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ حافظ صاحب بیٹھے آہستہ آہستہ تلاوت کر رہے تھے' تھانے سے چوہدری حق نواز اور کچھ پولیس والے بھی پھیرا ڈال گئے تھے۔ ابھی تک کوئی بھی اصل حقیقت نہ جان سکا کہ یہ نئی افتاد کیسے آ پڑی ہے اور نہ ہی اس نے ابھی تک کہیں ذکر کیا کہ شادو اس کی بیٹی' اس کا خون ہے' جگر کا ٹکڑا ہے---- وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ قدرت اس سے ایسا انتقام لے گی۔

حافظ صاحب نے دم کیا ہوا پانی چمچے کے ذریعے پلانے کے لئے دیا۔ پھر دو دن بعد اسے دواؤں اور احتیاطی ہدایات کے ساتھ ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ اب جھونپڑا کسی چھوٹے سے ہسپتال کا منظر پیش کر رہا تھا۔ صاف ستھرا بستر' پھولوں کے گلدستے' صاف تولیے' دوائیں' انجکشن' مالش کے تیل---- باہر کبوتر اور خرگوشوں کے بھرے ہوئے ٹوکرے' پھل' ہر کوئی خدمت کے لئے تیار---- ملنگوں نے ایک اور شوشہ چھوڑ رکھا تھا کہ چلے کے دوران جنوں نے یہ حالت کر دی ہے' بڑا سخت مقابلہ ہوا اور یہ تو اللہ کا کرم ہوا کہ جان بچ گئی۔ دو جن جل کر خاک ہو گئے' باقی بھاگ گئے---- مولا بخش کی زبان ابھی تک بند تھی' متاثرہ حصے میں آہستہ آہستہ حرکت اور برکت پیدا ہو رہی تھی۔ شاہ مراد' اس کے والدین اور دو بھائی بھی ادھر ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے۔ زیتون کا تیل' میٹھا تیل' گھی اور شہد لائے تھے۔ مالشیں زور شور سے جاری تھیں جیسے رگڑ رگڑ کر اندر سے نیا سائیں مولا بخش نکال رہے ہوں اور اب واقعی آہستہ آہستہ اندر سے ایک نیا سائیں مولا بخش نکل رہا تھا' جسم ہلکا پھلکا' چہرے پہ رعونت اور شیطنت کی جگہ عجز بھری متانت اور روحانیت کا نور جلوہ' اشاروں سے توبہ تلا اور نماز بھی ہو رہی تھی۔ نشہ پانی ہرن ہو چکا تھا' داڑھی بڑھ چکی تھی جیسے ان حادثات سے نکل کر عرفان اور سلوک کی کئی منزلیں چشم زدن میں پھلانگ گیا ہو۔

حافظ صاحب کا دم شدہ پانی بڑی مکھی کے شہد کے ساتھ برابر دیا جا رہا تھا۔ اس کی برکت کہ سائیں مولا بخش نے پہلی مرتبہ زبان ہلائی۔ اس نے کلمہ شریف پڑھا تو ملنگوں نے یا علی کے نعرے لگائے' مٹھائی تقسیم ہوئی' سات دیگیں چڑھائی گئیں۔ درگاہ والوں' پولیس اور عام لوگوں نے خوب دعوت اڑائی۔ سائیں بادشاہ کی صحت اور عمر درازی کے لئے دعائیں مانگی گئیں۔

حالات' حادثات اور جذبات کی بھٹی میں تپ کر سائیں مولا بخش جیسے کندن بن گیا تھا۔ اب وہ سکون' سلامتی' راستی کے معنوں اور حقیقت سے جیسے آشنا ہو گیا ہو' جیسے کسی نے اس کے کانوں میں پھونک دیا ہو کہ پرچھائیوں کی طرح اعمال بھی انسان کا پیچھا کرتے ہیں' ان سے بھاگ کر پیچھا چھڑا لینا ممکن نہیں اور انسان بدی کے بیج بو کر سلامتی اور نیکی کی فصلیں نہیں کاٹ سکتا۔ طاقت' حکومت' دولت یا عیاری مکاری سے کسی معصوم' مجبور اور مظلوم کو بے دست و پا کر کے اپنا انت اخیر' تمت بالخیر نہیں کیا جا سکتا---- خاموش لیٹے لیٹے وہ اپنا محاسبہ کرتا رہتا' اس دوران اس کا دوران خون ٹھاٹھیں مارنے لگتا' ہاتھ پاؤں میں بجلی کی رو دوڑنے لگتی اور اس کے اندر جیسے لاکھوں قمقمے جل اٹھتے۔ اب وہ اپنے اعضاء کو حرکت دینے لگا تھا' انگلیاں کھول اور بند کر سکتا تھا' کروٹ لے سکتا تھا' گلاس تھام سکتا تھا اور اٹک اٹک کر باتیں بھی ہو رہی تھیں۔

اس دن صبح صبح وہ نیم گرم پانی سے غسل کر کے صاف ستھرے کپڑے پہنے بڑے خوشگوار موڈ میں بیٹھا ہوا تھا' ناشتہ لینے ایک آدمی گیا ہوا تھا کہ تاجا مخبر آگیا' دونوں نے مل کر ناشتہ کیا۔

"تاج دین! کہاں سے آرہے ہو---؟"

"بادشاہ' گھر سے تھانے گیا۔ چوہدری صاحب کو سلام کیا پھر ادھر' یہاں تمہاری خیر خبر لینے آگیا ہوں---"

"چوہدری صاحب کیا کر رہے ہیں---؟"

"رات' ادھر منڈی میں چوری کی واردات ہو گئی تھی--- وہ چار آڑھتی بیٹھے ہیں' دال گندم کا بھاؤ بتا رہے ہیں۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

"چلو یار! آج چوہدری صاحب کے پاس چلتے ہیں--- ذرا گھومنے کو جی چاہتا ہے' سلام بھی کر آئیں گے۔"

"چلو' اٹھو--- بسم اللہ---!"

وہ تانگے پہ تھانے پہنچے تو دروازے پہ کھڑے سپاہی نے آگے بڑھ کر اسے تانگے سے اترنے میں مدد دی' چوہدری صاحب نے دور ہی سے دیکھ کر خوشی سے تالی بجائی۔

"آؤ جی' سائیں جی! مبارکاں--- جاؤ بھئی' مٹھیائیاں تے چائے لے کر آؤ۔"

تھوڑی دیر بات چیت کے بعد سائیں مولا بخش نے علیحدگی میں بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ دونوں دفتر میں آ گئے' سپاہی کو حکم دیا کہ کوئی ادھر نہ آئے۔

"کہو سائیں!--- کیا کہنا چاہتے ہو؟"

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "چوہدری صاحب! میں ایک عرض کرنا چاہتا ہوں--- میں نے ایک لمبا عرصہ گنہگاری میں گزارا ہے جس کی رب نے مجھے سزا دی۔ اب میں اپنے سوہنے رب سے توبہ کرتا ہوں--- میری حالت تو آپ دیکھ رہے ہیں' اب میں خود اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکتا تو کام کیا کروں گا؟ میں چاہتا ہوں کہ اللہ بھی مجھے معاف کرے اور آپ بھی مجھے اجازت دیں کہ آئندہ جتنی زندگی بھی رہ گئی ہے' اللہ اللہ اور توبہ استغفار میں گزاروں---"

چوہدری اسے گہری نظروں سے تولتے ہوئے بولا۔

"ہاں' سائیں! اب تمہارے لئے یہی بہتر ہے--- پر تم کرو گے کیا' گزر بسر کیسے ہو گی---؟"

"اللہ وارث ہے' کیڑے کو پتھر میں رزق دیتا ہے اور میں تو پھر بھی اس کا حقیر بندہ ہوں۔ میں انشاء اللہ حافظ صاحب سے قرآن پڑھوں گا اور---"

"سائیں---!" چوہدری اسے ٹوکتے ہوئے بولا۔ "اس ماحول اور خاص طور پر درگاہ شریف میں تم

اگر ایسا چاہو بھی تو نہیں کر سکتے' لوگ تمہیں نہیں چھوڑیں گے اور آج نہیں تو کل تم پھر اپنی پرانی ڈگر پہ آ جاؤ گے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں--- مجھے بھی احساس ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ میرے پاس کوئی نہیں آئے گا' آپ بے فکر رہیں---"

"تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے' اللہ تمہیں اپنے ارادے میں کامیاب کرے---"

وہ ایک بھاری سا رومال میز پہ رکھتے ہوئے بولا۔

"چوہدری جی! میں نے اچھے برے وقت کے لئے یہ رقم محفوظ رکھی ہوئی تھی' خدا جانتا ہے کہ میرے پاس اور کچھ نہیں--- یہ سب کچھ آپ جہاں دل چاہے' بانٹ دیں۔ میں اس رقم کو اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتا۔ جب میرے رب نے میرے جسم سے سب کچھ نکال دیا ہے تو میں اسے اپنے پاس کیوں رکھوں؟"

چوہدری دیدے پھاڑ پھاڑ کر رومال کو دیکھ رہا تھا جس کے اندر سے سینکڑوں' ہزاروں بڑے چھوٹے نوٹ جھانک رہے تھے--- سائیں مولا بخش اٹھا اور چوہدری حق نواز کے پاؤں پکڑ لئے۔

"ایک کرم مجھ گنہگار پہ اور کر دیں' خدا آپ کے بچوں کی حیاتی کرے---"

"بولو' بولو---" وہ اسے پاؤں سے اٹھاتے ہوئے بولا۔ "کرسی پہ بیٹھو--- کہو' اور کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"چوہدری جی! شادو کو تلاش کر دیں--- خدا دا واسطہ' اسے تلاش کر دیں---"

"ابھی تک عشق کا بھوت نہیں نکلا--- اب تو تم شادی کرنے کے قابل ہی نہیں رہے---"

چوہدری ہنسنے لگا۔

"نہیں' نہیں---" سائیں نے اپنا سر میز سے ٹکرایا۔ "نہیں چوہدری جی! اسے تلاش کر دیں' اس کی شادی اپنے ہاتھ سے شاہ مراد سے کر دیں--- بس میری یہ آخری خواہش ہے۔" وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

"شاہ مراد سے---؟" وہ حیرانگی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں' شاہ مراد سے--- ان دونوں کو ملا دیں' ان کا گھر بسا دیں۔ ان کی جھولی مرادوں سے بھر دیں۔"

"مگر تمہیں شاہ مراد سے اتنی دلچسپی کیوں ہے---؟"

"میرے بادشاہ! وہ بڑا یقین اور ایمان والا بندہ ہے' مجھے اسی کی بددعا لگی ہے--- اس نے میری بڑی خدمت اور عزت کی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس طرح

اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں---"

"تم جانتے ہو کہ میں نے اسے تلاش کرنے کی بڑی کوشش کی ہے لیکن ابھی تک میں کامیاب نہیں ہوا۔ تم بھی دعا کرو کہ اس کا کوئی سراغ مل جائے---اب تم جاؤ' کچھ لوگ باہر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ سب بھلا ہو گا---"

سائیں مولا بخش وہاں سے واپس آگیا۔

● ●

شاہ مراد کے والدین اس بار بھی حافظ صاحب کے لئے بہت کچھ لائے' کچھ کپڑے بھی تھے۔ انہوں نے کئی بار منع بھی کیا کہ یہ تکلف کرنے کی ضرورت نہیں لیکن یہ لوگ بھی اپنی عقیدت اور اپنائیت کا اظہار اسی طرح پسند کرتے تھے۔ اس بار حافظ صاحب نے انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے ہی ڈالی۔ شاہ جمال کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی شاہ محمد بھی آیا تھا جو ہاکی کا کھلاڑی تھا۔ گیارہویں جماعت کا طالب علم' لمبا' خوبرو' شرمیلا' ہاتھ پاؤں کا مضبوط' یہ بھی اپنے بھائیوں شاہ مراد' شاہ جمال کی طرح بڑا سعادت مند' نیک بچہ تھا۔ حافظ صاحب کے ساتھ اس کا دل لگ گیا تھا اور دعوت کی ایک وجہ اس کی سعادتمندی اور پہلی پہلی آمد بھی تھی۔ پانچ افراد پہ مشتمل یہ کنبہ حافظ صاحب کے گھر پہنچا تو ان کی سفید پوشی اور غریبی دیکھ کر اندر ہی اندر بڑا حیران ہوا۔ چھوٹا سا گھر' معمولی سازوسامان' ان کو پورے گھر میں کوئی ایسی چیز دکھائی نہ دی جس پہ آسائش کا الزام دھرا جاسکے۔ ایک کمرے میں مردوں کو بٹھایا گیا' اندر کہیں عورتیں بیٹھ گئیں--- سادہ سے ایک سالن پہ مشتمل کھانا اور چائے' یہ تھی حافظ صاحب کی دعوت اور جو لطف اس سادہ سے کھانے میں تھا وہ انہیں کہیں نہیں ملا تھا۔ سادگی' سچائی' سترپوشی کا اپنا اک بھاؤ ہوتا ہے۔ اخلاق' اخلاص اور اکرام کا اپنا اک انداز ہوتا ہے۔ محبت' مروت' اور محنت کی اپنی علیحدہ مہک ہوتی ہے۔ شرم' شرافت' اور شکرگزاری کی بھی عجیب شان ہوتی ہے--- یہ سب کچھ یہاں موجود تھا۔ تقویٰ اور توکل کی آسودگی کا اجالا ہر طرف پھیلا ہوا محسوس ہو رہا تھا' اکل حلال کا ذائقہ زبانوں پہ رس گھول رہا تھا--- کھانے سے فارغ ہو کر حافظ صاحب نے معذرت پیش کی کہ وہ ان کی خاطر خواہ خدمت مدارت نہیں کر سکے' یہی وجہ تھی کہ وہ ان کی دعوت سے گریز کرتے رہے۔ شاہ مراد کی والدہ ان کی بیٹیوں کی سادگی اور سگھڑاپے سے بہت متاثر ہوئیں۔ دینی' دنیاوی تعلیم سے آراستہ' شرم وحیاء اور تہذیب و تکلم کی دولت سے مالا مال یہ بچیاں کسی اور ہی جہان کی مخلوق محسوس ہو رہی تھیں۔ ان کی والدہ بھی بڑی حلیم اور صابر و شاکر خاتون تھیں۔ شاہ مراد کی والدہ نے بیٹیوں کی بابت دریافت کیا تو ان کی والدہ نے بڑے مطمئن انداز میں جواب دیا کہ اللہ وارث ہے' وہی ان کے لئے کوئی بہتری کی صورت پیدا کرنے والا ہے۔ ابھی تک تو کوئی مناسب رشتہ نہیں آیا--- ادھر یہ سوچ رہی تھیں کہ کاش' ان مہتابوں کے ڈولے ان

کے آنگن میں اتر آئیں۔ پھر ان کے اصرار پہ وہ تو وہیں رک گئیں' مرد سارے درگاہ شریف آگئے۔

دوسرے دن وہ سب مل بیٹھے تو بے جی نے حافظ صاحب کی بیٹیوں' ان کے حسن سلیقہ اور تربیت کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا کہ شاہ مراد کے والد صاحب خود ہی کہنے لگے کہ حافظ صاحب اور ان کا گھرانہ خیر و برکت کی دولت سے مالا مال ہے۔ اتنی غریبی اور تنگدستی کے باوجود اتنا سکون' اطمینان' کشادہ دلی--- اللہ کی شان!--- کوئی بیٹا نہیں' بیٹیاں ہی بیٹیاں--- اللہ بے نیاز ہے!

"میرا دل تو یہاں پہ ٹھک گیا ہے--- کیا خیال ہے' اپنے شاہ محمد کے لئے رشتہ مانگیں---؟"

"مرادے دی ماں! تو نے میرے دل کی بات کی ہے--- تمہارا کیا خیال ہے' پتر شاہ محمد؟"

"آپ میرے پیچھے کیوں پڑگئے ہیں؟--- میرا نمبر ابھی دور ہے' آپ پہلے لالے کا کچھ کریں۔"

"پتر! تمہارے لالے کا کیا کریں؟--- تم جانتے ہی ہو کہ تمہارا لالہ اپنی ضد پہ اڑا ہوا ہے۔ تم اگر دونوں بھائی مانو تو میں پہ شادی کرلو' بڑی نیک دیندار اور خوبصورت لڑکیاں ہیں۔ یہ ثواب بھی ہے' حافظ صاحب بڑے اللہ کے بندے ہیں--- پتر! ہمیں ایسی ہی سادہ' غریب اور اللہ اللہ کرنے والی بیٹیاں چاہئیں۔"

"بے بے' میرے دل میں تو یہ بات پہلے ہی تھی--- اگر یہ کام ہو جائے تو بڑی اچھی بات ہے' کیوں شاہ مراد! تمہارا کیا خیال ہے؟" شاہ جمال نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

"آپ شاہ محمد کے لئے یہاں رشتہ ضرور کرلیں' میں بہت خوش ہوں لیکن میرے متعلق نہ سوچیں--- کیا پتہ' میں نے شادی کرنی بھی ہے یا نہیں؟"

"ہاں' ہاں--- تم نے جتی ستی رہنا ہے' داڑھی رکھ لی ہے' وظیفے کرتا ہے--- بس تو بھی ملنگ بن جا' دنیا چھوڑ دے' ہمیں چھوڑ دے--- اسی لئے تو تمہیں پال پوس کے گبھرو کیا تھا۔" بے جی ناراض ہوتے ہوئے منہ پھیر کے بیٹھ گئیں۔

"چھوڑ بھی' مرادے دی بے بے! تو تو پتر کے پیچھے پڑ گئی ہے--- دیکھ پتر!" وہ شاہ مراد کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "پھنسی ہوئی چھوڑ کر اڑتی کے پیچھے نہیں پڑتے' یہ میں نہیں ہمارے بڑوں بزرگوں کی کہی ہوئی باتیں ہیں۔ مقدروں سے کوئی لڑائی نہیں کر سکتا--- انسان کی ہزاروں خواہشیں' چاہتیں ہوتی ہیں مگر ہوتا وہی ہے جو سوہنے رب کو قبول ہوتا ہے' انسان کو اپنی جائز خواہش کے لئے کوشش ضرور کرنا چاہئے پھر بھی اگر وہ خواہش پوری نہ ہو تو اپنے مقدر کے آگے سر جھکا دینا چاہئے---"

بے جی اور دوسرے بھائیوں نے بھی اس بات کی تائید کی۔

"ٹھیک ہے' مجھے ایک مہینے کی مہلت دیں--- اس کے بعد وہی کروں گا جو آپ حکم کریں گے۔" شاہ مراد نے کہا۔ پھر والدین اور بھائیوں کو رخصت کرنے کے بعد وہ چوہدری صاحب سے ملنے

تھانے آیا۔ چوہدری صاحب سے حافظ جی کے مخلصانہ تعلقات کا اسے بخوبی علم تھا اس لئے ان سے کھل کر بات کرنے میں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اس نے پوری بات الف سے یے تک کہہ سنائی۔ وہ بڑے خوش ہوئے' کہنے لگے۔

"مراد! اس سے اچھی نیکی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔۔۔ میری مانو تو اپنے ماں باپ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے یہ نیکی کر ڈالو۔ حافظ بیچارے بڑے خوددار اور متوکل انسان ہیں' کوئی بیٹا نہیں۔ اس طرح جہاں ان کی ذمہ داریاں کم ہوں گی وہیں دو بیٹے بھی مل جائیں گے۔۔۔ تم جانتے ہو کہ وہ بیچارے جہیز وغیرہ تو دے نہیں سکتے اور اس دور میں جہیز کے بغیر کسی لڑکی کو بیاہنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

"چوہدری صاحب' آپ ٹھیک کہتے ہیں۔۔۔ شاہ محمد کے لئے میں شروع سے راضی ہوں لیکن میں۔۔۔"

"۔۔۔ میں' میں کو چھوڑو' شادو کو بھول جاؤ۔ اب وہ شاید اس دنیا میں ہی نہ ہو اور اگر وہ کہیں زندہ بھی ہے تو مردوں سے بدتر ہوگی۔۔۔ میرے خیال میں اسے علاقہ غیر میں پہنچایا جا چکا ہے اور یہ کام اسی کا ہے جس نے سائیں مولا بخش پہ گولی چلائی تھی۔ اگر اس ضلع میں ہوتی تو مجھے ضرور اطلاع مل جاتی۔۔۔ ویسے تم نے ایک ماہ کی مہلت مانگ کر اچھا کیا ہے' خدا کرے کہ اس کا کہیں سراغ مل جائے ورنہ مردوں کی طرح ایک ماہ بعد اپنا وعدہ پورا کرو۔۔۔"

"ہاں جی' وعدہ کیا ہے تو پورا ہوگا لیکن چوہدری صاحب! آپ کوشش کر کے اسے تلاش کر سکتے ہیں جتنا پیسہ بھی لگے میں خرچنے کے لئے تیار ہوں۔۔۔ بس آپ اسے تلاش کر دیں۔"

"مراد! مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے' تمہارے کہے بغیر میں پوری پوری کوشش کر رہا ہوں۔۔۔ اللہ پہ بھروسہ رکھو۔"

چوہدری حق نواز نے تسلی دی۔

● ●

سائیں مولا بخش نے اڈے پہ جانا تو بہت پہلے سے چھوڑ رکھا تھا' اب وہ ڈیرے پہ بھی بہت کم دکھائی دیتا۔ مسجد کے ایک کونے میں پڑا رہتا اور ضرورت کے وقت واجبی سی بات کرنے کے علاوہ اکثر خاموش رہتا' ملنا جلنا بھی قریب قریب ختم تھا پھر بھی بہت سے سرپھرے مسجد میں بھی اس کے اردگرد بیٹھے رہتے۔ چونکہ جھولا اس نے چھوڑ دیا' قمیض شلوار اور ایک چادر اس کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ حافظ صاحب سے قرآن شریف پڑھتا اور سمجھتا' اکثر انہی کی خدمت میں رہتا۔۔۔ لوگوں میں اڑ گئی کہ وہ کسی بڑے وظیفے یا چلے کی تیاری کر رہا ہے' بڑے سخت جنوں سے مقابلہ ہوگا۔ جہاں داڑھی بڑھ گئی تھی وہاں جسم نحیف و نزار ہو گیا' مہینے ڈیڑھ مہینے میں کایا ہی پلٹ گئی۔۔۔ آسمان بھی کیسے کیسے نظارے دکھاتا ہے۔

شاہ مراد بھی برابر تھانے اور مسجد آتا رہا' شادو کے متعلق دریافت کرتا رہا۔۔۔ جیسے جیسے مہینے کے دن گزرتے گئے' اس کی وحشت اور بے چینی میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ اس دوران اس کے گھر والے بھی ایک آدھ بار آئے اور دبے الفاظ میں اپنی خواہش کا اظہار کر گئے۔

● ●

نیا چاند اپنے بانکپن کے ابتدائی مراحل میں تھا جب حافظ صاحب کے گھر کے باہر ایک تانگے سے کچھ لوگ اترے' ان کے ساتھ کچھ سامان بھی تھا۔ بے جی' ان کی بیٹی' والد صاحب' سائیں مولا بخش' شاہ مراد کا بھائی شاہ جمال آئے تھے۔ دروازے پہ چوہدری صاحب اور حافظ صاحب نے انہیں خوش آمدید کہا۔ رسمی گفتگو اور چائے پانی سے فارغ ہو کر سائیں مولا بخش نے شاہ مراد اور شاہ محمد کے لئے ان کی بیٹیوں کا ہاتھ مانگا۔ قدرے سکوت کے بعد حافظ صاحب بولے۔

"مجھے اللہ نے اپنی رحمت سے بیٹیاں عطا کی ہیں۔ یہ میرے پاس امانت ہیں' میں نے اپنی بساط کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت کی ہے۔ دینے دلانے کے لئے میرے پاس دعاؤں اور آنسوؤں کے علاوہ کچھ نہیں۔۔۔ میری صرف ایک بیٹی شادی کی عمر میں ہے' اس سے چھوٹی نہ تو ابھی بالغ ہے اور نہ ہی اپنی تعلیم ہی مکمل کر سکی ہے۔ اسی گھر میں میری ایک بھتیجی بھی تعلیم و تربیت کے لئے رہتی ہے' شاہ مراد کی والدہ صاحبہ نے اسے میری ہی بیٹی سمجھا ہے حالانکہ یہ میرے مہربان بھائی چوہدری حق نواز تھانیدار صاحب کی بیٹی ہے' میری طرح اللہ نے انہیں بھی بیٹیوں کی نعمت سے نوازا ہے۔ یہ وضاحت اس لئے ضروری سمجھی گئی کہ بعد میں کبھی غلط فہمی کا جواز باقی نہ رہے۔۔۔ میرے خیال میں آپ لوگ دو بچوں کے رشتے کے لئے آئے ہیں؟"

سائیں مولا بخش کے لئے یہ ایک نیا انکشاف تھا' وہ کچھ تردد سے بولا۔ "آپ نے درست کہا ہے۔ ہم شاہ مراد اور عزیزی شاہ محمد کے لئے حاضر ہوئے ہیں' اچھا ہوا کہ آپ نے یہ وضاحت کر دی۔۔۔ ہم دو بچوں کی خیر لینے آپ کے در پہ حاضر ہوئے ہیں' چوہدری صاحب یا آپ کی بچی میں کوئی فرق نہیں ہے۔۔۔"

چوہدری صاحب بولے۔ "یہ بھی حافظ صاحب کی بیٹی ہے کہ بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ پھر بھی آپ چاہیں تو صرف ایک ہی رشتہ کر لیں۔ شاہ مراد شاید ابھی سچے دل سے شادی کے لئے رضامند نہیں' اس کا مسئلہ پھر کبھی حل کر لیں۔۔۔"

شاہ مراد کے والد صاحب جھٹ سے بولے۔ "چوہدری صاحب! شاہ مراد جذباتی اور ضدی ہے۔ اسے اس کی مرضی کے مطابق مہینہ بھر کی مہلت دی گئی تھی اور اب اس نے خود ہی کہہ دیا ہے کہ مجھے آپ کا ہر فیصلہ منظور ہے لہٰذا آپ دونوں بچوں کے لئے ہماری جھولی میں خیر ڈالیں۔۔۔"

شاہ جمال نے بات آگے بڑھائی۔ "ہماری خوش نصیبی ہے کہ آپ جیسے اچھے لوگوں نے ہم جیسے دیہاتیوں' سیدھے سادے لوگوں کو عزت بخشی ہے۔ ہمیں دونوں بچیوں کے لئے کسی قسم کے جہیز کی ضرورت یا خواہش نہیں' اللہ کا بڑا کرم ہے۔"

حافظ صاحب بولے۔ "ہم دونوں اندر جا کر مشورہ لے لیتے ہیں اور بہن صاحبہ اور بچی کو یہاں بھیج دیتے ہیں' آپ بھی کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے پیشتر آپس میں مشورہ کرلیں۔۔۔"

چوہدری صاحب نے مشورہ دیا۔ "بہتر ہوگا کہ شاہ مراد اور شاہ محمد کو بھی بلالیں تاکہ ان کی خواہش بھی معلوم ہوجائے۔۔۔ پھر ہمارے ساتھ کھانے میں بھی شامل ہوجائیں۔"

دو گھنٹے بعد منہ میٹھا ہوا' دعا کے بعد سب آپس میں گلے ملے۔ دونوں جانب سے انگوٹھیوں اور کپڑوں کے جوڑوں اور مٹھائیوں کے تبادلے ہوئے' مبارک سلامت ہوئی اور اگلے ہفتے جمعہ کے روز رخصتی قرار پائی۔ پھر یہ لوگ اسی روز اپنے گاؤں روانہ ہوگئے اور شاہ مراد چھٹی حاصل کرنے کے لئے اپنی یونٹ چلا گیا۔ شام سے پہلے پہلے وہ پھر درگاہ شریف پہنچ گیا' اسے ایک ماہ کی چھٹی مل گئی تھی۔ اسے کل علی الصبح گاؤں روانہ ہونا تھا۔ مزید صلاح مشورے اور انتظامات کے لئے اسے حافظ صاحب' سائیں جی اور چوہدری صاحب سے رہنمائی کی ضرورت تھی۔ درگاہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ حافظ صاحب اور سائیں جی تھانے گئے ہیں' تھانے پہنچا تو وہ سب پچھلے صحن میں چارپائیوں پہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے' وہ بھی سلام کرکے پاس بیٹھ گیا۔

"ہاں بھئی' چھٹی مل گئی؟" چوہدری صاحب نے پوچھا۔

"جی' بڑی آسانی سے مل گئی۔۔۔"

"اب کیا پروگرام ہے۔۔۔؟"

"اجازت دیں تو صبح گاؤں روانہ ہوجاؤں۔۔۔ والد صاحب نے کہا تھا' آپ سے یہ دریافت کرلیا جائے کہ ہم اپنے ساتھ کتنے آدمی لائیں؟"

چوہدری صاحب بولے۔ "بیٹا! آپ لوگ پوری بارات لے آئیں۔ اپنے تمام دوست' سنگی گرائیں' سب لائیں۔ یہ خوشی کے موقعے زندگی میں بار بار نہیں آتے۔۔۔ جمعرات کو آپ بارات لے کر آئیں گے۔ درگاہ شریف سلام بھی ہوجائے گا اور رونق بھی' جمعہ شریف کو نکاح ہوگا اور دوپہر سے پہلے پہلے رخصتی ہوجائے گی تاکہ آپ لوگ شام سے پہلے پہلے گاؤں پہنچ سکیں۔۔۔ اپنے پروگرام میں تبدیلی کرو' کل واپس اپنی یونٹ میں جاؤ۔ اپنے دوستوں کے ساتھ مشورہ کرکے ان کو اپنی خوشی میں شرکت کی دعوت دو۔"

"لیکن میں تو صرف چند گھر کے افراد لانا چاہتا تھا۔ حافظ صاحب کے حالات اور خیالات کے پیش نظر سادگی اور سنت کے مطابق۔۔۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ ہر کام سنت کے مطابق اور سادگی سے ہوگا۔ تم فی الحال وہی کرو جو میں کہتا ہوں۔۔۔"

"جی' بہت بہتر۔۔۔ جو آپ فرمائیں گے وہی ہوگا۔" شاہ مراد نے انتہائی سعادت مندی سے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

پھر کافی دیر تک انتظامی امور پہ بات چیت ہوتی رہی۔ اس کے بعد پھر شاہ مراد' حافظ جی اور سائیں مولا بخش اکٹھے درگاہ شریف آگئے۔ حافظ صاحب تو وہاں سے گھر چلے گئے' یہ دونوں بیٹھ گئے۔

"شاہ مراد! تم بڑے خوش نصیب ہو کہ تمہیں اور تمہارے بھائی کو ایسے اچھے رشتے ملے' انشاء اللہ یہ بیٹیاں تمہارے گھر کو خیر و برکت سے روشن کردیں گی۔۔۔ میں حیران اور خوش بھی ہوں کہ چوہدری جیسے اچھے اور بڑے انسان نے تمہیں اپنی بیٹی کا رشتہ دیا ہے۔۔۔ بیٹا! تم بھی ان لوگوں کی قدر کرنا۔"

"انشاء اللہ۔۔۔ سائیں جی' میں تو آپ سب کا تابعدار ہوں۔ آپ کو ہم سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔۔۔"

"۔۔۔ اور ہاں بیٹا! اپنے مقدر پہ شاکر رہنا۔ اب کبھی بھی شادو کا خیال دل میں نہ لانا۔ یہ میری نصیحت ہے۔۔۔"

"سائیں جی! میں اپنے مقدر پہ شاکر ہوں۔ مجھے اپنے رب پہ مکمل یقین اور بھروسہ ہے' وہ یقیناً میرے لئے بہتر کرنے والا ہے۔۔۔"

تمہارا کوئی اور مسئلہ' مشکل یا روپے پیسے کی پریشانی۔۔۔؟"

"جی نہیں' آپ کی دعا چاہئے۔۔۔ اللہ کا بڑا کرم ہے' کسی چیز کی ضرورت نہیں۔" شاہ مراد نے جواب دیا۔

● ●

جمعرات کو تو ویسے ہی گہما گہمی اور رونقیں ہوتی ہیں مگر آج ان رونقوں میں شادی کی رونق بھی شامل تھی۔ درگاہ شریف کے صحن میں ایک طرف خصوصی اہتمام اور انتظام کرکے صاف ستھری دریاں بچھادی گئی تھیں' رضاکار اور سادہ لباس میں پولیس والے بھاگ دوڑ میں مصروف تھے' عام لوگوں کے لئے یہ حصہ بند کردیا گیا تھا۔ پانی کے حمام' تھالیاں' پتیلیں' تولیئے ہر ضروری چیز موجود تھی۔ تاجا مخبر' محرر اور چھوٹا تھانیدار اپنے کارندوں کو ہدایات دے رہے تھے۔ سائیں مولا بخش' حافظ صاحب اور چوہدری حق نواز باہر بڑے دروازے کے پاس کرسیوں پہ بیٹھے مہمانوں کا انتظار کر رہے تھے۔ یہاں بھی رضاکار اور پولیس والے کھڑے تھے۔ چھڑکاؤ اور صفائی کرادی گئی تھی۔ بھیک منگوں اور ریڑھیوں والوں کو ہٹا کر جگہ کشادہ

کر دی گئی۔ پھولوں کے ہار تیار تھے۔ پھر مہمانوں کی بس آگئی۔ دونوں دولہے ایک کار میں تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے ملٹری کا ایک ٹرک تھا۔ رضا کاروں اور پولیس والوں نے بس' کار اور ٹرک کو مخصوص جگہ ٹھہرایا اور ان کی نگرانی کے لئے اپنے آدمی کھڑے کر دیئے۔ بڑی سادگی سے ان سب کا استقبال کیا' ہار پہنائے۔ تقریباً پچاس ساٹھ مہمان تھے--- چند عورتیں' کچھ بچے' ان سب کو بڑی عزت سے اندر درگاہ شریف لایا گیا۔ درگاہ شریف کے اندر دروازے پہ بڑے متولی کرم شاہ صاحب نے انہیں خوش آمدید کہا اور اپنے ساتھ اندر مزار شریف پہ لے گئے۔ دعا مانگی' دولہوں کی دستار بندی کی۔ ہر مہمان کو ایک ایک چادر اور تبرک کے پھول عطا کئے۔ پھر سلام فاتحہ کے بعد مہمانوں کو صحن میں پہنچایا گیا' سادا ٹھنڈا میٹھا پانی پلایا گیا۔ دولہوں نے سادہ کپڑے اور ایک ایک پھولوں کے ہار کے علاوہ گلے میں تبرک کی سبز چادریں ڈالی ہوئی تھیں۔ کوئی شخص ان سب کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ لوگ برات لے کر آئے ہیں۔ شاہ مراد کے والد صاحب نے محتاجوں میں صدقہ خیرات کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ان سب کے سامنے لنگر کے چاول' دال روٹی رکھی گئی۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو نماز کا وقت آگیا۔ نماز کے بعد اسی اپنی مخصوص جگہ پہ سب اکٹھے ہو گئے' یہیں ان کی شب بسری کا انتظام تھا۔ دونوں دولہے اپنے فوجی ساتھیوں اور دیگر رشتہ داروں کے ساتھ قوالی سننے بیٹھ گئے۔ شام کی نماز کے بعد حافظ صاحب نے ایک خصوصی وعظ کی محفل کا اہتمام کیا تھا۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہوتے ہی ان میں سے اکثر وہیں صحن میں سو گئے' کچھ لوگ نوافل اور پڑھنے پڑھانے میں لگ گئے۔ شاہ مراد اندر مزار کی پائنتی پکڑے نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ اس کی مٹھی میں ڈوریاں دبی ہوئی تھیں' کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ان ڈوریوں کو وہ کیا کرے؟ اسی جگہ ایک دفعہ یہ ڈوریاں اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر پڑی تھیں اور شاہ وہ نے یہ ڈوریاں اسے دیتے ہوئے کہا تھا کہ تم سے تو ڈوریاں نہیں سنبھالی جاتیں' اور کیا سنبھالو گے؟--- ابھی تک تو اس نے یہ ڈوریاں جان سے زیادہ عزیز رکھی تھیں--- اب وہ ان کا کیا کرے؟--- جیسے بند مٹھی میں یہ ڈوریاں حرکت کر رہی تھیں' باہر نکلنے کی جستجو کر رہی تھیں۔ اس نے بند مٹھی آگے بڑھا کر مزار شریف کی پائنتی پہ پڑے گلاب کے پھولوں میں ڈوریوں کو آزاد کر دیا۔

"اے اللہ کے برگزیدہ بندے!--- لے' میرا سب کچھ تیرے حوالے ہے۔ اب میں نے من کا مندر توڑ کر اسے من مسجد بنالیا ہے---"

ایک لمبے عرصے کے بعد یہ پہلی دعا تھی' جس کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھوں میں آج ڈوریاں نہیں تھیں--- جیسے دعا کے کبوتروں کے پر کھل گئے ہوں' وہ پھر سے اڑ کر آسمان کا تارا بن گئے ہوں--- وہ الٹے پاؤں باہر نکلا۔ حافظ صاحب اپنی جگہ پہ سر جھکائے' ہاتھ باندھے' تلاوت میں مصروف تھے--- اللہ کا متوکل بندہ! گھر بیٹیاں وداع ہونے کو بیٹھی ہیں اور یہ بے فکر' مطمئن' جذب و جمال میں ڈوبا ہوا اپنے

رب کی حمد و ثناء میں مگن تھا--- نہ تنبو' نہ قناتیں' ڈھول نہ تاشے' تیل نہ مہندی' زردہ نہ قورمہ--- یہ کیسی شادی ہے' شادیاں ایسے ہوتی ہیں درگاہوں' لنگر کے چاولوں' دال روٹی سے--- نہ کوئی لاگی' نہ میراثی' بھانڈ' ہیجڑے' نہ کوئی سالی دیکھی' نہ ہنسی نہ ٹھٹھول' کوئی مذاق' نہ کوئی بول؟

دونوں دولہے اپنے والد اور چند بزرگ عزیزوں کے ساتھ موجود تھے۔ بڑے متولی قبلہ شاہ صاحب کا انتظار تھا۔ امام صاحب نکاح کے رجسٹر پہ ضروری کوائف کا اندراج کر رہے تھے' چھوارے اور شیرینی موجود تھی۔ حافظ صاحب' سائیں مولا بخش' چوہدری حق نواز اور چھوٹا تھانیدار آپس میں ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ بڑے شاہ صاحب دو اور سائیں کے ساتھ تشریف لے آئے۔ سب نے کھڑے ہو کر انہیں تعظیم دی۔ حجرے کے دوسرے حصے میں دونوں دلہنیں چند بزرگ عورتوں اور بہنوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ امام صاحب نے قبلہ شاہ اور وارثوں سے اجازت لے کر بسم اللہ شروع کر دی۔ پھر نکاح کے بعد چھوارے شیرینی بانٹی گئی۔ مبارک سلامت اور دعائے خیر ہوئی اور اب یہ سب بڑے شاہ صاحب کی معیت میں سلام اور حاضری کے لئے مزار شریف پہ کھڑے تھے۔ بڑے شاہ صاحب نے دعا مانگی' دونوں بھائی اپنی اپنی دلہن کے ساتھ کھڑے تھے۔ حافظ صاحب' چوہدری صاحب اور سائیں مولا بخش سسکیاں بھر رہے تھے۔ رقت طاری تھی--- عجیب سا منظر تھا' دعا میں شامل ہر شخص مجسمہ عجز و التجا بنا ہوا تھا--- لیکن ثم آمین کے بعد شاہ صاحب نے دونوں دولہوں کی دستار بندی کی' کچھ نقدی دی' دونوں دلہنوں کو ایک ایک چادر دی جن کے پلوؤں میں مزار شریف کی پائنتی کے معطر پھول پتی اور شیریں الائچی دانے بندھے تھے۔ دعاؤں برکتوں کے سائے میں ان کو رخصت کیا گیا۔ حافظ صاحب نے دونوں دلہنوں کو چند معمولی کپڑے' ایک ایک بستر اور ایک ایک قرآن شریف کا نسخہ جہیز میں دیا اور وہی لنگر کا کھانا کھا کر بارات جمعہ کی نماز کے بعد رخصت ہو گئی۔

اگلے روز لڑکے والوں کی جانب سے دعوت ولیمہ تھی جس میں شرکت کی ان سب کو دعوت دی گئی تھی' رہنمائی کے لئے دو آدمی یہیں رہ گئے تھے--- بہت سے فوجی دوستوں نے بھی جانا تھا اس لئے طے پایا گیا کہ کل صبح فجر کی نماز کے بعد یہیں درگاہ سے روانگی ہو گی۔

شام تک وہ لوگ اپنے گاؤں پہنچ چکے تھے۔ گاؤں سے باہر لوگ کھڑے انتظار کر رہے تھے' ان کو آتے دیکھ کر ڈھول باجے' پٹاخے شروع ہو گئے۔ گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں کے دکھ سکھ سانجھے ہوتے ہیں۔ کسی کی بھی بیٹی' پورے گاؤں کی بیٹی ہوتی ہے اور کسی کے گھر شادی ہو تو سب ہی مل جل کر خوشیوں میں شامل ہوتے ہیں۔ سب کام ہو جاتے ہیں' گھر والوں کو پتہ بھی نہیں چلتا اور آج بھی یہی عالم تھا۔ باہر مرد بیٹھے رونقیں لگا رہے تھے اور اندر عورتیں جیٹھی دلہنوں کے صدقے واری ہو رہی تھیں۔ ہر ایک کی زبان پہ یہی فقرہ تھا کہ سبحان اللہ' کیا چاند سی دلہنیں آئی ہیں--- دلہنوں کے ساتھ ان کی دونوں

پھوپی بہنیں بھی آئی تھیں۔ ان کے دینی رجحانات اور حسن اخلاق کی تعریفیں ہو رہی تھیں۔ دلہنوں نے آتے ہی پہلے مغرب کی نماز ادا کی تھی' ان کی اس ادا نے گاؤں بھر میں انہیں محترم کر دیا۔ پھر عشاء کی نماز تک خوب رونق رہی اور اس کے بعد آہستہ آہستہ لوگ چھٹنے لگے۔ چند قریبی عزیزوں کے علاوہ لوگ باگ اپنے گھروں میں چلے گئے' مرد حضرات باہر کھلے کھیت میں صبح ولیمے کے کھانے پینے اور دوسرے انتظامات میں جت گئے۔ شاہ مراد کے ماموں ممانی' شادی میں شریک نہیں ہوئے لیکن انہوں نے اپنے بیٹے اور بہو کو بھیج دیا تھا۔

عشاء کے بعد مدھم سی روشنی میں شاہ مراد کی دلہن وہی درگاہ شریف والی چادر اوڑھے' گھونگھٹ کاڑھے' شرمائی لجائی بیٹھی تھی۔ شاہ مراد نے داخل ہوتے ہی "السلام علیکم" کہا' ادھر سے بھی مدھم سی آواز میں وعلیکم السلام کا جواب موصول ہوا تو ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ پھیل گئی۔ وہ کھڑے کھڑے سوچ رہا تھا کہ جانے اس کا مزاج کیسا ہے' شکل کیسی ہے' عقل کیسی ہے اور وہ کس طرح سے بات شروع کرے؟--- آخر وہ ہمت کر کے بولا۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟--- سفر لمبا تھا' آپ تھک گئی ہوں گی--- شاید آپ نے کبھی گاؤں نہ دیکھا ہو' شہر جیسی سہولتیں تو یہاں نہیں ہوتیں لیکن کھلی آب و ہوا' خالص دودھ' مکھن' لسی اناج اور پھر سادے سادے پیار کرنے والے لوگ' کھیت' باغ---"

وہ پتہ نہیں کیا کیا کہتا رہا لیکن ادھر سے نہ ہوں' نہ ہاں سنائی دی۔ وہ چارپائی کی پٹی پہ بیٹھ گیا۔

"آپ بھی کچھ بولئے ناں---" وہ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا تو دلہن سمٹ گئی۔

"اچھا' تو یہ ہماری طرف سے منہ دکھائی کا تحفہ قبول کریں---" اس نے ہاتھ پکڑ کر ایک ننھی سی خوبصورت انگوٹھی پہناتے ہوئے کہا۔ "ذرا دیکھیں' کیسی ہے یہ انگوٹھی--- ہمارے پیار کا پہلا تحفہ!"

دلہن کا سر کچھ اور جھک گیا تو وہ اور قریب ہو کر بولا۔

"ہم اتنے برے ہیں کہ آپ کا چاند سا مکھڑا ابھی نہیں دیکھ سکتے---؟"

وہ اپنے آپ میں اور سمٹ گئی۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا بات کرے--- آخر پھر بولا۔

"دیکھئے' ہم نے آپ کو تحفہ دیا ہے۔ اب آپ کے لئے بھی ضروری ہے کہ ہمیں تحفہ دیں--- آپ تحفے میں ہمیں اپنی زیارت کرا دیں' بس!"

آخر ادھر بھی حرکت ہوئی۔ دلہن نے اپنی چادر کے پلو کو کھولا اور وہی پھول' جو مزار شریف کی پائنتی سے اٹھا کر بڑے شاہ صاحب نے دیئے تھے' مٹھی بھر کر اس کے ہاتھ پہ رکھ دیئے۔ گلاب کی مہکتی ہوئی پتیوں کے درمیان آپس میں بندھی ہوئی دو ڈوریاں' سرخ اور فیروزی منکوں کے ساتھ جگمگا رہی تھیں۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ڈوریوں کو دیکھ رہا تھا اور یہ گھونگھٹ کی اوٹ' شرارت بھری نظروں اور میٹھی سی

مسکراہٹ سے اسے تک رہی تھی۔ شاہ مراد ان ڈوریوں کو پہچانتا تھا۔ ان کو آپس میں اس نے خود خوب کس کر باندھا تھا اور یہ تو وہ مزار شریف کی پائنتی کے اوپر' پھولوں کے بیچ رکھ آیا تھا۔

"یہ--- یہ ڈوریاں آپ کو کہاں سے ملیں؟"

ادھر اب بھی خاموشی تھی۔

"دیکھئے' مجھے پریشان نہ کریں--- یہ آپ کو کہاں سے ملیں یا کس نے دیں؟"

دلہن نے پہلی بار لب کھولے۔ "یہ ڈوریاں مجھے پھولوں کے ساتھ ملی تھیں اور آپ جانتے ہیں کہ یہ مزار شریف کی پائنتی کے پھول' ہم دونوں بہنوں کو شاہ صاحب نے وہاں حاضری کے وقت تبرک دیئے تھے---"

شاہ مراد کو یاد آیا' اسی جگہ اس نے یہ ڈوریاں رکھی تھیں۔

"آپ ان ڈوریوں کو دیکھ کر اتنے پریشان کیوں ہو گئے ہیں---؟" اس نے اپنے شرارت بھرے لہجے پہ قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں' کوئی پریشانی نہیں--- یہ ڈوریاں' میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتیں؟" اس نے جیسے زیر لب آہستہ سے خود سے سوال کیا۔

دلہن نے گھونگھٹ سرکاتے ہوئے' ہاتھ بڑھایا۔

"لائیے مجھے دے دیں۔ آپ کا پیچھا چھوٹ جائے گا۔"

شاہ مراد نے جو شادو کو دیکھا تو ششدر رہ گیا' بڑھے ہوئے ہاتھ کو اس نے تھام لیا اور وہ آپس میں کس کر بندھی ہوئی ڈوریاں سہاگ کی پھولوں بھری سیج پہ گر پڑیں۔

شاہ مراد کی تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ یہ سب کچھ ایک خواب کی طرح تھا--- شادو' چوہدری صاحب کی بیٹی! اسے تو اس کا نام مسرت بتایا گیا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پوچھا بھی تو جواب یہی ملا کہ میرا نام مسرت ہے' میں چوہدری صاحب کی بیٹی ہوں۔ گھر والوں نے تو شادو کو ایک دو بار جھونپڑے میں بیماری کی حالت میں لیٹے لیٹے ایک نظر دیکھا تھا' انہیں کچھ یاد نہ تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے۔

دوسرے روز ولیمے کی دعوت تھی۔ بہت سے فوجی دوست اور درگاہ شریف سے پچیس تیس آدمی آئے تھے۔ حافظ صاحب اور چوہدری صاحب کے تمام گھر والے بھی تھے' خوب رونق رہی۔ گاؤں والوں نے خاطر مدارت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کھانے سے فارغ ہو کر خوشی خوشی واپسی کی تیاری کرنے لگے۔ دونوں دولہے اپنی دلہنوں کے ساتھ پہلی بار اپنے سسرال آ رہے تھے جہاں انہیں تین چار روز رہنا تھا۔ شاہ مراد کے والدین نے بہت سا کھانا بھی ساتھ کر دیا۔ جوڑے' کپڑے' سوغاتیں' مٹھائی اس کے علاوہ تھی۔ آخر گاؤں والوں نے دعاؤں سے ان سب کو رخصت کیا۔ شام تک وہ واپس پہنچ گئے' دوست ہنسی خوشی

خوش واپس چھاؤنی چلے گئے۔ شاہ مراد اور شاہ محمد کا قیام اپنے سسرال حافظ جی کے گھر تھا۔ شاہ مراد اس اسرار سے جلد سے جلد واقف ہونا چاہتا تھا کہ شادو 'مسرت کیسے بن گئی؟--- ویسے یہ پہلے والی دیہاتی شادو بھی نہیں تھی۔ اس کی صورت شکل 'بات چیت کا ڈھنگ طریقہ 'اٹھنا بیٹھنا کچھ بھی تو شادو سے نہیں ملتا تھا اور اگر یہ مسرت ہے تو اس کی شکل 'مسکراہٹ 'خوشبو 'آنکھوں میں بھول پن شادو جیسا کیوں ہے؟--- وہ بڑی خوشگوار سی بے چینی کا شکار تھا کہ کس سے پوچھے 'کون اسے اس الجھن سے باہر کرے؟

کھانا وغیرہ کھا کر وہ دونوں بھائی نماز پڑھنے کے لئے درگاہ شریف آگئے۔ حافظ صاحب 'اللہ کے بندے وہیں اپنی ڈیوٹی پہ کھڑے تھے۔ سلام کرنے کے بعد وہ تینوں مسجد میں آگئے 'نماز سے فارغ ہوئے تو کھلی فضاء میں صحن کی جانب آنکلے 'شاہ محمد کو انہوں نے سائیں مولا بخش کی طرف روانہ کردیا کہ اگر وہ اپنے ڈیرے پہ ہوں تو بلا لائے کیونکہ وہ نماز پہ مسجد میں نہیں آئے تھے اور خود اپنی پرانی جگہ ہی پر بیٹھ گئے۔

"ہاں بھئی بیٹے مراد!--- سناؤ 'کیا حال ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے 'آپ کی دعائیں ہیں حافظ صاحب!--- پوچھنا تو مجھے بہت کچھ ہے 'فی الحال اگر اجازت ہو تو صرف ایک بات پوچھوں---"

وہ ہمیشہ کی طرح مسکرائے اور اس کا ہاتھ تھام کر بولے۔ "بیٹا! سب سے پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں مجھ عاجز سے کوئی شکایت تو نہیں؟"

وہ ان کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہنے لگا۔ "حافظ جی 'یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟--- میرا دامن تو آپ نے ایمان 'یقین 'مرادوں اور خوشیوں سے بھر دیا ہے--- میں تو آپ کے پاؤں کی خاک برابر ہوں بھلا مجھے آپ سے کیا شکایت ہوگی؟"

"نہ بیٹا! یہ تمہارا دامن میں نے نہیں---" وہ روضے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "اس ہستی کے وسیلے سے 'اس قاضی الحاجات نے بھرا ہے جو سب کا خالق 'مالک اور رب ہے۔ وہی ہے مرادوں کو مرادیں 'وہی بے سہاروں کو سہارا دیتا ہے۔ وہی دلوں اور نیتوں کے بھیدوں سے واقف ہے 'وہی اول وہی آخر اور باقی سب کچھ فانی ہے--- میں جانتا ہوں تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو--- میرے بچے! میں تمہارا اور اپنا معاملہ اس ہستی کے وسیلے سے اللہ کے سپرد کرکے بے فکر ہو گیا تھا۔ میں نے اللہ کے حکم سے تمہیں کہا تھا کہ تمہیں تمہاری مراد ملے گی 'اس میں مسجد بنالو اور جس دن تم نے ایسا کرلیا اس دن تمہیں مراد مل گئی--- میں نے تو صرف چوکھٹ پہ سر رکھ کر یہی عرض کی تھی کہ وعدہ کرچکا ہوں سرکار! میرے سفید بالوں کی لاج رکھیو---"

"سرکار! آپ نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ میں نے آج تک اس در سے اپنے لئے کچھ نہیں مانگا---

اب آپ نے میرے لئے مانگا؟" شاہ مراد رونے لگا۔

"ہاں 'اپنے لئے مانگا تو کیا مانگا--- یہ منگتوں کا کام ہے اور میں اس در کا منگتا نہیں 'غلام ہوں اور غلامی میں مانگنا نہیں ہوتا۔ جو ملے 'اسی پہ شاکر رہنا پڑتا ہے۔ بس تسلیم و رضا ہے--- تم نے دیکھا کہ تمہارا سارا کام یہیں ہوا 'تمہارا میزبان میں نہیں تھا 'یہ ہستی تھی---"

شاہ محمد آگیا 'ساتھ چوہدری صاحب اور سائیں مولا بخش بھی تھا۔ چوہدری صاحب کہنے لگے۔

"سائیں صاحب کی طبیعت خراب تھی 'سفر کی تھکاوٹ سے بخار ہو گیا تھا۔ اب ذرا آرام ہے۔"

حافظ صاحب فرمانے لگے کہ چلیں پھر گھر کھانے پہ انتظار ہو رہا ہے--- گھر آئے تو واقعی ان کا انتظار ہو رہا تھا 'چوہدری صاحب کے گھر سے سب ہی لوگ آئے ہوئے تھے 'خوب رونق تھی۔ باہر والے کمرے میں مرد بیٹھ گئے 'عورتیں اندر تھیں۔ حسب معمول سادہ سا کھانا کچھ میٹھے کے اضافے کے ساتھ تھا۔ سب نے خوب پیٹ بھر کے ہنسی خوشی کھایا 'اللہ کی رحمت برس رہی تھی۔ کھانے کے بعد نمکین چائے کا دور شروع ہوا 'ساتھ مٹھائی آگئی۔ اتنے میں حافظ صاحب کو اندر بلایا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئے تو ان کے ساتھ دونوں دلہنیں بھی تھیں عام سے لباس میں 'سادہ سی گڑیوں جیسی بچیاں 'چادروں میں لپٹی ہوئی 'چہرے ڈھانپے ہوئے--- حافظ صاحب کہنے لگے۔

"سائیں صاحب! بچیاں آپ کو سلام کرنے اور دعائیں لینے حاضر ہوئی ہیں۔ ان کے سر پہ ہاتھ رکھیں۔"

دونوں بہنیں سائیں صاحب کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئیں--- آج تک یہ بچیاں دیکھی نہیں تھیں 'حافظ صاحب کے ہاں بیٹیوں کو باہر نکالنے کا چلن نہیں تھا اور چوہدری صاحب کے گھر تک رسائی نہیں تھی 'دونوں دلہنیں سامنے ادب سے بیٹھ گئیں۔ سائیں مولا بخش نے ایک بچی کے سر پہ ہاتھ پھیرا 'دعائیں دیں--- دوسری بچی کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

"شادو---"

بے ساختہ منہ سے نکل گیا۔ پھر ایک نظر چوہدری صاحب کی جانب دیکھا۔

"ہاں 'سائیں جی! یہ پہلے شادو ہی تھی لیکن اب پہلے والی شادو کا وجود 'اس کا ماضی 'اس کا سب کچھ ختم ہو چکا ہے--- اب اس کا نام مسرت ہے 'یہ میری بیٹی ہے--- اب یہ بھی بتا دوں کہ اسے میں نے ہی وہاں سے غائب کروایا تھا 'میں جانتا تھا کہ اس ماحول میں یہ لڑکی محفوظ نہیں رہ سکتی--- جو بات آپ نے میرے ساتھ کی تھی 'اس کا تذکرہ میں اس وقت ضروری نہیں سمجھتا 'بس یہ جان لیں کہ میں یہ سب کچھ اس لڑکی اور آپ کی بہتری کے لئے کر گزرا 'اس وقت سے آج تک یہ لڑکی قبلہ حافظ صاحب کے گھر رہی 'وہیں اس کی تربیت ہوئی۔ بیماری اور افسردگی سے جان چھوٹی۔ اب یہ بیٹی اپنے گھر والی ہو گئی ہے 'اس کو

اس کی مراد مل گئی ہے۔ نیا نام' نئی زندگی اور نیا سفر--- اب تم بتاؤ کہ یہ سب کچھ ٹھیک ہوا یا---؟"

سائیں مولا بخش کے ہونٹ کپکپا رہے تھے' بچی کے سر پہ رکھا ہوا ہاتھ بید لرزاں کی مانند لرز رہا تھا' پھیلی ہوئی متوحش آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے پھوٹ رہے تھے--- وہ اب کیسے کسی کو بتاتا کہ یہ اس کے اپنے کلیجے کا ٹکڑا ہے' اس کا اپنا خون ہے' اس کی اپنی بیٹی ہے--- وہ بغیر نظر جھپکائے اسے دیکھ رہا تھا' یہ منظر سب ہی دیکھ رہے تھے۔ اس کی پھانسی لینے والی منکوحہ بیوی بھی' اس کی غیر منکوحہ شادو کی مرحومہ ماں بھی--- شاہ مراد کے بازو پہ بندھی ڈوریاں اور چبوترے کے کبوتر بھی' چبوترے کے سائے مرقد شریف والے بھی--- سورۂ یوسف کا ایک ایک حرف بھی یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ اس کے لرزتے ہونٹوں سے آہستہ سے "بیٹی" کا لفظ نکلا پھر--- پھر ظہر کے بعد اس صحن میں لوگ سورۂ یٰسین پڑھ رہے تھے' مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے حضرت سائیں مولا بخش کے جنازے کا پروگرام بتایا جا رہا تھا--- فالج کا بڑا شدید حملہ ہوا تھا لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ فالج کا نہیں' اندر کے معالج کا کام ہے جس کے نزدیک ایسی لاعلاج بیماریوں کا علاج صرف اور صرف مرگ مفاجات ہے۔

حق اللہ' سچ اللہ--- باقی سب رولا ہی رولا۔



پل صراط

جب گاڑی کا آخری ڈبہ بھی نظروں سے اوجھل ہوگیا اور دور ریل کی پٹڑیاں بھی تپش اور لو کے لہراتے ہوئے آتشیں جھکڑوں میں غائب ہوگئیں تو وہ ہلکے سے مسکرا دیا۔ اس زیرلب مسکراہٹ میں بھی ایک لطیف سی اداسی کا عنصر شامل تھا جو کسی دیکھنے والے کو محسوس نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔ اسٹیشن چھوڑتی ہوئی گاڑی اسے یوں لگتی جیسے کوئی نئی نویلی دلہنیا اپنے پیا کے دیس سدھار رہی ہو' پٹڑی جیسی پگڈنڈی اور بیبے جیسے کہار' وہ دور تک لہراتی ہوئی ڈولی کو دیکھتا رہتا اور پلٹتا تو خالی پلیٹ فارم کو یوں خالی خالی نظروں سے تکتا جیسے بابل اپنی لاڈو کو رخصت کرکے اپنے اجڑے اجڑے سونے آنگن کو دیکھتا ہے۔۔۔ دیکھنے کے لئے قدرت نے بڑے بڑے حسین و دلفریب نظارے پیدا کئے ہیں' ابھرتے ڈوبتے سورج کے منظر' چاند کی چودھویں رات' ستاروں بھرا آسماں' گلزاروں کی بہاریں' صحراؤں' پہاڑوں' مرغزاروں کے روح پرور سلسلے' سمندر' دریا' جھیلیں' جھرنوں' آبشاروں کی خوبصورتیاں' قوس و قزح' رقص طاؤس' ہلال عید' کونجوں کی ڈاریں' زعفران کے کھیت' برسات کی راتیں' ساون کے جھولے' دھنک کے رنگ' غزالوں کی زقندیں۔۔۔ مگر اس کے لئے ریل کی پٹڑیاں ہی سب سے خوبصورت منظر تھیں' ان کا نظارہ کرتے ہوئے تو وہ آنکھیں جھپکنا ہی بھول جاتا۔ ایک دوسرے سے علیحدہ رہ کر بھی وہ کتنا قریب ہوتی ہیں' کتنا کٹھن بوجھ سہارتی ہیں۔ آپس میں گڈمڈ بھی ہوتی ہیں تو سلوک اسلوب سے' پھر الگ ہو جاتی ہیں کہیں ملنے کے لئے اور یہ پٹڑیاں ہاتھ کی لکیروں سے کتنی مشابہت رکھتی ہیں۔۔۔ وہ کبھی کبھی موٹی موٹی انگلیوں والا' بڑا سا ہاتھ پھیلا کر غور سے لکیروں کو دیکھنے لگتا۔ دل' دماغ' دولت' شادی' بچوں اور قسمت کی لکیریں! یہ الگ بات ہے کہ وہ انہیں پہچان نہیں سکتا تھا۔ آپس میں گڈمڈ' الجھی ترچھی لکیریں۔۔۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کے مٹھی بند کرلیتا جیسے پورا ریلوے کا شنٹنگ یارڈ اپنی مٹھی میں چھپالینا چاہتا ہو اور پھر سردی ہو یا گرمی' اس کی ہتھیلیاں ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے سے نمدار رہتیں۔ آج تو گرمی نے بھی حد کردی تھی'

قمیض جا بجا پسینے سے بھیگی ہوئی تھی' جسم پسینے سے چپ چپ کر رہا تھا۔

اسے جاکما خاکروب نظر آیا' وہ پٹڑیوں کے اردگرد' کنکریٹ کے سلیپروں میں پھنسے ہوئے اخباری کاغذ' لفافے اور پلاسٹک کے شاپر بیگ اکٹھے کر رہا تھا۔ ڈیزل ملے پانی' بدبودار کیچڑ سے بچتا بچاتا وہ اپنے کام میں مگن تھا۔

"جاکے! کبھی حلال کی بھی کھالیا کرو۔۔۔" بادر چوہدری نے قریب آکر ہانکا لگایا۔ "کاغذ' ردی' پلاسٹک اٹھا کر تم پیسے بنالیتے ہو اور جس کام کی تنخواہ لیتے ہو' وہ گند تو تم صاف نہیں کرتے۔۔۔ اسٹیشن کے اوپر تو بڑا سا کلمہ پاک لکھا ہوا ہے' اندر اتنا گند اور بدبو۔۔۔!"

"چوہدری' میرے پیچھے ہی پڑے رہتے ہو۔ میرے علاوہ بھی یہاں بہت سے لوگ کام کرتے ہیں' کبھی ان کی طرف بھی دھیان دیا کرو اور پسنجروں کو بھی سمجھایا کرو جو کھاپی کر سب کچھ نیچے لائنوں میں پھینک دیتے ہیں بلکہ کراچی اور پشاور کا سارا گند یہاں لاہور پھینک جاتے ہیں۔۔۔ یہ دیکھو' ملتانی سوہن حلوے کے ڈبے' مٹھائیوں کے پیکٹ' ردی اخبار' کچرا اور چھلکے۔۔۔"

"کہتے تو تم ٹھیک ہو۔۔۔ کس کس کو سمجھائیں' پورا انتظام ہی بگڑا ہوا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کسی دن سب تیلیوں کو اکٹھا کرکے تمام اسٹیشن اور لائنوں کی صفائی کرادوں۔۔۔ گندگی اور کیچڑ سے بھری پٹڑیاں مجھے اچھی نہیں لگتیں' انہیں تو ہمیشہ صاف اور ٹھیک ٹھاک رکھنا چاہیے۔ ان پہ گاڑیاں چلتی ہیں' گاڑیوں سے ہماری روزی چلتی ہے اور روزی سے زندگی کی گاڑی چلتی ہے۔۔۔ اب خود ہی سوچو کہ جب یہ پٹڑیاں ہی گندی اور کمزور ہوں گی تو آگے کیا کچھ صاف اور مضبوط ہو سکتا ہے؟"

نمکین پسینے سے اس کی آنکھوں میں چبھن سی ہونے لگی تو وہ پلیٹ فارم پہ سدا بہنے والے بغیر ٹونٹی کے نلکے کی جانب بڑھ آیا۔ نیم گرم پانی کے دو چار چھپاکے منہ پہ مارنے کے بعد محمد رفیق کے چائے کے اسٹال پر آبیٹھا۔

"لا' یار! گرما گرم چائے پلا۔۔۔" لال کرتے سے منہ پونچھتے ہوئے اس نے کہا۔ "آج تو گرمی نے حد کردی ہے۔۔۔"

"اسی لئے جاکے پہ گرمی نکالی جارہی تھی۔۔۔؟" رفیق چولہے پہ کیتلی رکھتے ہوئے بولا۔

"۔۔۔ کیا گرمی نکالنی ہے محمد رفیق؟۔۔۔ محنت مزدوری کرنے والے کو بدحرامی زیب نہیں دیتی۔ یہ لوگ لائنوں کی صفائی کے ذمہ دار ہیں۔ اب لائنوں کی حالت تم خود ہی دیکھ لو۔۔۔ مکھیاں' بدبو' ڈیزل' تیل' کیچڑ۔۔۔ دنیا جہان کا کچرا وہاں اکٹھا ہوتا رہتا ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ انجن ڈرائیور کو لائن کیسے نظر آتی ہے؟"

رفیق نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ "تم سمجھتے ہو کہ انجن ڈرائیور آنکھیں بھی استعمال کرتے

ہیں؟۔۔۔ نادر چوہدری! آدھے ڈرائیور تو دس فٹ سے آگے دیکھ ہی نہیں سکتے اور باقی آدھے دس فٹ سے آگے دیکھنا پسند ہی نہیں کرتے۔ یہ تو خاص اللہ کی مہربانی ہے کہ اس نے انجنوں کے پہیوں کو آنکھیں عطا کی ہیں اور پہیے خود اپنے ہی اندازے سے سگنل' ہری لال بتیاں' پھاٹک' کراسنگ اور اسٹیشن پلیٹ فارم وغیرہ دیکھ اور محسوس کرلیتے ہیں۔۔۔ ڈرائیوروں پہ ہو تو گاڑی پھاٹک مانگے جاکر کھڑی کردیں۔"

دونوں قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔ پھر تیز دودھ پتی کا گلاس بڑھاتے ہوئے رفیق پوچھنے لگا۔

"دہاڑی دہاڑی بھی بنائی ہے یا محض مکھیاں ہی کرتے رہے ہو۔۔۔؟"

وہ چائے سڑکتے ہوئے بتانے لگا۔ "تیز گام لیٹ تھی۔۔۔ کراچی ایکسپریس سے دو پسنجر ملے اور ایک سواری ریل کار سے' بس!۔۔۔ پچاس ساٹھ بن گئے ہیں' اللہ کا شکر ہے۔"

"مجھے تو آج سمجھوتا ایکسپریس بھی خالی لگتی ہے۔" رفیق سگریٹ سلگاتے ہوئے پیشن گوئی کرنے لگا۔

"اللہ مالک ہے۔۔۔ دونوں حکومتیں ویزے دینے میں سختی کر رہی ہیں' اسی وجہ سے سواری کم آ رہی ہے۔۔۔"

"لیکن سواری جا تو بہت رہی ہے۔" رفیق چولہے کی آنچ کم کرتے ہوئے بولا۔

"جانے والوں سے ہمیں کیا فائدہ۔۔۔ فائدہ تو آنے والوں سے ہوتا ہے' جانے والا تو جگہ خالی کر جاتا ہے اور آنے والا۔۔۔"

"۔۔۔ آنے والا پان' سپاری' کتھا' قوام' الائچی اور زعفران لاتا ہے۔ ململ' سلک اور کشمیری شالیں لاتا ہے۔ چاندی اور۔۔۔ مالٹے' وسکی کی بوتلیں۔۔۔" محمد رفیق درمیان سے بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"بس' بس یار!۔۔۔ وہاں سے قربتیں' محبتیں' چاہتیں اور خیر سگالی کے جذبات بھی تو آتے ہیں' بچھڑے ہوئے ملتے ہیں۔۔۔"

"۔۔۔ کچھ بھی ہے' مجھے تو سمجھوتا ایکسپریس ذرا اچھی نہیں لگتی۔۔۔ بڑی منحوس گاڑی ہے' نہ شکل اور نہ رنگ' پسنجر بھی کچھ کے' پلپلے پلپلے دھڑ کونے سے' عورتیں جیسے سوکھی ہوئی لکڑیاں۔۔۔ ان سے تو یار' ہماری جیلوں کے قیدی اچھے ہیں۔۔۔"

"کہتے تو تم ٹھیک ہو۔۔۔ وہاں غربت بہت ہے اور جہاں غربت ہوتی ہے وہاں چہروں پہ رونق اور ہڈیوں پہ گوشت ذرا کم ہوتا ہے۔۔۔"

"چوہدری! یہ جو سکھ ادھر آتے ہیں' یہ تو بڑے بڑے چوڑے لمبے تڑنگے ہوتے ہیں' ہنستے مسکراتے ہیں' قہقہے لگاتے ہیں اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر ست سری اکال کہتے ہیں' دو منٹ میں پانی میں بتاشے کی طرح گھل مل جاتے ہیں۔ ان سے مل کر میں تو بڑا خوش ہوتا ہوں۔ چائے شربت فری پلاتا ہوں۔۔۔"

"۔۔۔ ویسے سکھ قوم بڑی ہی دار ہوتی ہے۔ ہنس مکھ' زندہ دل' یاروں کے یار۔۔۔ ہوتے ذرا بھولے ہیں۔"

"مگر مجھے جو ملے تھے وہ تو بڑے بے وفا نکلے۔۔۔ یاد ہے' پچھلی بار جب یاتریوں کی اسپیشل آئی تھی تو کئی سکھوں کو فری شربت پانی پلایا' ست سری اکال کہتے کہتے میرا تو ست نکل گیا تھا۔ ایک دو نے اپنا پتہ ٹھکانا بھی لکھوایا تھا۔ میں نے انہیں خط بھی لکھے' سوچا کہ چلو ہم بھی اپنی نانی کے شہر جالندھر ہو آئیں گے مگر کسی نے جواب تک نہیں دیا۔۔۔ سچ کہتا تھا چاچا امام' پنجروں کی یاری اسٹیشن تک ہوتی ہے اور گاڑی چھوٹتے ہی لڈو اور یارانے ختم ہو جاتے ہیں۔۔۔"

"نہیں یار! ایسا نہیں ہے بلکہ ریل' میل' جیل اور میل یعنی شادی کی یاری دوستی تو بہت پکی ہوتی ہے۔۔۔"

"۔۔۔ ہوتی ہوگی مگر میرا تجربہ تو یہ ہے کہ جہاں لوہے سے لوہا ٹکراتا ہو وہاں دل سے دل نہیں ٹکرا سکتا' وہاں صرف مطلب اور غرض کی دوستی ہوتی ہے۔ وہ چاہے اسٹیشن ہو' لوہار سنار کی دکان یا فیکٹری' فونڈری۔۔۔"

"ایسے نہ کہہ محمد رفیق! اسی کرماں والے شہر کے اسی کرماں والے اسٹیشن سے تو مجھے۔۔۔"

اچانک اس کی نظر محمد رفیق کے پیچھے پرچوں' کوپوں والی الماری کے ساتھ لگی کھڑی کے نیچے چھ سال پرانے کیلنڈر پہ پڑی جس پہ داتا سرکار کے روضے پاک کی تصویر تھی۔

◆ ◆

جولائی کا مہینہ اور پانچ تاریخ۔۔۔

وہ اسی پلیٹ فارم پہ ڈرتے ڈرتے اترا تھا۔ بغیر ٹکٹ اور خالی پیٹ' نظر بچا کر کہیں باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا کہ اسپیشل چیکنگ گروپ کے ہتھے چڑھ گیا۔ مجسٹریٹ نے وہیں کھڑے کھڑے ستر روپے جرمانہ کردیا' یہ تو فاقے سے تھا' جرمانہ کہاں سے بھرتا؟۔۔۔ ریلوے پولیس اس کو لے کر جانے ہی والی تھی کہ اچانک تلیں کے چوہدری سبحان چاچا کی نظر اس پہ پڑ گئی۔ پہلی نظر میں کچھ جانا پہچانا سا لگا' معلوم کرنے سے پتہ چلا کہ یہ ہم وطنی' اس کے گاؤں کے قریب ایک چک کا رہنے والا ہے۔ ستر روپے جرمانہ ادا کرکے وہ اسے اپنے ساتھ باہر ایک ہوٹل میں لے آیا' دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ پھر سبحان چاچا نے اسے تیس روپے دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! میں جو کچھ کر سکتا تھا' کردیا۔ یہ داتا کی نگری ہے' محنت مزدوری کرنے والوں کے لئے یہاں رزق کی کمی نہیں۔۔۔ محنت کرو' یہ سو روپے جب آسانی سے ادا کر سکو تو مجھے واپس کر دینا۔۔۔"

تھوڑی دیر بعد اسے تانگے پہ بٹھاتے ہوئے کہا۔

"لاہور آئے ہو تو پہلے داتا سرکار حاضری دو' سلام کرو۔ اپنے لئے' میرے لئے' کل عالم کے لئے دعا مانگو' رزق حلال تلاش کرو--- اور ہاں' کبھی کسی سلسلے میں میری ضرورت محسوس کرو تو بغیر کسی تکلف کے میرے پاس چلے آنا۔ یہ بھی یاد رکھو کہ تم پہ کوئی احسان نہیں اور نہ کبھی میرا شکریہ ادا کرنا--- میرا نام سبحان ہے' یہاں قلیوں کا چوہدری ہوں---"

اس سے اگلے روز سبحان چاچا' چار نمبر پہ بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ نادر اس کے پاس آیا' سلام کر کے بنچ پہ بیٹھ گیا' چائے پانی سے فارغ ہوئے تو سبحان چاچا نے پوچھا۔

"سناؤ بھئی' داتا سرکار گئے--- دعا مانگی تھی؟"

"جی' میں کل سے وہیں تھا--- ساری رات دعائیں مانگتا رہا ہوں۔" اس نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

"--- تمہارا یہاں لاہور میں کوئی واقف یا رشتہ دار ہے؟"

"اللہ' داتا اور آپ کے سوا میرا یہاں اور کوئی نہیں اور کوئی ہو بھی تو میں کسی پہ بوجھ نہیں بننا چاہتا---" پھر تھوڑی دیر رکنے کے بعد بولا۔ "اس وقت آپ کو کوئی تکلیف دینے نہیں آیا بلکہ---" جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ پھر خاموش ہو گیا۔

"بات پوری کرو یار!--- خاموش کیوں ہو گئے؟"

"جی' میں داتا سرکار کے حکم سے آیا ہوں--- صبح نماز کے بعد جو میری آنکھ لگی تو یہی اشارہ ملا کہ میں آپ کے پاس جاؤں لہٰذا جہاں سے آپ نے تانگے پہ بٹھا کر بھیجا تھا' وہیں تانگے سے اتر کر آپ کے پاس پہنچ گیا ہوں---" پھر پیسے واپس کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ واپس لے لیں' ان کی ضرورت نہیں ہے--- ان میں سے دو روپے کم ہیں۔"

"اٹھو' چلو میرے ساتھ---" سبحان چاچا نے پیسے لیتے ہوئے کہا۔

اسٹیشن کی دوسری جانب حضرت گھوڑے شاہ کے مزار کے عقب میں قبرستان کے پاس سبحان چاچا' اپنی بیوی اور بیمار والد کے ساتھ ایک ڈیڑھ کمرے والے چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ کشادہ صحن کے باہر کھلی جگہ میں اس کی بھینس بھی بندھی ہوئی تھی۔ آس پاس مزدور طبقے کے لوگ رہتے تھے جو کھالوں اور کچے چمڑے کے گوداموں میں محنت مزدوری کرتے تھے اور اسی لئے ماحول میں ایک ناگوار سی بو رچی رہتی جس کے یہ لوگ عادی ہو چکے تھے۔ گھر پہنچے تو سبحان چاچا کے بوڑھے والد اور سیدھی سادی سی بیوی نے اس کا استقبال کیا' اس کا حال احوال پوچھا' کھانا پینا ہوا۔ پھر باتیں شروع ہوئیں تو وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔ نادر کو یوں لگا جیسے وہ اپنوں میں آ گیا ہو' اپنے گھر میں ہو۔

وہ گھر سے کبھی نہ نکلتا--- جب تک ماں زندہ تھی تو وہ بھی ماں کے لئے زندہ تھا۔ اس کی آنکھ بند

ہوتے ہی سب کچھ بدل گیا۔ باپ اور ایک بھائی بہت پہلے زمین کے ایک جھگڑے میں قتل ہو گئے۔ پھر کچھ عرصے بعد اس کے دوسرے بھائی نے مخالف پارٹی کا ایک بندہ مار دیا اور خود مفرور ہو گیا۔ پولیس نے نادر کو دھر لیا۔ یہ تو طالب علم تھا' لڑائی جھگڑوں سے دور بھاگنے والا ایک شریف سا لڑکا! پولیس کی سختی اور ظلم برداشت نہ کر سکا' بڑی مشکلوں' کوششوں اور دے دلا کر جان چھوٹی تو دشمنوں نے اس کا جینا دوبھر کر دیا' ہر لمحہ جان کو خطرہ تھا۔ بھائیوں کے بال بچے اپنے اپنے میکوں میں پناہ لے کر پڑ گئے مگر یہ کہاں جاتا؟--- تعلیم ادھوری رہ گئی تھی پھر اچھی اچھی تعلیم والوں کو کوئی نہیں پوچھتا تو میٹرک سیکنڈ ڈویژن پاس کو کہاں کوئی اچھی نوکری ملتی؟ ایک سال ٹیکنیکل کالج میں ویلڈنگ کا کام سیکھا تھا' وہی کام آیا' وہاڑی میں ایک دوکان پہ ملازمت مل گئی۔ مالک اپنے دوسرے کاروبار میں مصروف رہتا' دوکان کاریگروں کے سپرد تھی اور آپس کی ملی بھگت سے یہ سارے کے بے ایمانی کرتے تھے۔ انہوں نے اسے بھی اپنے ساتھ شامل کرنا چاہا' اس کے انکار پہ وہ سب اس کے خلاف ہو گئے اور ایک روز آپس میں سازش کر کے چوری کا الزام لگا دیا' بات بڑھی تو جھگڑا ہو گیا۔ بڑا مستری جو اس بے ایمانی میں سب کا استاد اور سرغنہ تھا' رگڑا گیا اور اس کا سر پھاڑ کر بغیر حساب کتاب لئے وہ لاہور بھاگ آیا اور یہاں سبحان چاچا کے گھر' جیسے کھویا ہوا سب کچھ واپس مل گیا۔ سبحان چاچا جیسے خدا ترس' متوکل اور ایماندار شخص نے بھی جیسے اسے پہچان لیا تھا' اس کی مہذب گفتگو' رکھ رکھاؤ' خودداری اور مردانہ وجاہت نے اس کے دل میں ایک گداز گوشہ پیدا کر دیا تھا اور ویسے بھی اس کا ایمان ہی خدمت خلق تھا' دوسروں کی مدد اور دلجوئی سے اسے بڑی خوشی حاصل ہوتی۔ سبحان کو وہ دن بھی یاد تھا جب برسوں پہلے اسی اسٹیشن پہ بے سرو سامانی کے عالم میں وہ اترا تھا' کئی روز داتا سرکار کے لنگر پہ پڑا رہا' نماز سے فارغ ہوتا تو قرآن کھول کر بیٹھ جاتا' وہاں سے اٹھتا تو باہر ملنگوں درویشوں کی صحبت اختیار کر لیتا۔ عرس کے موقع پہ ایک سندھی درویش سے ملاقات ہوئی' کئی روز ان کی صحبت سے فیض یاب ہوتا رہا اور عرس کے اختتام پہ وہ رخصت ہونے لگے تو یہ پاؤں پکڑ کر رونے لگا کہ مجھے بھی ساتھ لے چلو' وہ مسکراتے ہوئے بولے کہ تمہیں ساتھ لے جاؤں' تو یہاں کسے چھوڑوں؟--- سرخ رنگ کی سندھی چادر' اس کے کندھوں پہ ڈالتے ہوئے فرمایا۔

"سرخ کرتا پہن اور مسافر خانے چلا جا' تیری وہاں ضرورت ہے۔ لاغروں کے بوجھ اٹھا' آتے جاتے مسافروں کو سنبھال--- پسینے سے بھیگے دو ہاتھوں سے رزق حلال کما--- جا' کلمے پاک کے سائے نیچے' داتا ہجویری کے صدقے تجھے سرداری دی---"

تحفہ درویش لے کر وہ کلمہ پاک کے عین نیچے آ کر بیٹھ گیا' قلی بن کر دوسروں کے بوجھ اٹھانے لگا۔ مقررہ اجرت سے زائد کبھی طلب نہ کیا' غیر قانونی ذرائع آمدنی سے اجتناب کرتا اور ہمیشہ ساتھیوں کے دکھ سکھ میں شریک رہتا۔ مسجد کی صفائی کرتا اور اذان دیتا' چندہ جمع کرتا' بیسی کمیٹی کا حساب رکھتا۔ خلوص'

محنت' ایمانداری اور خدا ترسی نے اسے ہر چھوٹے بڑے کی نظر میں محترم کر دیا۔۔۔ اللہ جسے عزت دیتا ہے اس کی راہوں کے پتھر بھی ہیرے بن جاتے ہیں۔ اسی برس ایک دو چھوٹے موٹے فیصلے بھی مل گئے' قلیوں میں چوہدری کا اعزاز بھی مل گیا' گھوڑے شاہ والا مکان گروی پہ لے لیا۔ ماں گاؤں میں دوسرے بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی' دو اور بھائی کویت اور دوبئی میں کما رہے تھے' انہوں نے گاؤں اپنے گھروں کو بھی پکا کر لیا تھا' آرام اور آسائش کی ہر چیز گھر میں موجود تھی۔ سبحان کا بھی ایک ہی بیٹا تھا محمد یوسف' بچپن سے ہی قرآن حفظ کرنے بیٹھ گیا۔ اس سے چھوٹی رابعہ تھی سولہ برس کی' اپنے کویت والے تایا کے گھر رہتی تھی۔ تایا کا بھی ایک ہی بیٹا سلیم' بارہویں کا طالب علم تھا۔ سلیم سے چھوٹی دو بہنیں' رخسانہ اور فہمیدہ۔۔۔ اللہ کی شان تھی۔ سبحان محنت' دیانت' خدمت اور رزق حلال پہ یقین رکھتا۔ کسی بھی جائز محنت مزدوری کو عار نہیں سمجھتا تھا لیکن دوسرے کویت اور دوبئی والے بھائی دولت' ظاہری شان و شوکت اور آزاد خیالی کو ہی کامیابی اور عزت تصور کرتے۔ سبحان کو بھی وہ صرف اسی وجہ سے پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ اسٹیشن پہ قلی ہے۔ چند روپوں کی خاطر لوگوں کا بوجھ اٹھاتا ہے' پیشے کے علاوہ اس کے مذہبی خیالات اور اصولوں' طور طریقوں کو بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ دوسرے رشتہ دار جو ابھی تک کھیتی باڑی کرتے تھے' وہ بھی ظاہری نمود و نمائش اور آسودگی و آسائش کے میدان میں ان سے کہیں پیچھے رہ گئے۔ اسی فکری' معاشی اور طبقاتی بعد کی بنا پر سبحان چاچا کبھی عید شبرات یا مرنے جینے پر ہی گاؤں جاتا۔

ایک دو دن تو اسی طرح گپ شپ گفتگو میں گزر گئے۔ سبحان چاچا کام پہ چلا جاتا اور نادر بابا جی کے پاس بیٹھا ان کی میٹھی میٹھی باتیں سنتا رہتا' حکیم کے پاس لے کر جاتا' بھینس اور گھر کے کام کاج میں مصروف رہتا' وہ ناگوار سی بدبو جو پہلے دن بڑی شدت سے محسوس ہوئی تھی' اب اس کا احساس بھی جاتا رہا اور آس پاس کے لوگوں سے بھی علیک سلیک شروع ہو گئی۔

ایک شام کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو نادر نے سبحان چاچا سے کہا۔

"چاچا! جوان آدمی ہوں' گھر بیٹھے بیٹھے سستی پڑنے لگی ہے اور مفت کی روٹیاں توڑتا رہتا ہوں۔۔۔ اجازت ہو تو کہیں کام کاج کی تلاش میں نکلوں۔۔۔؟"

"پتر! ساری زندگی کام ہی کرنا ہے' ابھی کچھ روز آرام کر' اپنا ذہن بحال کیا کرتا ہے۔۔۔ میری مانو' تو پڑھائی شروع کر دو۔ ذہین آدمی ہو' پڑھ لکھ کر کوئی عزت کی اچھی سی نوکری کر لینا۔۔۔"

"چاچا' پڑھنے لکھنے کا وقت تو گزر گیا۔۔۔ ویسے بھی پڑھے لکھے بھی آج کل سڑکوں پہ جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ ابھی تو کوئی ڈھنگ کا کام مل جائے تو بس ہے' دال روٹی تو چلے۔۔۔ میں تم پہ بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہتا' اس کے بعد دیکھیں گے کہ کیا کرنا چاہیے۔"

"۔۔۔ بوجھ تو تم مجھ پہ نہیں ہو' ہر شخص اپنا رزق اپنے کاندھوں پہ لاد کر لاتا ہے۔۔۔ میں تمہیں

کام کرنے سے نہیں روکتا' مرد کام کرتا ہوا اچھا لگتا ہے لیکن صرف چند روز اور انتظار کرو' مجھے سوچنے کا موقع دو۔۔۔"

"ٹھیک ہے' سوچ لو۔۔۔ مگر میں صبح تمہارے ساتھ ہی اسٹیشن پہ چلوں گا۔ سارا دن گھر میں جمائیاں لینے سے تو بہتر ہے کہ وہاں گاڑیاں دیکھوں' آتے جاتے مسافروں کو گنتا رہوں۔۔۔"

اگلی صبح وہ سبحان چاچا کے ساتھ ہی اسٹیشن پہ پہنچ گیا۔ سبحان چاچا تو جاتے ہی دھندے میں لگ گیا اور یہ چائے کے اسٹال پہ جا بیٹھا۔۔۔ لاہور کے اسٹیشن کی بھی اپنی ایک الگ ہی شان ہے۔ چوبیس گھنٹے گاڑیوں کی آمد و رفت' مسافروں کے غول اترتے چڑھتے رہتے ہیں' رکشے تانگے ٹیکسیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ قلی' پولیس والے' چھابڑی ریڑھی والے' جیب کترے' اچکے' آوارہ گرد' بھیک منگے' بوٹ پالشیے' چندہ مانگنے والے اور گھروں سے بھاگے ہوئے بھانت بھانت کے لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں۔۔۔ اچانک اس کی نظر سبحان چاچا پہ پڑی۔ سامان سے لدا پھندا' دروازے سے باہر آ رہا تھا۔ دو بڑے سوٹ کیس سر پہ اور ایک ہولڈال گردن سے لٹک رہا تھا' ہاتھوں میں چمڑے کے تھیلے اور واٹر کولر۔۔۔ پسینے سے بھیگا ہوا' گردن کی رگیں تنی ہوئیں مگر کس اطمینان' آسودگی اور شان سے سواریوں کے آگے آگے جا رہا تھا۔۔۔ سبحان چاچا کا یہ روپ اسے بہت پسند آیا۔ عمر کا یہ حصہ جب انسانی قویٰ کمزور اور ڈھیلے پڑ جاتے ہیں' انسان جب محنت مشقت سے کتراتا ہے' رزق حلال کھانے کا یہ چسکورا اس عمر میں بھی کتنا توانا تندرست دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً بدحرامی میں بھی کچھ وقتی نشہ ہوتا ہو گا مگر جسے بدحلالی کا چسکا پڑ جائے وہ تو چوبیس گھنٹے سرور میں رہتا ہے اور اس کا اندازہ' آج یہ منظر دیکھنے سے ہوا۔ جیسے وہ اس کی قوت و حشمت کا راز جان گیا ہو' حقیقت پالی ہو۔

کچھ ہی دیر کے بعد اسے سبحان چاچا واپس آتا دکھائی دیا۔

"چاچا! میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔۔۔"

"فیصلہ۔۔۔ کیسا فیصلہ؟" وہ اپنا پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔

"مجھے لال کرتا پہننے کی اجازت دے دو۔۔۔ میں قلی بنوں گا۔۔۔"

"لال کرتا پہنو گے۔۔۔ قلی بنو گے؟" وہ حیران ہوتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"چاچا! محنت میں کیا حرج ہے؟۔۔۔ تم بھی تو قلی ہو' اکٹھے کام کریں گے اور ساتھ آیا کریں گے' ساتھ جایا کریں گے۔۔۔"

"ہاں' یہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ پھر بھی تم مزید غور کر لو۔"

چار روز بعد بسم اللہ جس گاڑی پہ ہوئی وہ کراچی سے آنے والی ایکسپریس ٹرین تھی' ایک بوڑھے سے بزرگ عمرہ کر کے آئے تھے۔ بہت سے لوگ ہار لئے ان کے استقبال کے لئے موجود تھے' مختصر سا سامان

تھا' بسم اللہ پڑھ کر دائیں ہاتھ سے آب زم زم کا ڈبہ اٹھایا' چھوٹا سا اٹیچی کیس سر پہ دھرا' مصلیٰ اور واٹر کولر تھام کر وہ باہر آگیا۔ انہوں نے بیس روپے دینے چاہے تو یہ سر جھکا کر کہنے لگا۔

"حاجی صاحب! آج میرا پہلا دن ہے اور آپ پہلی سواری ہیں۔۔۔ یہ آب زم زم کا ڈبہ پہلی چیز ہے جسے میں نے بسم اللہ پڑھ کر اٹھایا ہے۔۔۔ آپ ہاتھ اٹھا کر میرے حق میں دعا فرما دیں' اللہ تعالیٰ مجھے رزق حلال اور حسن خاتمہ عطا فرمائے۔۔۔"

انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ اٹھا دیئے' دعا کے بعد سر پہ ہاتھ رکھا اور کہا۔

"بیٹا! تمہاری طلب پہ حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔۔۔ اور اب تمہیں بھی میری ایک بات سن کر حیرت ہوگی کہ میں نے تمہارے لئے سلامتی کی حد تک' بوجھ اور قبولیت کی حد تک استقامت کے لئے دعا کی ہے۔" پھر تسبیح' مدینے شریف کی کھجوریں اور آب زم زم کا وہی ڈبہ عطا کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارا حق ہے' حضرت شاہ جمال" کے مزار شریف کے پاس اس فقیر کا مطب ہے۔ جب چاہو' مجھے مل سکتے ہو۔۔۔"

اپنی پہلی بوہنی' کھجوریں اور آب زم زم لے کر وہ سیدھا سبحان چاچا کے پاس پہنچا۔

"یہ کیا۔۔۔؟" سبحان چاچا سے دیکھنے لگا۔

"چاچا! میری پہلی کمائی کے اور مدینے سے آئی ہے' قبول کرو۔۔۔"

سبحان چاچا کی آنکھوں میں آنسو آگئے' سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔

"نادر! تمہیں پہلی کمائی مبارک ہو۔۔۔"

اسٹیشن پہ موجود' قلیوں میں جب یہ متبرک شیرینی بانٹی گئی تو ہر کسی نے سبحان چاچا اور نادر کو مبارک دی اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

●●

نادر چند دنوں میں ہی قلیوں کے حلقے میں مقبول ہوگیا۔ وہ ہر اک سے محبت و احترام سے پیش آتا۔ شیریں گفتاری' نرم لہجہ' مسکراتا ہوا شفیق چہرہ' سگریٹ نہ نسوار' چغلی نہ غیبت' بدگوئی نہ گالی' ہر لمحہ خدمت اور قربان ہونے کو تیار' دوسروں کے لئے خط لکھنا پڑھنا' اخبار کی خبریں سنانا' مشورے دینا' انہی اوصاف حمیدہ نے اسے ہر دل عزیز بنا دیا۔ ٹھیکیداروں' قلیوں کے چھوٹے موٹے مسائل' آپس کے جھگڑے اور دیگر اختلافی معاملات اسی کی رائے مشورے سے فیصل ہونے لگے' انتظامیہ کی میٹنگ اور مذاکروں میں بھی وہی شامل ہوتا۔ سبحان چاچا بہت خوش تھا اس کی دعائیں مستجاب ہو رہی تھیں۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ آہستہ آہستہ ساری ذمہ داریاں اسی کے کندھوں پہ ڈال دے گا۔

داتا سرکار کے عرس میں ابھی دو روز باقی تھے' مسافروں کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ داتا کے عاشق

تکبیر کے نعرے بلند کرتے ہوئے اترتے اور رقص کرتے ٹولیوں کی صورت دربار کی جانب روانہ ہو جاتے' نادر نے قلی برادری کی جانب سے پلیٹ فارموں پہ ٹھنڈے شربت کی سبیلوں کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ زائرین کا سامان بھی بغیر کسی اجرت کے اٹھایا جا رہا تھا اور شاید یہ پہلا موقع تھا کہ داتا سرکار کے مہمانوں کا اس طرح استقبال کیا جا رہا تھا۔ یہ سب کچھ نادر کی داتا سرکار سے عقیدت اور تنگ و دو کا سلسلہ تھا۔

اسی دن شام سے ذرا پہلے سبحان چاچا کے دونوں بھائی' والدہ اور رابعہ بغیر کسی پیشگی اطلاع گھر پہنچ گئے' یہ دونوں مغرب کی نماز پڑھ کر' کھانا کھانے گھر پہنچے تو یہ لوگ بھی بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی نادر نے واپس پلٹنا چاہا مگر سبحان چاچا نے اسے روک کر اپنے ساتھ چارپائی پہ بٹھا لیا۔ خیر خیریت پوچھنے کے بعد اس نے بھائیوں اور والدہ سے تعارف کرایا۔ رابعہ ننگے سر' ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے کرسی پہ بیٹھی اس جوان کو دیکھ رہی تھی۔ پہلی نظر میں یہ نوجوان اسے اچھا لگا جو سر جھکائے رعنائی اور وقار کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ پھر کھانے سے فارغ ہوئے تو والدہ نے کہا۔

"سبحان پتر! اس وقت اگر ہم داتا صاحب سلام کر آئیں تو بہت اچھا ہے' رات پڑ گئی تو بھیڑ بھاڑ میں بڑی تکلیف ہوگی۔۔۔"

"ہاں' بے بے! ٹھنڈے ٹھنڈے آپ ہو ہی آئیں تو اچھا ہے۔۔۔ نادر! جاؤ پتر' تانگہ لے آؤ اور تم بھی ساتھ چلے جاؤ' میرا اسٹیشن پہ رہنا ضروری ہے۔۔۔"

نادر باہر چلا گیا تو رابعہ نے پوچھا۔

"ابا! یہ تو پڑھا لکھا لگتا ہے' پھر قلیوں کا کام کیوں کرتا ہے؟"

"پتری! قلیوں کا کام کوئی برا تو نہیں' حق حلال کی محنت ہے۔۔۔ کام کا کام' آزادی کی آزادی' ہزاروں انسان یہ کام کرتے ہیں' ان پڑھ بھی اور پڑھے لکھے بھی۔۔۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اس کام میں عزت نہیں۔۔۔ قلی' قلی ہے چاہے وہ لکھ پتی ہو۔۔۔"

نادر نے باہر سے ہی اطلاع دی کہ تانگہ آگیا ہے۔ وہ لوگ تیار ہی تھے' آواز سنتے ہی باہر آگئے۔ رابعہ اپنی دادی اور والدہ کے ساتھ پیچھے بیٹھ گئی۔ چچا' تایا آگے بیٹھ گئے اور نادر تانگے پہ بیٹھنے کی بجائے سبحان چاچا کے پاس آگیا۔

"چاچا۔۔۔" وہ جھجکتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "رابعہ کیا یوں ہی جائے گی۔۔۔ میرا مطلب ہے اسی طرح دوپٹے میں' منہ کھلے۔۔۔؟"

سبحان چاچا کوئی جواب دینے کی بجائے تانگے کے پاس آیا۔

"رابعہ پتری!۔۔۔ ذرا اندر آؤ۔"

رابعہ کے ساتھ اس کی ماں بھی آگئی۔ وہ آرام سے اسے سمجھانے لگا۔

"پتری! یوں تیرا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔۔۔ عرس کے دن ہیں' بھیڑ بھاڑ میں اچھے برے سب ہی ہوتے ہیں اور عورت ذات پردے میں ہو تو کسی کی جرات نہیں پڑتی' فرشتے بھی اس کی حفاظت کرتے ہیں پتر!" وہ اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "کوئی برقع یا ماں کی کوئی چادر وادر اوڑھ لے۔۔۔"

وہ غصے سے نادر کو گھورتی ہوئی اور ماں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

"بے بے! آپ تو شہر میں رہتے ہوئے بھی گاؤں والوں سے پیچھے ہیں۔۔۔ اپنی نیت صاف ہونی چاہیے۔ کوئی کسی کو کھا نہیں جاتا اور اسی لئے تو میں یہاں آتی نہیں۔۔۔ یہ نہ کر' وہ نہ کر۔۔۔"

ماں نے نرمی سے سمجھایا۔ "رابعہ! پردہ کوئی بری بات نہیں' عورت کی عزت آبرو کا محافظ ہے' اللہ رسول کا حکم ہے۔۔۔ داتا صاحب سلام کے لئے جا رہی ہو تو قاعدے طریقے سے جانا چاہیے۔۔۔"

"آپ کے یہ قاعدے طریقے میری سمجھ نہیں آتے۔۔۔ صاف صاف بات ہے' نہ تو میرے پاس برقع ہے اور نہ ہی میں پہن کر کارٹون بنوں گی۔۔۔"

نادر خاموشی سے یہ باتیں سن رہا تھا' بغیر کچھ کہے باہر نکل گیا۔ رابعہ اسے باہر نکلتے دیکھ کر پھر بولی۔

"میرا خیال ہے' اس مولوی نے یہ برقعے والی بات شروع کی ہے۔۔۔"

"اگر اس نے یہ بات کی بھی ہے تو تیرے بھلے کے لئے کی ہے۔۔۔" سبحان چاچا بولا۔

"یہ کون ہوتا ہے میرا بھلا اور برا سوچنے والا؟۔۔۔ آیا بڑا مجھے برقع پہنانے والا۔۔۔!"

اتنی دیر میں سبحان چاچا کے دونوں بھائی اور والدہ بھی اندر آ گئے اور انہیں بحث میں الجھا دیکھ کر وہ بھی چارپائی پہ بیٹھ گئے پھر دادی نے بھی اسے سمجھایا مگر رابعہ تو ہوا کے گھوڑے پہ سوار تھی۔ سبحان چاچا بات کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اتنے عرصے کے بعد بیٹی آئی تھی' وہ تو اسے کچھ دن یہاں رکھنا اور لاہور کی سیر کرانا چاہتا تھا مگر یہاں تو معاملہ ہی بگڑ گیا۔ اتنے میں نادر بھی واپس آ گیا' ایک پیکٹ سبحان چاچا کو دیتے ہوئے بولا۔

"چاچا! رابعہ سے کہو' یہ برقع پہن لے۔۔۔ جلدی کرے' تانگے والا انتظار کر رہا ہے۔۔۔"

"لو رابعہ! برقع پہن لو۔۔۔ جلدی کرو۔" سبحان چاچا نے برقع رابعہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

رابعہ نے برقع لے کر چارپائی پہ پھینکتے ہوئے کہا۔

"یہ کون ہوتا ہے میرے لئے برقع لانے اور پہنانے والا۔۔۔ دو پیسے کا قلی!"

"رابعہ۔۔۔"

سبحان چاچا شیر کی مانند دہاڑا اور ایک بھرپور تھپڑ کی آواز گونجی۔ رابعہ اپنی دادی کی گود میں دہری ہو کر گر پڑی۔ ماحول کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔۔۔ تھپڑ مارنے والا یہ ہاتھ بھی ایک قلی کا تھا جس کا نام سبحان چاچا تھا' کافی دیر تک فضا میں تھپڑ کی بازگشت گونجتی رہی۔

وہ دوسرا روز تھا اور نادر کا کہیں پتہ نہیں تھا' اسٹیشن پر بھی وہ نہ آیا۔ سبحان کے بھائی' والدہ اور رابعہ تو اسی روز واپس چلے گئے تھے مگر یہاں اچھی خاصی بدمزگی پیدا کر گئے۔ دو روز سے گھر کا چولہا ٹھنڈا پڑا تھا۔ سبحان سوچ رہا تھا کہ رابعہ کی پرورش میں اس سے کہاں غلطی ہوئی ہے' رابعہ کا یہ طرز عمل اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔۔۔ رابعہ کو تو اپنا نام بھی پسند نہیں تھا' رابعہ کی بجائے وہ روبی کہلانا پسند کرتی اور بال بھی ہلکے ہلکے ترشوا لئے تھے۔ دوپٹہ اگر ہوتا تو وہ بھی شانوں پہ پڑا رہتا اور نیل پالش سے رنگے اور بڑھے ہوئے ناخن وہ بڑے فخر سے دیکھتی رہتی' سات آٹھ ماہ میں وہ کتنا بدل گئی تھی۔ سبحان چاچا نے تو یہ سوچ کر اسے گاؤں رکھا ہوا تھا کہ شہر میں وہ اس کی تعلیم و تربیت پہ توجہ نہیں دے سکتا تھا۔ پھر اس کا یہ بھی خیال تھا کہ بھائی کے گھر ہی وہ بہتر رہے گی۔ دادی بھی وہیں' بیٹا محمد یوسف بھی وہیں تھا مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ گاؤں اور اپنوں میں رہ کر وہ اور بگڑ جائے گی' بدتمیزی گستاخی کی حد تک خود سر ہو جائے گی اور یہ سوچ سوچ کر بھی وہ پانی پانی ہو رہا تھا کہ نادر نے کیا سوچا ہو گا' اس نے کیا محسوس کیا ہو گا اور وہ کہاں چلا گیا ہے؟۔۔۔ اسٹیشن پہ قلی بھی پریشان تھے کہ عرس کے موقع پہ اتنی سرگرمی دکھا کر وہ دونوں بغیر اطلاع غائب ہو گئے۔ کئی قلی گھر بھی آئے۔ سبحان تو بخار میں پھنک رہا تھا' کسی کو کیا بتاتا کہ اس پہ کیا گذر گئی ہے اور نادر کے متعلق بھی وہ کیا بتاتا' اسے تو خود اس کی فکر کھائے جا رہی تھی' طرح طرح کے وسوسے سر اٹھا رہے تھے اور خود اس میں ہمت نہیں تھی کہ اسے تلاش کرتا۔

تیسرے روز دوپہر سے پہلے باہر دروازے پہ کھٹکا ہوا' بیوی دیکھنے نکلی تو نادر پریشان سا سر جھکائے کھڑا تھا۔

"چاچا کی طبیعت کیسی ہے۔۔۔؟" اس نے باہر کھڑے کھڑے ہی پوچھ ڈالا۔

"اندر آ جاؤ نادر۔۔۔!"

سبحان چاچا نے اندر ہی سے آواز دی۔ وہ پاس آ کر چارپائی پہ بیٹھ گیا' پاؤں دابنے لگا۔

"میں نے آج ہی سنا ہے کہ تمہاری طبیعت خراب ہے۔۔۔ سیدھا ادھر ہی آ گیا ہوں۔" وہ بولا۔

"اچھا کیا کہ تم آ گئے' کہاں تھے؟۔۔۔ آج تیسرا روز ہے تمہیں تلاش کرتے ہوئے۔۔۔" سبحان اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"لیٹے رہو چاچا! تمہیں بہت تیز بخار ہے۔ کوئی دوا وغیرہ کھائی ہے یا یوں ہی پڑے ہوئے ہو۔۔۔؟" نادر نے اسے واپس لٹا دیا۔

"بس نادر۔۔۔ تم آ گئے ہو تو بخار اب چلا جائے گا' دوا کی ضرورت نہیں۔۔۔ کہاں تھے دو روز سے۔۔۔؟" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"چاچا! واپس آ کر بتاتا ہوں۔۔۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولا اور باہر نکل گیا۔ واپس آیا تو پھل اور جوس کے ڈبے چاچی کو دیتے ہوئے بولا۔

"میں ڈاکٹر سے بخار اور کمزوری کی دوا لایا ہوں۔۔۔ یہ گولیاں ابھی کھلا دیتے ہیں۔ انشاء اللہ شام تک آرام آجائے گا۔"

"جلدی کھانا بناؤ' نادر کو بھوک لگی ہوگی۔۔۔" سبحان چاچا نے بیوی کو کھانا تیار کرنے کے لئے کہا۔

نادر کاندھے دباتے ہوئے بولا۔ "چاچا! میں معافی چاہتا ہوں' مجھے آپ کے ذاتی معاملے میں بولنا نہیں چاہیے تھا۔۔۔ میں دو روز دا تا سرکار بیٹھا رہا ہوں۔ میں بہت شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے یہ ساری بدمزگی پیدا ہوئی' میں تو۔۔۔"

"بس' بس۔۔۔" سبحان چاچا اسے ٹوکتے ہوئے بولا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے پہلے روز جب تم اسٹیشن پہ بغیر ٹکٹ اترے تھے' تمہیں جیل خانے سے بچانے کے لئے تمہارے ذاتی معاملے میں دخل دیا تھا؟۔۔۔ نہیں بیٹا! ایسا کبھی مت سوچنا' انسان اور مسلمان ہونے کے ناتے تم نے اپنا حق اور فرض ادا کیا۔ ہم سب مسلمان ایک دوسرے کے بھائی بند ہیں' ایک کنبہ ہیں۔۔۔ برائی اسی وجہ سے پھیلتی ہے کہ ہم اپنا آپ یا اپنا گھر ہی صاف دیکھنا چاہتے ہیں۔ اپنی گلی' محلہ' علاقہ' شہر یا باقی ساری دنیا سے کوئی سروکار یا دلچسپی نہیں رکھتے۔ تم اگر اپنی ذاتی حیثیت میں اچھے ہو تو اچھی بات ہے مگر یہ بہت ہی اچھا ہے کہ تم دوسروں کو بھی اچھا سمجھو اور ان کے اچھا بننے میں مددگار بنو۔۔۔"

"یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر آپ نے دیکھ لیا کہ میری اس حرکت سے کتنی بدمزگی اور پریشانی پیدا ہوئی ہے۔۔۔ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ میں خاموش رہتا؟" نادر بولا۔

"۔۔۔تم خاموش رہ سکتے تھے مگر تم اپنے ضمیر کی آواز اور اپنے احساسات کو دبا نہیں سکے' یہی خوبی تمہیں عام انسانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ تم منافق اور خاموش تماشائی نہیں ہو۔۔۔ باقی رہی بات بدمزگی کی' تو یاد رکھو کہ حق بات کہنے والے کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتے' کسی سے نہیں ڈرتے' تم نے علامہ اقبال کا یہ شعر تو سنا ہوگا۔

آئین جواں مرداں' حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

"نادر پتر! یہ باتیں چھوڑو اور کھانا کھاؤ۔۔۔ تمہارے چاچے نے بھی دو روز سے ایک لقمہ بھی حلق سے نیچے نہیں اتارا' اسے بھی کھلاؤ۔۔۔" سبحان چاچا کی بیوی کھانا رکھتے ہوئے بولی۔

"اٹھ چاچا! میرے ساتھ کھانا کھا۔۔۔"

نادر کی آنکھوں میں آنسو تھے' سبحان نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "نادر! کاش' تم نے میرے گھر جنم لیا ہوتا' اللہ نے مجھے بیٹا تو دیا مگر بڑا سیدھا اور معصوم' بس اللہ لوک' قرآن پڑھتے حفظ

کرنے کا شوقین۔۔۔ بنی ہے تو اسے بھائی کے گھر ہی رکھا کہ یہاں شہر میں رہنا اس کے لئے مناسب نہیں' یہی سوچا کہ اس طرح وہ زمانے کے بدلتے ہوئے رجحانات اور طور طریقوں سے محفوظ رہے گی اور وقت پر اس کی شادی بھی سلیم سے کردیں گے' حافظ محمد یوسف کو بھی رخصین رخسانہ کے ساتھ بیاہ دیں گے مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ رابعہ اس قدر بیباک اور نڈر ہو جائے گی۔۔۔ دراصل بھائی کے گھر میں دو ہی کے پیسے نے سب کو بگاڑ دیا ہے' رہی سہی کسر ٹی وی اور وی سی آر نے پوری کر دی اور جس گھر میں کوئی بڑا موجود نہ ہو وہاں اولاد کا یہی حشر ہوتا ہے۔۔۔ میں یہی سوچ سوچ کر پریشان ہوں کہ رابعہ کا کیا بنے گا؟"

"چھوڑیں چاچا! آپ پریشان نہ ہوں' کھانا کھائیں۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔۔۔ یہ برقع سنبھال کر رکھیں' انشاء اللہ ایک دن یہی برقع وہ خود طلب کرے گی اور آپ صرف اس کے لئے دعا کریں۔۔۔"

●●

اس روز اسٹیشن کے شرقی حصے میں جیسے بھڑوں کے چھتے چھڑے پڑے تھے' انسانی بھڑوں کی بھیں بھیں سے سارا اسٹیشن بھرا ہوا تھا۔ سمجھوتا ایکسپریس حفاظتی آہنی جنگلوں کے پنجرے میں کسی بے بس چوہیا کی مانند پھنس کر پلیٹ فارم پر لگ چکی تھی۔ امیگریشن' کسٹم' ایجنٹ' قلیوں اور جائز ناجائز کرنسی کا کاروبار کرنے والوں نے حسب توفیق اپنے اپنے قاعدے قانون' طور طریقوں اور ہتھکنڈوں کے تیز اور کند اوزار تیار کر لئے۔ مفلوک الحال' لاغر اور سہمے سہمے ڈرے ہوئے مسافر بھینٹ چڑھانے والی معصوم بھیڑوں کی مانند اترنا شروع ہوئے تو لوٹ رنگ کرتے والے قلیوں نے اپنی اپنی آسامیوں کو قابو کر لیا۔۔۔ امرتسر سے لاہور تک لڑھکنے والی' چوہے کے پنجرے جیسی اس گاڑی کو نادر مذاق میں لنگڑا خچر کہا کرتا تھا' گدھی نہ گھوڑی' تیتر نہ بٹیر' ہندو نہ مسلمان۔۔۔ اس کے آنے سے اسٹیشن والوں کے منہ کا ذائقہ تک بدل جاتا تھا۔ امیگریشن' کسٹم' پولیس والوں کے علاوہ کرنسی' الائچی' پان کتھا' قوام' کیسر' سلک' چاندی والوں کی خرید و فروخت' لوٹ کھسوٹ' بھاؤ تاؤ' سودے بازیاں بڑا لطف دیتی تھیں۔ امرتسر' فیروزپور' لدھیانے' جالندھر کی تازہ بتازہ خبریں' کچھ آنسو' کچھ قہقہے' جیسے پھلجھڑیاں' رنگوں کی ست رنگی پچکاریاں پوری فضا میں دیوالی کے دھنک رنگ بکھیر دیتیں' ہندو سکھ بھی خوش' مسلمان بھی راضی۔۔۔ نادر کے حصے میں جو مسافر آئے وہ صاف ستھری اچکن پہنے ہوئے ایک بیمار بوڑھا اور اس کے ساتھ سیاہ برقعے میں لپٹی لپٹائی لڑکی یا دھان پان سی عورت مختصر سا سامان جو قطعی قابل دست درازی قلی نہ تھا' نہ پان کی ٹوکری' نہ ٹین کے بدرنگے ٹرنک' لوٹے نہ پاندان' دوسرے روایتی قلیوں کے برعکس نادر نے ان کا مختصر سا سامان اپنی تحویل میں لینے کے بعد کسی خاص ردعمل کا اظہار نہ کیا لیکن جب بوڑھے آدمی نے ایک خالی بنچ کو دیکھ کر کچھ دیر سستا لینے کی درخواست کی' بیٹا اور جزاک اللہ کہا تو نادر کو یوں محسوس ہوا جیسے یہ لوگ امرتسر سے نہیں' اجمیر شریف سے آئے ہوں۔ دل ہی دل میں بڑا خوش ہوا کہ کسی مسلمان اور

بزرگ کی خدمت کا موقع ملا۔ اسے احساس تو ہو گیا تھا کہ یہ بزرگ بیمار ہیں۔ برقعے والی خاتون نے انہیں سہارا دے کر بنچ پہ بٹھایا' پرس سے کوئی دوا نکال کر انہیں کھلائی۔ ایک گلاس نادر کو دیتے ہوئے وہ پہلی بار بولی۔

"براہ کرم تھوڑا سا پانی لا دیں۔۔۔"

نادر نلکے کی جانب لپکا' مہذب اور پاکیزہ لہجے کا ترنم اسے اپنے جلو میں لئے ہوئے تھا۔ واپس آیا تو بزرگ بنچ پہ لیٹ چکے تھے' خاتون ایک دستی پنکھے سے انہیں ہوا دے رہی تھی۔ پانی کا گلاس لیتے ہوئے خاتون بولی۔

"ابا کی طبیعت خراب ہے۔۔۔ زحمت نہ ہو تو کچھ دیر انتظار کریں اور اگر آپ جانا چاہیں تو یہ حقیر سا معاوضہ قبول کریں۔۔۔" وہ اسے کچھ دیتے ہوئے بولی۔

نادر ایک دم بدک اٹھا۔ "نہیں' مجھے کوئی جلدی نہیں۔" نادر نے کہا۔ "یہ پیسے اپنے پاس رکھیں۔ میں بھی آپ کی طرح فکر مند ہوں' آپ کہیں تو کسی ڈاکٹر۔۔۔؟"

"میرا خیال ہے کہ ابھی کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔۔۔ دوا دے دی ہے' انشاء اللہ تھوڑی دیر میں افاقہ ہو جائے گا۔۔۔"

"انہیں کیا تکلیف ہے۔۔۔؟" نادر نے محض بات بڑھانے کی غرض سے پوچھا۔

"ابا دل کے مریض ہیں مگر یہ دل کا دورہ نہیں' محض ہیجانی کیفیت ہے۔۔۔ چالیس برس سے اس سرزمین کو چومنے کی حسرت دل کا روگ بن گئی تھی۔ آج یہاں پہنچ کر ان کی حالت خلاف توقع نہیں ہے۔"

نادر کپکپاتی ہوئی آواز کی تھرتھراہٹ صاف محسوس کر رہا تھا' وہ بھی اپنے جذبات پہ قابو نہیں پا رہی تھی۔۔۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد نادر بولا۔

"آپ گھبرائیں نہیں' مجھے صرف پانچ منٹ کے لئے اجازت دیں۔ میں ویٹنگ روم میں آپ کو بٹھانے کا انتظام کرتا ہوں' یہاں بیٹھنا آپ کے لئے مناسب نہیں۔۔۔"

وہ جانے کے لئے لپکا ہی تھا مگر اچانک رک گیا' پوچھنے لگا۔

"یہاں آپ کا کوئی رشتہ دار۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ کوئی آپ کو یہاں لینے کے لئے تو نہیں آنے والا۔۔۔؟"

اس سے پیشتر کہ وہ خاتون کوئی جواب دیتی بزرگ نقاہت بھری آواز میں گویا ہوئے۔

"نہیں بیٹا! یہاں ہمیں کوئی لینے کے لئے نہیں آئے گا۔۔۔" وہ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے مزید بولے۔ "بہتر ہے کہ آپ ہمیں اپنے ساتھ ہی ویٹنگ روم تک لے چلیں۔ میں دو نفل شکرانے کے پڑھنا

چاہتا ہوں۔۔۔"

ویٹنگ روم میں انہیں بٹھا کر وہ چائے لینے کے لئے باہر نکل آیا۔ صاف ستھری چائے دانی' لش لش کرتے ہوئے کپ' پیسٹری' نمکین بسکٹ ٹرے میں دھرے جب وہ اندر داخل ہوا تو بزرگ جائے نماز پہ عجز و انکسار کی گٹھڑی بنے دعا مانگ رہے تھے۔ کپکپاتے لرزتے ہونٹ' بھیگی ہوئی آنکھیں' بید مجنوں کی مانند کانپتی ہوئی استخوانی انگلیاں۔۔۔ اسے وہ لڑکی نظر نہ آئی شاید غسل خانے میں تھی۔ ٹرے میز پہ رکھ کر وہ پھر انہیں دعا مانگتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اس نے آج تک کسی کو ایسے بکھر کر' ٹوٹ کر' ڈوب کر' نماز پڑھتے یا دعا مانگتے نہیں دیکھا تھا۔۔۔ اسی محویت میں اسے اپنے پاس پاکیزہ سی تازگی کا جھونکا محسوس ہوا۔ خاتون برقعے میں سمٹی سمٹائی چائے بنانے میں مصروف تھی' بزرگ دعا کے بعد تسبیح میں مشغول ہو گئے۔

"لیجئے۔۔۔" وہ اچانک چائے کا کپ نادر کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

"جی۔۔۔" وہ ہکلانے لگا۔ "میں چائے پی چکا ہوں۔ آپ ابا کو دے دیجئے۔۔۔ "یہ بسکٹ بھی لیجئے۔" نادر پیکٹ کھول کر بسکٹ پیش کرتے ہوئے بولا۔

"شکریہ۔۔۔ جزاک اللہ بیٹا! اب میری طبیعت ٹھیک ہے۔ خدا تمہارا بھلا کرے' تم نے ہمارا بڑا خیال رکھا۔۔۔"

"جی' یہ میرا فرض تھا۔۔۔ آپ بزرگ ہیں' پھر ہمارے مہمان بھی ہیں۔" نادر جیسے الفاظ کی تلاش کر رہا ہو۔

"نہیں بیٹا! ہم مہمان نہیں' اپنے گھر میں ہیں اور اپنے گھر کوئی مہمان نہیں ہوتا۔۔۔"

"آپ کا گھر کہاں ہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے' یہیں لاہور یا کسی دوسرے شہر جائیں گے۔۔۔؟"

"پہلے تم بتاؤ' تم لاہور کے ہو یا کسی اور شہر کے۔۔۔؟"

"میں جی۔۔۔ چیچا وطنی کا ہوں' یہاں مزدوری کرتا ہوں۔"

خاتون اور بزرگ کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔

"چیچا وطنی۔۔۔ شہر یا کسی گاؤں میں رہتے ہو؟"

"جی' شہر سے قریب ہی میرا گاؤں ہے۔۔۔" پھر نادر ان کا رد عمل محسوس کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"چیچا وطنی آپ کا کوئی عزیز رہتا ہے یا آپ وہاں جانا چاہتے ہیں؟"

"بیٹے! اس بات کا جواب میں ابھی نہیں دے سکتا لیکن ابھی اگر تم ہماری ایک اور سلسلے میں مدد کر سکو تو یہ بوڑھا بے حد ممنون ہو گا۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا وقت بڑا قیمتی ہے مگر میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا' تمہارے وقت اور خدمت کا معقول معاوضہ پیش خدمت کروں گا۔۔۔"

نادر نے قدرے کبیدہ خاطر ہوتے ہوئے کہا۔ "آپ نے کئی بار مجھے بیٹا کہا ہے' آپ کا پاکیزہ لہجہ اور

اس میں چھپی ہوئی اپنائیت نے مجھے کیا کیا لطافتیں' مسرتیں اور کیفیتیں بخشی ہیں' میں اس کا اظہار کرنا بھی چاہوں تو نہیں کرسکتا--- مانا کہ میں ایک مزدور قلی ہوں مگر شاید میں ایک ادنیٰ سا انسان بھی ہوں اور باپ کی شفقت اور سائے سے محروم ایک یتیم بھی---" برقعے کی اوٹ میں کیا عالم تھا' خدا جانے--- بزرگ کی آنکھوں میں آنسو تھے' سراپا کانپ رہا تھا' تشنج سی کیفیت تھی اور نادر بھی جیسے بے خودی کے عالم میں بہا جا رہا تھا۔ "آپ مجھے بیٹا بھی کہتے ہیں اور میرے وقت' خدمت کا معاوضہ بھی دیتے ہیں---" وہ یکبارگی اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ کو قلی چاہیے تو میں باہر سے بھیج دیتا ہوں لیکن بیٹا کہا ہے تو مشفق باپ کی طرح حکم دیجئے' جان بھی حاضر ہے---"

خاتون گولی کی سی تیزی سے اٹھی اور غسلخانے میں چلی گئی' بزرگ ایک بار پھر ڈھے گئے۔ نادر یہ صورت حال دیکھ کر گھبرا سا گیا' اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ رو میں بہہ کر وہ کیا کچھ کہہ گیا ہے؟ جب انسان کا باطن بولتا ہے تو جسمانی سماعتیں اور حسیاتی خلئے غض اور غتربود ہو جاتے ہیں' محرومیوں اور ناآسودگیوں کا مارا ہوا نادر کہنے کو تو کہہ گیا مگر اب پریشان تھا۔ اسی پریشانی کے عالم میں بزرگ کے پاؤں سہلانے لگا۔ ذرا دیر بعد لپٹی لپٹائی خاتون بھی آگئی۔ پرس سے دوا نکال کر ابو کو کھلائی۔ پہلی بار یا شائد دوسری بار زبان کھولی۔

"گھبرائیں نہیں' ابا ٹھیک ہو جائیں گے---"

جبکہ نادر واضح طور پر محسوس کر رہا تھا کہ وہ خود ٹھیک نہیں--- ابھی تک وہ یہ بھی نہ جان پایا تھا کہ یہ خاتون عورت ہے یا لڑکی' نہ ہی اسے اس کی کرید تھی لیکن جس طرح اس نے خود کو اتنے اہتمام سے مستور کر رکھا تھا کہ جسم کا ایک انچ حصہ بھی برہنہ دکھائی نہ دے' قابل غور ضرور تھا۔ وہ بے حد مذہبی پردے کی پابند یا پھر بے حد خوبصورت' بدصورت یا کافی بھینگی تھی لیکن اس کا پروقار برتاؤ' ٹھہرا ہوا محترم لہجہ' محتاط انداز میں گفتگو اسے پڑھی لکھی' سلیقہ شعار اور مذہبی اخلاقی قدروں کی پروردہ ظاہر کرتا تھا--- اسے خاموش پا کر وہ پھر بولی۔

"آپ ناحق پریشان مت ہوں--- آپ ذرا ابا کا خیال رکھیں۔ میں بھی ذرا---" وہ سلے کو سیدھا کرنے لگی۔

بزرگ جلد ہی نارمل ہو گئے' نادر کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے۔ "بیٹا! میں بے دھیانا' بے گیانا سور کھ ہوں اور بڑھاپے اور بیماری نے رہی سہی سدھ بھی مار دی ہے۔ ایسے میں میرے منہ سے کوئی ایسی بات نکل گئی ہو تو مجھے معاف کر دو--- بیٹا! میری آخری خواہش ہے کہ مجھے داتا سرکار کے قدموں میں لے چلو۔ اب نہ تو مجھ میں صبر کا یارا ہے اور نہ ہی وقت--- داتا سرکار کا مجھ پہ کچھ قرض ہے' لوٹانے میں کوئی تاخیر نہ ہو جائے---" وہ روہانسو سے ہو گئے' پھر بولے۔ "اگر خدا کو منظور ہوا تو پھر اپنے پر کھوں اور اپنی جنم

بھومی چیچا وطنی جانے کی کوشش کروں گا۔ یہاں ایک دو بزرگوں سے بھی ملنا ہے' خدا کرے وہ زندہ ہوں اور مجھے مل جائیں---" کچھ دیر خاموشی اختیار کرنے کے بعد پھر کہنے لگے۔ "بیٹا! میں تمہیں کس نام سے پکاروں؟"

"جی میرا نام نادر ہے--- چوہدری محمد نادر!"

"نادر بیٹے! اب اصولاً مجھے بھی اپنا تعارف کرانا چاہیے--- مگر نہیں! ابھی شائد مناسب نہیں---" وہ اپنی بیٹی کی جانب دیکھتے ہوئے بولے۔ "یہ میری اکلوتی بیٹی بجوریہ ہے۔"

پھر کچھ سوچنے لگے۔

"نادر! پھر وہی بات دہرانے لگا ہوں--- جوان بیٹی کا ساتھ' میرا بڑھاپا' بیماری--- میری درخواست ہے کہ یہاں ہمارے قیام کے دوران تم ہمارے ساتھ رہو---"

بجوریہ نے ابا کی اجازت سے بات بڑھائی۔

"نادر صاحب! آپ بڑے مخلص اور شریف انسان ہیں--- ابا کا لاہور سے بڑا جذباتی لگاؤ ہے' حالات' بیماری اور کاروبار نے اجازت نہ دی ورنہ ہم کب کے یہاں پہنچ چکے ہوتے۔ اب میں ان کی صحت کے پیش نظر مجبور کر کے یہاں لے آئی ہوں--- تفصیل سے گفتگو کرنے کا یہ موقع نہیں ہے' فی الحال آپ فوری طور پر ہمیں داتا سرکار لے جانے کا انتظام کر دیں--- آپ کو برا نہ لگے تو ایک بار پھر یہ الفاظ کہنے پہ مجبور ہوں کہ ہم آپ کا یہ احسان کبھی فراموش نہیں کریں گے--- اور ہاں' ہم آپ پہ کسی طور بوجھ نہیں بنیں گے---"

بس' بی بی! یہ بات بار بار دہرا کر مجھے اپنی نظروں سے نہ گرائیں--- پہلی بات تو یہ کہ آپ داتا سرکار کی نگری میں ہیں' ان کی نگاہ میں ہیں' ان ہی کے مہمان ہیں۔ میں بھی ان کے در کا کتا ہوں اور دوسری بات یہ کہ میں اس وقت تک آپ کے ساتھ ہوں جب تک آپ خود مجھے اجازت نہ دیں--- آپ تیار ہوں' میں دس منٹ میں حاضر ہوتا ہوں---"

باہر نکل کر نادر نے چاچا سبحان کو تلاش کیا۔ بابے قاسم سے معلوم ہوا کہ وہ شائد گھر چلا گیا ہے' اس نے پیغام دیا کہ سبحان چاچا کو اطلاع کر دینا' میں مہمانوں کو لے کر داتا سرکار جا رہا ہوں--- واپسی کا معلوم نہیں' ملنا ہو تو وہیں پہنچ جائے۔

تانگے پہ بیٹھے تو بزرگ کہنے لگے۔

"نادر! پہلے داتا سرکار کے قریب کسی معقول سے ہوٹل میں قیام کا بندوبست کر لینا---"

داتا سرکار چوک کے پائیلٹ ہوٹل میں ایک معقول سا ڈبل کمرہ حاصل کرنے کے بعد نادر کھانے پینے کا انتظام کرنے کے لئے باہر نکل آیا' باہر نکلتے ہی معاً اس کی نظر داتا سرکار کے سبز گنبد پہ پڑی' وہیں سر

نیہوڑے کھڑے کھڑے زیرِ لب عرض کرنے لگا۔

"سرکار! یہ آپ کے مہمان ہیں اور میں آپ کا بنایا اور بھیجا ہوا قلی ہوں۔ آج آپ نے اپنے مہمانوں کی ذمہ داری اور خدمت کا جو بوجھ میرے کندھوں پہ ڈال دیا ہے' اس کے لئے میں شکر گزار ہوں۔۔۔ سرکار! میں بہت ناتواں اور کمزور ہوں۔۔۔"

دیر تک وہ اپنی سرخروئی' توفیق' صبر کے لئے دعائیں کرتا رہا۔ پھر پھل' کھانے پینے کا سامان' دیگر ضروریات کی اشیاء خرید کر جب واپس ہوٹل آیا تو باپ بیٹی غسل سے فارغ ہونے کے بعد کپڑے بدل کے تیار بیٹھے تھے اور جویریہ بدستور برقعے میں لپٹی لپٹائی گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ اسے شدت سے محسوس ہوا جیسے برقع اس کی شخصیت کا جزو لاینفک ہو' وہ برقعے کے بغیر ادھوری ہو۔۔۔ اسی لمحے رابعہ کا سراپا ذہن میں ابھرا جو برقعے کو ایک بوجھ اور پرانا فیشن سمجھتی تھی۔ کاش! وہ جان سکتی کہ برقع نسائیت کو کیسا دلاویز وقار اور دلکش اسرار بخشتا ہے' مستور عورت کتنی محترم و مامون ہوتی ہے' نیک و بد نظروں کی تیز دھوپ سے کتنی محفوظ ہوتی ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو نادر؟"

بزرگ نے اسے گم سم دیکھ کر پوچھا تو نادر جیسے سوچوں کے گرداب سے ابھرا۔

"جی' لیجئے کچھ کھا پی لیجئے۔" وہ آم دکھاتے ہوئے بولا۔ "انور رٹول' بڑا خاص آم ہے۔ یہ سندھ کے خربوزے' یہ لوکاٹ۔۔۔"

سبحان چاچا جب پوچھتا پاچھتا کمرے میں داخل ہوا تو یہ لوگ کھانا کھا رہے تھے' نادر کو جیسے گلوکوز کی بوتل لگ گئی' آگے بڑھ کر اس نے سبحان چاچا کو جی بسم اللہ کہا' تعارف کرایا۔ بزرگ نے انھیں اپنے پاس بٹھا کر کھانے میں شریک کیا اور کھانے کے دوران بات چیت بھی ہوتی رہی۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ بھی ویچا وطنی کے رہنے والے ہیں تو اس کی دلچسپی دوچند ہو گئی۔ جویریہ کا کمرے کے اندر بھی مستور رہنا اسے بڑا بھلا لگا۔۔۔ کھانے کے اختتام تک آپس کی ساری اجنبیت دور ہو چکی تھی۔ سبحان چاچا نے تحسین بھری نظروں سے نادر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"نادر بیٹے! محسوس ہوتا ہے' داتا سرکار نے تمہیں اپنے مہمانوں اور دیوانوں کی خدمت اور استقبال کے لئے ہی اسٹیشن پہ مامور فرمایا ہے۔۔۔"

"چاچا! دعا کرو کہ سرکار مجھے اس قابل بھی بنا دیں۔۔۔" نادر کی آنکھیں بھر آئیں۔

ہوٹل کی سیڑھیوں سے اترتے وقت سبحان چاچا نے بزرگ کو سہارا دے رکھا تھا' بائیں جانب نادر تھا اور جویریہ پیچھے پیچھے۔۔۔ سڑک پار کرتے ہی نادر ایک پھولوں والی دوکان پہ رکا تو بزرگ نے ہاتھ کے اشارے سے پھول لینے سے منع کر دیا اور سانس سنبھالتے ہوئے بولے۔

"نادر! میں آنسوؤں کی لڑیاں لے کر آیا ہوں' ان پھولوں کی ضرورت نہیں۔۔۔"

پھر جیسے جیسے وہ دربار کے قریب ہوتے گئے' سبحان چاچا اور نادر کے بازوؤں پہ بوجھ بھی بڑھتا گیا۔ تنگ بازار' غیر معمولی بھیڑ بھاڑ' فقیر اپاہج اور زائرین کی آمدورفت میں بزرگ کو سنبھالنے میں بڑی دقت پیش آ رہی تھی۔ ڈیوڑھی کی سیڑھیوں تک پہنچتے پہنچتے دونوں بے حال ہو گئے' جوتے اتارتے وقت جو ذرا سی گرفت میں ڈھیل ہوئی تو بزرگ پہلی سیڑھی پر ہی اوندھے ہو گئے' جسم ٹھنڈی سل کی مانند سنگ مرمر کی سیڑھیوں پہ بے جان سا پڑا تھا' ہونٹ کپکپا رہے تھے اور آنکھوں میں جھڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ بڑی مشکل سے سنبھال کر اندر لے جایا گیا' پانی کے چھینٹے دیئے' ہاتھ پاؤں سہلائے تب جا کر کچھ ہوش میں آئے اور کہنے لگے۔

"سلام حاضری سے پہلے مسجد لے چلو۔۔۔ فوراً!"

مسجد پہنچ کر جویریہ نے دوا کی ایک خوراک کھلائی' لٹا کر ہولے ہولے پنکھا جھلنے لگی' نادر گلاس لے کر پانی لینے چلا گیا۔ مغرب کی اذان میں ابھی کافی دیر تھی' قدرے سنبھلے تو کہنے لگے۔

"سبحان بھائی! میں مسجد کے امام صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔۔۔"

نادر واپس آیا تو سبحان چاچا نے ایک رضاکار سے امام صاحب کے متعلق دریافت کیا۔ دربار کے ساتھ نیچے دفتر کے صحن میں امام صاحب سے ملاقات کی' وجہ ملاقات تفصیل سے بتائی۔ امام صاحب کمال مہربانی سے اوپر تشریف لائے اور حجرہ کھلوا کر سب کو وہیں بلوا لیا۔ شہرت یافتہ امام صاحب نے تواضع کی' مزاج اور طبیعت کے بارے دریافت فرمایا' دست شفقت جویریہ کے سر پہ رکھا اور جویریہ کے نام پہ بہت خوش ہوئے' دعائیں دیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں اور مساجد کے بارے بات چیت کرتے رہے۔ بزرگ کی طبیعت' خوش گواری اور اطمینان کی حد تک سنبھل چکی تھی۔ چہرے پہ نقاہت کی جگہ طمانیت جھلکنے لگی۔ بزرگ نے امام صاحب سے ایک خصوصی معاملے پہ تفصیلی گفتگو کی اجازت چاہی تو امام صاحب نے مغرب کی نماز کا وقت قریب ہونے کی بنا پہ معذرت چاہی البتہ عشاء کے فوراً بعد کھانے کی دعوت کے ساتھ اس خصوصی معاملہ پہ بات چیت کا وعدہ فرمایا۔

مزار شریف اور مسجد کے پرتقدس ماحول میں وقت' سفید کبوتروں کی مانند اڑ گیا۔ بزرگ لیٹے ہوئے مزار شریف کی جانب ٹکٹکی باندھے' زیرِ لب ورد کر رہے تھے' سبحان چاچا اور جویریہ بڑے رسان سے ہولے ہولے باتیں کر رہے تھے جب نادر نے آ کر بتایا کہ امام صاحب حجرے میں طلب فرما رہے ہیں۔ لنگر کا زردہ پلاؤ' موسمی پھل' مٹھائی' یخ گلاب ملا پانی کھا پی کر فارغ ہوئے تو امام صاحب کو آمادہ گفتگو پا کر بزرگ کہنے لگے۔

"امام صاحب! میں بہت گنہگار انسان ہوں۔۔۔"

یہ کہتے ہوئے ان کی ہچکی بندھ گئی۔ وہ رونے لگے' امام صاحب نے یہ صورت دیکھ کر انہیں تسلی دی اور کہا۔

"حضرت' ہم سب گنہگار ہیں۔۔۔ وقت کی کمی کے پیش نظر میں عرض کروں گا کہ اختصار اور ہمت تسلی سے اپنا مسئلہ بیان فرمائیں۔"

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔۔۔ امام صاحب! میں بقائمی ہوش و حواس' بلا کسی دباؤ' لالچ و مصلحت اپنی ویرینہ' بچی خواہش اور اللہ کے امر و حکم سے بمعہ اپنی دختر جویریہ مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔۔۔"

ایک لمحے کے لئے جیسے سارے آسمان سے نیچے زمین پہ آگرے ہوں' پھٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے جیسے یہ بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔

"تو کیا آپ غیر مسلم ہیں۔۔۔؟" امام صاحب نے بڑے تحمل اور تجسس سے دریافت کیا۔

بزرگ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولے۔

"میں اندر سے مسلمان ہوں' پیدا سکھوں کے گھر ہوا اور جائے پیدائش چیچا وطنی ہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد فارغ التحصیل لاہور سے ہوا' دوران تعلیم لاہور میں یک بزرگ قبلہ احمد علی لاہوری مرحوم و مغفور کے قدموں میں بیٹھتا رہا اور عربی اور دینی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ میری والدہ ماجدہ جو کہ حضور داتا بخش رحمتہ اللہ علیہ کی ماننے والی تھیں' انہوں نے اسی نسبت سے میرا نام جویریہ بخش سنگھ رکھا۔ وہ ہمیشہ مجھے ہر جمعرات یہاں لے آتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ بخشے! تو داتا سرکار کا چیلا ہے' تو ان کا داس ہے' تو ان کی کرپا ہے۔ سولہ برس میں بے اولاد رہی' ایک مسلمان ہمسائی کے کہنے پہ لاہور آئی اور داتا سرکار کے قدموں میں فریاد کی' منت مانگی کہ داتا میری گود بھر دو۔ میں تجھے بھی رب کا برگزیدہ بندہ مانتی ہوں' مجھے بیٹا چاہئے' اس کا نام میں تیری نسبت سے رکھوں گی۔ اگر تیرا دین سچا ہے تو اسے بھی اپنے دین پہ رکھنا' اسے سچائی کا راستہ دکھانا۔۔۔ اور پھر جب میں پیدا ہوا تو قدرتی طور پر پیدائشی مسلمان تھا۔ میری ماں مجھے یہاں داتا سرکار کے قدموں میں لے کر آئی اور مزار کے پاس رکھ کر دور بیٹھ گئی۔ بھوک سے میں رو چلا رہا تھا اور میری ماں سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر خاموش تھی۔۔۔ کچھ دیر بعد ایک درویش آیا' لنگر کا دودھ مجھے چٹا کر میری ماں کی گود میں مجھے دے دیا۔ وہ دودھ کے چند پاکیزہ قطرے پہلی غذا تھی جو میرے پیٹ میں اترے تھے۔۔۔"

سجان چاچا کے منہ سے بے ساختہ سبحان اللہ نکلا' امام صاحب نے فرمایا۔

"آپ لاہور میں کس جگہ۔۔۔؟"

"تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک دن میں نے یہاں آکر دعا مانگی' دوسرے روز ہمیں پچھواڑے بلال گنج کے اسکول میں عارضی طور پہ ملازمت مل گئی۔ پھر دیال سنگھ کالج میں لیکچرار کی نوکری مل گئی' اسی

دوران میری شادی ہو گئی۔ چھ ماہ بعد میری والدہ بیمار پڑ گئیں۔ ایک دن انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا' میرا ہاتھ اپنے سر پہ رکھا اور کہنے لگیں کہ بخشے' غور سے سن! تو مسلمان ہے' تو داتا سرکار کا چاکر ہے۔ میری قسم کھا کہ تو مسلمان مرے گا۔ میں نے تجھے اپنی چھاتی کا دودھ اس لئے نہیں پلایا کہ میں سکھ تھی اور تجھے تو دودھ بھی داتا سرکار نے پلایا' مرنے سے پہلے بھی وہیں سے دودھ پینا' تیرا انت وہیں ہونا چاہئے۔ تیری اولاد بھی داتا کی نسبت سے ہونی چاہئے۔۔۔ پھر ماں مر گئی اور پارٹیشن کے بعد ہم دلی چلے گئے' خاندان والے' رشتہ دار' سب وہیں کاروبار کرنے لگے۔ میں بھی کپڑے کے کاروبار میں پڑ گیا' ایک بیٹا ہوا جو ایک حادثے میں مر گیا اور بہت بعد ایک بچی ہوئی۔ یہی جویریہ' میری بچی!۔۔۔ اس بچی کی پیدائش سے کچھ عرصہ بعد میری اہلیہ انتقال کر گئی اور دوبارہ میں نے شادی نہیں کی۔۔۔"

امام صاحب نے پھر ایک سوال کیا۔ "آپ نے ابھی فرمایا ہے کہ آپ کی والدہ نے آپ کو داتا سرکار کی دعا سے حاصل کیا تھا اور آپ پیدائشی مسلمان بھی تھے۔ بزرگوں' عالموں کی صحبت اختیار کی' عربی پڑھی' اسلام کا مطالعہ کیا پھر بھی آپ باقاعدہ طریقے سے دائرہ اسلام میں داخل نہ ہوئے۔۔۔ اس کی وجہ؟"

"حضور! اس کی وجہ بھی میری والدہ کا حکم تھا۔ انہوں نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ بخشے! تم میری اکلوتی اولاد ہو' ہمارے قریبی رشتہ داروں میں دشمن داری ہے اور تمہارے پیدا ہونے سے کسی کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں۔ تمہاری پیدائش کے وقت میں نے چپکے سے کلمہ شریف پڑھ لیا تھا لیکن یہ بات میں نے ہمیشہ چھپا کر رکھی ہے' تم بھی اسے چھپا کر رکھنا ورنہ تمہارے لئے بڑے خطرے ہیں۔۔۔ وقت آئے گا کہ داتا سرکار تمہیں خود ہی اپنے پاس بلائیں گے' وہیں کلمہ پڑھائیں گے۔ میں چھپ چھپا کر نماز روزہ کرتا رہا' احادیث اور سیرت کا مطالعہ شروع کیا۔ ایک مولوی صاحب سے قرآن شریف پڑھا' سورتیں زبانی یاد کیں اور پھر بچی بڑی ہوئی تو اس کی پرورش اور تربیت پہ توجہ دینی شروع کی' مسلمان دیندار گھرانوں سے تعلقات اور روابط رکھے' پھر اس وقت اور سعد گھڑی کا انتظار کرنے لگا جب داتا سرکار مجھے اپنے قدموں میں حاضر ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔ اسی غرض کے لئے حضرت امام الدین اولیاء کے مزار پہ رو رو کر دعائیں مانگتا' اجمیر شریف حاضری دیتا۔ پھر آہستہ آہستہ میں اپنا کاروبار سمیٹنے لگا۔ صحت بھی روز بروز گرتی جارہی تھی۔۔۔ اتفاق سے ایک دن حضرت نظام الدین سرکار کی درگاہ پہ ایک پاکستانی تاجر حاجی عبداللہ غنی صاحب سے ملاقات ہو گئی' وہ فیصل آباد میں کپڑے کا وسیع کاروبار کرتے ہیں۔ زیارتوں اور کاروبار کے سلسلے میں ہندوستان آتے جاتے رہتے تھے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں بھی کپڑے کے کاروبار سے منسلک ہوں تو کاروباری تعلقات بھی پیدا ہو گئے' مزید رابطے اور مراسم بڑھے تو آہستہ آہستہ ان پہ میرے تمام خیالات' حالات' خواہشیں اور مجبوریاں واضح ہو گئیں' انہوں نے مجھے بھائی بنالیا اور ہر طرح

سے تعاون کا یقین دلایا۔ رفتہ رفتہ انہی کے ذرائع اور تجارتی رابطوں سے میں نے اپنا سرمایہ پاکستان منتقل کرنا شروع کر دیا۔ اپنا مکان' دوکان' گودام سب کچھ انتہائی رازداری سے فروخت کر دیا۔ رشتہ دار یہی خیال کر رہے تھے کہ میں اپنے علاج کے لئے بیرون ملک جانا چاہتا ہوں۔ ایک انتہائی رازدار اور مخلص دوست کی شبانہ روز کوششوں سے پاکستان آنے کی تمام رکاوٹیں بھی دور ہو گئیں۔۔۔ گو ان تمام مراحل میں' قدم قدم پہ حاجی صاحب کی مساعی جمیلہ کو دخل رہا ہے کہ وہ پھر بھی میں جانتا ہوں وہ محض وسیلہ تھے' اصل تو داتا سرکار کی کرم فرمائیاں ہو رہی تھیں۔۔۔" وہ سانس درست کرنے کے لئے رکے' آنکھیں بند کرتے ہوئے کہنے لگے۔ "۔۔۔ محسوس ہو رہا ہے کہ وقت قریب ہے' والدہ صاحبہ کئی مرتبہ سامنے مسکراتی ہوئی نظر پڑی ہیں۔۔۔" پھر کہنے لگے "'پاکستان آنے کا پروگرام اتنی عجلت سے ظہور پذیر ہوا کہ میں حاجی صاحب کو اپنی آمد کی اطلاع بھی نہ دے سکا' عزیزی ہجویر یہ تمام کوائف سے واقف ہے اور میری ذاتی ڈائری میں بھی سب کچھ تحریر ہے۔"

امام صاحب نے ایک خادم کو چائے لانے کے لئے کہا اور "اللہ اکبر" کہہ کر آنکھیں بند کر لیں' کافی دیر کے بعد آنکھیں کھولیں جیسے مراقبے سے واپس پلٹے ہوں' ہجویر بخش سنگھ کو غور سے دیکھتے رہے' آہستہ سے کہنے لگے۔

"یہاں لاہور میں آپ کا کوئی پرانا واقف یا کوئی جاننے والا۔۔۔؟"

ہجویر بخش سنگھ نے بڑے کرب سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "امام صاحب! میرا تو سب کچھ اسی لاہور میں تھا' میرے کئی شاگرد بڑے بڑے عہدوں پہ فائز تھے مگر اب خدا جانے کہ کون زندہ ہے یا کون مر گیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اب بھی بہت سے کرپاں والے موجود ہوں گے۔۔۔"

"کسی ایک آدھ کا نام لیجئے یا اس کا پتہ بتائیں۔۔۔"

ہجویر بخش سنگھ' خلاؤں میں تکنے لگا جیسے کسی کی روح کو بلا رہا ہو۔ چند ثانیے غور کرنے کے بعد بولا۔

"بھاٹی دروازے کے اندر میرے ماموں گور بخش سنگھ' ڈیو والی گلی' پٹ رنگاں میں رہتے تھے' وہ ہومیو پیتھی ڈاکٹر اور بڑے مشہور آدمی تھے۔ اب بھی کچھ لوگ موجود ہوں گے جو انہیں اور مجھے پہچانتے ہوں گے۔۔۔ منشی فقیر محمد وثیقہ نویس کے بیٹے محمد طفیل میرے ساتھ دیال سنگھ کالج میں پروفیسر تھے' یقیناً زندہ ہوں گے۔۔۔ بابا غلام نبی حجام' فلم ایکٹر محمد اسماعیل صاحب' اسی داتا صاحب بازار میں حاجی نور دین باورچی' حاجی صابر بٹ شربت والا' نکا پھولوں والا' بابا تاجا ماشکی اور حاجی غلام رسول برانڈرتھ روڈ والے جو خوب دیل بناتے تھے اور ہر روز تین دیگیں خود اپنے ہاتھوں سے تقسیم کرتے تھے' سب مجھے جانتے تھے۔۔۔ اور بھی بے شمار اللہ والے تھے' کس کس کا نام گنواؤں؟"

امام صاحب بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ اتنے میں چائے آ گئی' چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولے۔

"۔۔۔ دو چار ناموں سے تو میں بھی واقف ہوں۔"

پھر اشارے سے خادم کو بلایا' کان میں کچھ کہا۔۔۔ خادم باہر نکل گیا۔۔۔ ابھی سارے چائے پی رہے تھے کہ خادم دو بوڑھوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ علیک سلیک کے بعد امام صاحب نے آنے والوں سے کہا۔

"حاجی صاحب! آپ ان بزرگ کو پہچانتے ہیں۔۔۔؟"

سفید داڑھی والے بزرگ نے عینک درست کرتے ہوئے پہچاننے کی کوشش کی اور نفی میں سر ہلا دیا' دوسرے بزرگ نے بھی تقلید کی۔ امام صاحب پھر بولے۔

"حاجی صاحب! غور سے دیکھیں۔۔۔"

حاجی صاحب نے جھنجلا کر کہا۔۔۔ "شاہ جی! پوری بات کھول کر بتائیں' کیا معاملہ ہے۔۔۔ میں ان کو نہیں جانتا۔"

ہجویر بخش سنگھ مسکرا رہا تھا۔

"امام صاحب! میں خود ہی اپنی پہچان کرواتا ہوں۔۔۔ اوئے تم مجھے نہیں جانتے' تم تو ہو ہی بھولے۔ تمہاری عادتیں ابھی تک نہیں بدلیں۔۔۔ ابھی میں ان کو ایک شعر سناتا ہوں۔

توت' شتوت' بزوری' صندل' بدام' تخم ملنگاں
اپنے یار صابر کولوں' سارے شربت منگاں

حاجی صابر بٹ صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' آگے بڑھے اور دھاڑیں مار کر لپٹ گئے۔

"اوئے بخشے' توں۔۔۔ اوئے توں زندہ ایں۔۔۔ میرا یارا' اوئے میرا بھراوا۔۔۔!"

دیر تک بچھڑے ہوئے ایک دوسرے کے سینے لگ کر ٹھنڈی راکھ سے گرم مگر بجھی ہوئی چنگاریاں کریدتے رہے' اردگرد بیٹھے ہوئے سب لوگوں کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔۔۔ کون سکھ کون مسلمان' سب ہی انسان تھے اور شاید مسلمان یا سکھ ہونے سے بہت پہلے صحیح انسان ہونا بہت ضروری ہے۔۔۔ بچھڑے ہوئے جب اپنی اپنی بھڑاس نکال چکے تو حاجی صابر بٹ صاحب نے امام صاحب کو خود ہی بتانا شروع کیا۔

"شاہ جی! یہ تو مسلمان ہے' کھانا پینا ہمارے ساتھ تھا۔ ان کی بے بے' داتا صاحب کی ملنگنی تھی' ہمیں بچوں کی طرح چاہتی تھی۔ داتا کا لنگر جھولیاں بھر بھر لے جاتی تھی' کئی کئی دن کھاتی کھلاتی رہتی تھی۔۔۔ یہ جب پارٹیشن میں ہندوستان جانے لگا تو میں نے بہت روکا کہ نہ جا' داتا کی نگری کو چھوڑ کر' یاد رکھ کہ تجھے کہیں چین نہیں ملے گا' تیری جڑ تو داتا دربار لگی ہوئی ہے' تو شاخیں اور پھل پھیلانے کہاں دفع ہو رہا ہے مگر یہ نہ مانا۔۔۔ یہ مجبور بھی تھا مگر میں نے کہہ دیا تھا کہ بخشے! تو ایک دن ضرور آئے گا اور جی

تو جہاں جی چاہے، مرے گا تو یہیں--- شاہ جی! دیکھئے، میری بات پوری ہوئی---" پھر ہجویریہ اور نادر کی جانب دیکھ کر پوچھنے لگے۔ "یہ دونوں تیرے دھی پتر ہیں؟"

ہجویر بخش سنگھ نے باری باری تینوں کا تعارف کرایا، خاص طور پر نادر اور سبحان چاچا کے ایثار و اخلاص کو بے حد سراہا۔

"اٹھ، چل میرے گھر---"

حاجی صاحب نے جیسے حکم دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے مگر امام صاحب نے انہیں بٹھایا، ساری بات بتائی اور اس کے مسلمان ہونے کی خواہش پر عملدر آمد کے متعلق مشورہ چاہا۔ حاجی صاحب نے سبحان اللہ کہہ کر خادم کو مٹھائی کے لئے بھیج دیا، پھر فرمانے لگے۔

"یہ تو ہے ہی مسلمان--- پھر بھی سبحان اللہ، یہ نیک کام فوراً ہونا چاہیے---"

تہجد سے کچھ دیر پہلے چند اور معززین اور سرکردہ مجاورین کی موجودگی میں باپ بیٹی دونوں باقاعدہ کلمہ پڑھ کر صدق و رضا و رغبت سے دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ صبح کی نماز کے بعد حاجی صاحب کی بیٹھک میں صادق حجام نے نشتر سے نشان لگا کر شرط بھی پوری کر دی۔ ہجویر بخش کے نام کا حصہ سنگھ بھی کلمے کے نشتر سے علیحدہ ہو چکا تھا۔

جمعرات تک دونوں باپ بیٹی، حاجی صابر بٹ صاحب کے گھر رہے، ہجویر بخش بھی دو چار قدم اٹھا کر چلنے کے قابل ہو چکے تھے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق، سبحان چاچا اور نادر بھی پہنچ گئے، نسلا دھلا کر ہجویر بخش اور ہجویریہ کو دربار لایا گیا، فاتحہ، دعائیں اور دستار بندی ہوئی۔ عین دستار بندی کے دوران فیصل آباد والے حاجی عبداللہ غنی، معہ بیٹوں کے پہنچ گئے جن کو بذریعہ تار اطلاع کر دی گئی تھی۔ ساری کارروائی کے بعد ایک سو ایک دیگ پلاؤ زردے کی غریبوں، محتاجوں میں تقسیم کی گئی، خیر خیرات میں دل کھول کر پیسہ خرچ کیا۔ فراغت ہوئی تو حاجی صاحب مصر ہوئے کہ آپ سب فیصل آباد چلیں۔ حاجی صابر بٹ صاحب اڑ گئے کہ یہ لوگ میرے مہمان ہیں، ہجویر بخش کی صحت بھی اجازت نہیں دیتی لہٰذا یہ لوگ ابھی لاہور میرے پاس، داتا صاحب کے قریب ہی رہیں گے۔ سبحان چاچا اور نادر کی رائے اور اصرار بھی یہی تھا کہ ابھی اس حالت اور کیفیت میں ان کا وہاں جانا مناسب نہیں۔ آخر بڑی بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ آئندہ جمعہ کے روز فیصل آباد جائیں گے یعنی آٹھ روز بعد--- اگلی جمعرات وہ لوگ یہاں لاہور پہنچ جائیں گے اور اگلے روز جمعہ کی نماز کے بعد فیصل آباد روانہ ہو جائیں گے۔

حاجی عبداللہ غنی صاحب اپنے نام کی طرح محض اللہ کے نیک بندے ہی نہیں بلکہ دل کے بھی غنی تھے، مخیٔت کاروباری ہونے کے علاوہ بڑے انسان دوست، خدا ترس، اللہ کی مخلوق کی خدمت کے جذبے سے سرشار--- جہاں کاروبار میں اللہ نے خوب برکت اور وسعت دے رکھی تھی وہیں اولاد بھی بڑی

صالح، خدمت گزار اور کاروباری سوجھ بوجھ والی تھی۔ ہر سال کسی نہ کسی ملازم کو ساتھ لے کر حج کی سعادت حاصل کرتے، پیروں فقیروں اور اللہ والوں کے مزاروں پہ حاضری دیتے۔ کئی ایک سماجی رفاہی اداروں کے سرپرست تھے۔ سادگی، قناعت، ایمانداری اور اللہ کی مخلوق کی دردمندی اور خدمت ہی ان کی وجہ شہرت اور خاص و عام میں حوالہ عزت و مقبولیت تھی۔ دونوں بیٹے محمد طفیل اور محمد شفیق جو ابھی کنوارے تھے، کاروبار میں بھی ہاتھ بٹاتے اور ساتھ ساتھ تعلیم بھی حاصل کرتے۔ دو بیٹیاں بھی تھیں، ایک قرآن حفظ کر رہی تھی اور دوسری ابھی کم سن تھی--- دلی میں جب ان کی ملاقات ہجویر بخش سے ہوئی تو وہ اس کی دینداری، اولیائے کرام سے عقیدت، داتا سرکار، لاہور اور چیچا وطنی کے حوالے سے بڑے متاثر ہوئے، مزید ملاقاتوں میں جب سارے احوال کھلے تو انہوں نے تہیہ کر لیا کہ ہر صورت اس کی مدد کریں گے، ہجویریہ کو بھی اپنی بیٹی بنا لیا۔ اپنی منصوبہ بندی کے تحت انہوں نے آہستہ آہستہ اپنے کاروباری طریقوں سے ہجویر بخش کا سرمایہ پاکستان منتقل کر لیا، وزارت خارجہ میں اپنے اثر و رسوخ سے ان دونوں کی شہریت حاصل کرنے کے لئے انتظامات بھی کر رہے تھے۔ ہجویر بخش کے سرمائے کو انہوں نے ایک اضافی کاروبار میں لگا دیا تھا جس کا حساب کتاب انہوں نے علیحدہ رکھا تھا--- اچانک بغیر کسی اطلاع کے ہجویر بخش کا پاکستان پہنچ جانا ان کے لئے باعث حیرت تو ضرور تھا مگر ناقابل یقین نہیں تھا۔ انہیں بے حد خوشی ہوئی کہ ابتداء کا ایک مرحلہ بحسن و خوبی طے ہو گیا، آگے اللہ مالک ہے۔

ہجویر بخش کے مسلمان ہونے کی خبر داتا سرکار کے گرد و نواح میں خوشبو کی مانند پھیل گئی، جانے انجانے مبارک سلامت کہنے آ رہے تھے۔ پرانے باقی ماندہ دوست، جاننے والے ڈھونڈ ڈھونڈ کر بلائے گئے، حاجی صابر بٹ صاحب کی بیٹھک دن رات ملنے ملانے والوں سے بھری رہتی۔ تحفے، پھول، ہار، دعوتوں کے تقاضے، خوش گپیاں، نعتیں، قوالیاں--- لاہوریئے تو ایسے مواقع تلاش کرتے رہتے ہیں، زندہ دلان لاہور تو دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ہجویر بخش پھول پتیوں سے لدا پھدا دولہا بنا ہوا تھا۔ داتا سرکار کے غلاموں نے اسے بادشاہ بنا کر تخت عزت و تکریم پہ بٹھایا ہوا تھا۔ ہجویریہ اندرون خانہ عورتوں اور لڑکیوں بالیوں کے جھرمٹ میں گھری بیٹھی رہتی۔ برقع نما بڑی سی سیاہ چادر اب بھی اس کے سراپے کو ڈھانپے ہوئے تھی۔ بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں کسی گہرے سمندر کی طرح شانت، پرسکون، طمانیت اور باطنی آسودگی سے لبریز--- مقامی اور ادھر ادھر سے آئی ہوئی عورتیں، لڑکیاں بالیاں اسے تحسین اور محبت و عقیدت بھری نظروں سے ٹپ ٹپ دیکھتی رہتیں۔ گھر کے اندر بھی اس اہتمام سے مستور رہنا ان کو بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ کسی کو لب کھولنے کی جرات تو نہ ہوتی لیکن جیسے وہ کوئی آسمانی دیوی ہو اور وہ سب داسیاں بنی اس کے چرنوں میں بیٹھی ہوں--- سبحان چاچا اور نادر بھی زیادہ وقت یہیں پہ گزارتے۔ جمعرات، جمعہ اور ہفتہ بھی گزر گیا لیکن گہما گہمی میں کوئی کمی نہ آئی، اگلے دن ظہر سے پہلے سبحان چاچا نے

درخواست کی کہ ہمیں بھی خدمت کا موقع دیا جائے۔ کچھ ہمارا بھی حق بنتا ہے' حاجی صاحب نے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی خواہش کو ٹالنا مناسب نہ سمجھا لیکن جمعرات سے پہلے یہاں واپس پہنچانے کا وعدہ بھی لے لیا۔

سبحان چاچا کے گھر نہ تو ویسی سہولتیں میسر تھیں اور نہ ہی وہ آسودگی اور ماحول جس کے یہ لوگ متقاضی تھے لیکن خلوص' سادگی' قناعت' شرافت' ایثار اور بے لوث جذبہ خدمت کے جو شیریں چشمے ان کے چھوٹے سے گھر سے پھوٹتے تھے اس کی قدر اور اندازہ زندگی کے دشت بے آب وگیاہ میں بھٹکنے والے کسی تشنہ لب کے بس کی بات ہی تھی۔ ہجویریہ تو جیسے کسی بہشت میں آگئی ہو' جیسے یہی اس کی منزل تھی اور یہی اس کی جائے اماں۔۔۔ آتے ہی چولہا چوکا سنبھال لیا۔ سبزی کاٹ' آٹا گوندھ' چولہا جلا' جھاڑو' ستھرائی' مانجھا' یوں لگتا تھا جیسے برسوں سے وہ اس گھر کی ضروریات اور کام کاج کو سمجھتی جانتی ہو' باوجود منع کرنے کے وہ اصرار سے ہر کام خود کرنے لگی۔ سبحان چاچا کی دیہاتی بیوی' بوڑھا باپ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی اس عجیب سی لڑکی کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے جو چھلاوے کی طرح ادھر سے ادھر' اندر باہر آجا رہی تھی۔ اکیلی جان' ڈھیر سارے کام اور اتنا سلیقہ' ایسا قرینہ' کمال کا سگھڑاپا۔۔۔ وقت پہ نماز' بھینس کا خیال' ابا کی دوا کی فکر' بادا کی عینک کی صفائی۔۔۔ رہ رہ کر رابعہ کا سراپا ابھرتا۔ بوڑھی ماں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ رابعہ یہاں مہمانوں کی طرح آتی' بیگانوں کی مانند رہتی۔ ہروقت کڑی کمان' ناک پہ دھرا غصہ۔۔۔ کاش! رابعہ بھی ایسی ہوتی' سچ ہے کہ خون جب پانی ہونے پہ آتا ہے تو کوئی سرانڈ اس کے تعفن کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔ یہ لڑکی تو اپنا خون بھی نہیں تو پھر کیوں اس کے صدقے واری ہونے کے لئے دل تڑپتا ہے؟۔۔۔ تین چار روز پلک جھپکتے ہی گزر گئے۔ خوب خیر و برکت رہی' ہجویر بخش باقاعدگی سے بھینس کا تازہ تازہ دودھ پیتے' چھاچھ میں لاہوری نمک کا ڈلا گھول کر مزے مزے سے سرکتے' بیتے دنوں کو یاد کرتے۔ تنور کی سرخ سرخ روٹیاں' سرسوں کا ساگ پیٹ بھر کر کھاتے۔ حاجی صابر بٹ صاحب بمعہ دیگر احباب' دو ایک مرتبہ آئے اور جمعرات کا وعدہ یاد دلا کر چلے جاتے۔

جمعرات کے روز صبح ہی صبح فیصل آباد والے بھی آگئے۔ ان کے ساتھ حاجی صاحب کی بیوی' بیٹیاں اور دونوں لڑکے بھی تھے۔ وہ اب انہیں فیصل آباد لے کر جانے کے ارادے سے آئے تھے' سبحان چاچا نے ان کی خوب آؤ بھگت کی' دوپہر کو کھانے سے فارغ ہو کر سارے داتا سرکار سلام کے لئے آئے۔ جمعرات کو تو سرکار کے مزار پہ میلہ سا لگا ہوتا ہے۔ لاہور تو لاہور' گردو نواح سے ہزاروں عقیدت مند جوق در جوق یہاں حاضری دیتے ہیں۔ بھیڑ' دھکم پیل' شور' کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔۔۔ اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے سرکار کے مزار کے قریب دو دو رکعت نفل ادا کئے' پھر فاتحہ خوانی کی۔ ہجویر بخش' مولوی فیروز الدین مرحوم کی قبر کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ سبحان چاچا' نادر' حاجی صابر بٹ صاحب' فیصل

آباد والے حاجی صاحب' سب اردگرد بیٹھے اپنے اپنے انداز سے درود و مناجات میں مشغول تھے۔ اچانک ہجویر بخش اٹھے اور حجرۂ اعتکاف خواجہ غریب نواز کی جانب بڑھے' جالی سے لپٹ کر دیر تک روتے رہے۔ پھر بجلی کی سی تیزی سے داتا سرکار کے روبرو کھڑے ہو گئے اور پھر دائیں جانب ٹٹول کر حاجی عبداللہ غنی صاحب کا بازو جکڑ لیا' نقاہت بھری آواز سے کہا کہ مجھے مسجد کے اندر لے چلو۔۔۔ انہیں تھام کر بڑی مشکل سے مسجد تک لایا گیا تو پانی پینے کا اشارہ کر کے وہیں فرش پہ ڈھیر ہو گئے۔ نادر نے سینہ سہلانا شروع کیا' ہجویریہ نے دوا نکال کر کھلائی' پانی کے دو گھونٹ پلائے۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں' حاجی عبداللہ غنی صاحب کا ہاتھ تھاما' ہلکا سا مسکرائے اور پھر باری باری سب کو دیکھ کر ہجویریہ کو قریب آنے کا اشارہ کیا' آہستہ سے پرس کھولنے کے لئے کہا۔ ہجویریہ نے ایک بڑا سا بند لفافہ نکال کر انہیں دے دیا' دیر تک وہ لفافے کو دیکھتے رہے۔ پھر حاجی عبداللہ غنی کو کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے کان ان کے چہرے کے قریب کر دیئے۔ وہ نحیف آواز سے بولے

"میرے بھائی! میں محسوس کر رہا ہوں کہ میرا وقت آن پہنچا ہے۔۔۔ میری والدہ نے کہا تھا کہ تمہارا انت داتا کے قدموں اور خدا کے گھر میں ہوگا اور الحمد للہ! میں اپنی منزل پہ پہنچ گیا ہوں۔۔۔ میں اپنی زندگی میں چار انسانوں سے بڑا متاثر ہوا ہوں۔ گو میں ان کی عنایات اور کرم نوازیوں کا پوری طرح حق ادا نہیں کر سکا لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کی دعائیں اور نوازشیں ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گی۔۔۔" وہ پھر گہری غنودگی میں ڈوب گئے' چہرہ تمتمانے لگا اور اک عجیب سی بھینی بھینی خوشبو پھوٹنے لگی۔ بڑے سکون سے پھر لب کشائی کی۔ "ان چار شخصیتوں میں ایک میری ماں تھی' میرے رہبر اور مربی حضرت احمد علی مرحوم و مغفور' حاجی عبداللہ غنی صاحب اور یہ فرشتہ!" ان کا اشارہ نادر کی جانب تھا۔ "اس لفافے میں میری وصیت' ضروری کاغذات اور ہدایات ہیں۔ میں آپ سب محسنوں کی موجودگی میں اللہ اور آپ سب کو گواہ ٹھہرا کر اقرار کرتا ہوں کہ میں الحمد للہ مسلمان ہوں۔ میں اپنی بیٹی ہجویریہ کو اپنے بھائی عبداللہ غنی صاحب کی کفالت میں دیتا ہوں' ہجویریہ کو اپنی شادی اور دیگر زندگی کے ذاتی معاملات میں خود فیصلہ کرنے کا حق ہوگا لیکن حاجی صاحب کا فیصلہ حتمی ہوگا۔۔۔ پس انداز کئے ہوئے اثاثے کو میں نے اپنی سمجھ کے مطابق چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک حصہ داتا سرکار کی مسجد کے لئے' دوسرا داتا سرکار کے زیر اہتمام قائم کئے ہوئے محتاجوں' بیواؤں' حاجتمندوں کے ٹرسٹ کے لئے' تیسرا حصہ ہجویریہ کی شادی اور جہیز کے لئے اور چوتھا حصہ نادر کے لئے۔۔۔ یہ اثاثہ' نقد رقم کی صورت میں حاجی صاحب کے پاس امانتاً محفوظ ہے جس کی تفصیل اس لفافے میں موجود ہے۔" پھر انہوں نے سبحان چاچا کا ہاتھ تھاما۔ "ایک چھوٹی سی رقم جو اسی لفافے میں موجود ہے' سبحان بھائی اور ان کے والد کے لئے ہے۔۔۔ میری خواہش ہے کہ وہ اپنی اور میری طرف سے حج کریں' میری بخشش کے لئے دعا کریں۔۔۔" یہ کہتے کہتے پھر وہ غنودگی کے

سمندر میں ڈوب گئے۔ چہرے کی سرخی ایک دم سفیدی میں بدل گئی جیسے نور کی برسات ہو رہی ہو۔ پھر آہستہ سے آنکھیں کھولیں' لب کپکپائے جیسے کچھ مزید کہنے کے لئے اپنی تمام توانائیاں اکٹھی کر رہے ہوں' نادر اور ہجویریہ کی جانب بمشکل تمام دیکھا۔ "اگر ان دونوں بچوں کی خوشی اور رضامندی ہو' نادر کو کوئی مجبوری نہ ہو تو میں یہ چاہوں گا کہ دونوں بچے ایک دوجے کا ساتھی بن کر زندگی بسر کریں لیکن یہ بات مشروط نہیں ہے اور نہ یہ دونوں میری اس خواہش کے پابند ہیں' اس کا فیصلہ ان دونوں کی صوابدید پہ ہوگا۔ ہر دو صورت میں حاجی صاحب کا مشورہ' رضامندی اور سرپرستی لازم ہوگی۔۔۔"

یہ کہتے کہتے حلق میں جیسے گرہ سی پڑ گئی' ہلکے سے کرب کے آثار چہرے پہ ابھرے' آنکھوں کی پتلیاں پھیل سی گئیں' حلق میں گھنگرو سا بجا اور ایک جھٹکے کے ساتھ کھلی آنکھوں سے گردن دائیں جانب ڈال دی۔۔۔ سامنے داتا سرکار کا مزار اقدس' مرجع نور و رحمت بنا جگمگا رہا تھا۔

اس مرد ایمان کے اس طرح حق واصل ہونے پہ نہ کوئی واویلا ہوا اور نہ کوئی چیخ و پکار' بس انا للہ وانا الیہ راجعون لبوں پہ آیا۔ سب نے کمال ضبط و برداشت کا مظاہرہ کیا مگر آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں' برقعے میں ملبوس ہجویریہ پہ کیا بیتی؟ کوئی نہ جان سکا۔ تسلیم و رضا کی پتلی کے منہ سے تو ایک سسکی تک نہ نکلی۔ دیگر خواتین اور لڑکیاں زنانہ حصے میں تھیں' ان کو کیا خبر کہ ادھر کیا بیت چکی ہے؟ ادھر ادھر سے لوگ اور رضا کار اکٹھے ہو گئے' امام صاحب کو بھی خبر ہو گئی۔ ہجویر بخش کی جسد خاکی کو اٹھا کر نیچے دفتر کے پاس صحن میں رکھ دیا گیا۔۔۔ رضا کار اور یہ لوگ انتظامات میں جٹ گئے' دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں لوگ مسجد میں پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہو گئے۔ مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے ظہر کی نماز کے بعد جنازے کا اعلان ہو چکا تھا۔ غسل' کفن دفن کا انتظام انتظامیہ نے اپنے ذمہ لے لیا لیکن دفن کے معاملے میں انتظامیہ نے جگہ کی قلت کی بناء پہ معذرت کر لی۔ حاجی صابر بٹ اور دوسرے لوگوں نے بہت کوشش کی کہ اس داتا کے دیوانے کو داتا سرکار کے قدموں میں ہی کہیں جگہ مل جائے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ حاجی صاحب نے ہجویریہ سے دفن کے متعلق کسی وصیت یا خواہش کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بھی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے' ان کے دیئے ہوئے لفافے کے مندرجات پڑھنے کا مشورہ دیا کہ شاید اس میں کوئی اشارہ ملے۔ اس مشورے کو مناسب سمجھتے ہوئے حاجی عبداللہ غنی صاحب نے امام صاحب اور دیگر ذمہ دار لوگوں کی موجودگی میں لفافہ کھولنے کا ارادہ کیا۔ امام صاحب نے احتیاطاً مشورہ دیا کہ بہتر ہے' کسی وکیل کے ذریعے یہ سارا عمل سرانجام ہو۔ حاجی صابر بٹ صاحب نے اس مشورے پہ صاد کرتے ہوئے فوری طور پر ایک وکیل کا بندوبست کیا۔ وکیل صاحب نے معززین کی موجودگی میں لفافہ چاک کیا' کچھ دیر وصیت کو پڑھتے رہے اور پھر بولے کہ "اس وصیت میں دفن کے متعلق کوئی ہدایت نہیں' نہ ہی کسی خواہش کا اظہار ہے۔ قانونی نقطہ نظر سے تمام وصیت کا سرعام اظہار مناسب نہیں جب تک حامل وصیت اور ان کی بیٹی اجازت

نہ دے۔ آخر آپس کی مشاورت سے طے پایا کہ ہجویر بخش کو بیدی کی کے قبرستان میں دفن کر دیا جائے۔ ظہر کی نماز کے بعد جنازہ پڑھا گیا۔ ہزاروں انسانوں نے اس کے لئے دعا مغفرت کی' مٹی سے مٹی مل گئی۔

ہجویریہ کی خواہش کے مطابق پردے کی دری سبحان چاچا کے چھوٹے سے گھر میں بچھا دی گئی۔ تیسرے روز حاجی عبداللہ غنی کے بچے تو واپس فیصل آباد چلے گئے' وہ خود اور ان کی بیوی یہیں رک گئے۔

ان چند دنوں میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات' ہجویر بخش کی وفات' وصیت' خواہش' یہ سب کچھ اتنے اچانک اور ڈرامائی تھے کہ سوچ سوچ کر اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ ادھر سبحان چاچا کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ یہ دونوں اگر کوئی عام سے چھچھورے' گھٹیا' گندے ذہن کے لالچی ہوتے تو یقیناً اس لڑکی کو جس کے ساتھ بونس میں ایک خوبصورت مالدار لڑکی بھی وصول ہو رہی ہو' اپنی خوش نصیبی تصور کرتے مگر محنت' نیت' خون پسینہ بہا کر حق حلال کی کمائی کھانے والوں کے لئے یہ سب کچھ سوائے شرمندگی اور ذلت کے اور کچھ نہ تھا۔ موقع اور حالات ایسے تھے کہ وہاں کھل کر بات نہیں ہو سکتی تھی اور نہ ہی ان کا آپس میں ابھی تک وہ موضوع پہ کوئی تبادلہ خیالات ہو سکا۔۔۔ نادر کے دماغ پہ جیسے مرنے والے کے الفاظ منجمد ہو کر رہ گئے تھے' بار بار بازگشت بن کر ہتھوڑے کی مانند برستے۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایک اجنبی شخص جس کا سامان اٹھانے' بیمار اور بزرگ سمجھ کر کچھ اضافی خدمت کرنے اور داتا دربار لے کر جانے کے علاوہ جس کی وہ کوئی اور غیر معمولی خدمت کر سکا ہو' وہ اس کے لئے یہ سب کچھ کر سکتا ہے کہ محبت' عزت' دولت اور اپنی بیٹی تک۔۔۔ کبھی کبھی اسے یہ سب کچھ اک خواب کی طرح دکھائی دیتا' اسی ذہنی اتھل پتھل میں کہیں سے ہجویریہ بھی اپنی پراسرار ذات کی حشر سامانیوں کے ساتھ چھلاوے کی طرح ابھر کر سامنے آجاتی جس کو نظر بھر کے دیکھنے کی آج تک جرات نہ ہو سکی اور چہرہ تو دور کنار' ہاتھ پاؤں تک نہ دیکھے' ضرورت کے علاوہ ایک لفظ تک زائد نہ سنا۔ باپ کی موت پہ بھی دو ہتھڑ' نہ واویلا' چیخ و پکار' نہ آہ و زاری۔۔۔ وہ انسان ہے یا پتھر' عورت ہے یا دیوی؟۔۔۔ جیسے جیسے وہ سوچتا' اپنے آپ میں کہیں گہرا اترتا جاتا۔

منہ اندھیرے ہجویریہ منع کرنے کے باوجود گھر کے کاج کاج میں جٹ جاتی' ناشتے سے پہلے فارغ ہو چکی ہوتی۔ پھر چاچی اور فیصل آباد والی تائی کو ساتھ لے کر قبرستان چلی جاتی' پڑھتی پڑھاتی' قبر پہ تازہ پھول ڈالتی' چھڑکاؤ کرتی اور گھنٹہ دو گھنٹے میں واپس آجاتی۔ پھر وہی گھر کے کام کاج' مرد باہر میدان میں بیٹھے رہتے۔ اگلی جمعرات پہ فاتحہ ختم وغیرہ سے فارغ ہوئے تو دسویں کا ختم آگیا۔ اس کے بعد بڑے اصرار سے حاجی عبداللہ غنی صاحب کو فیصل آباد بھیج دیا اور تائی صاحبہ یہیں رہیں' آنے جانے والوں کا ریلا بھی تھم گیا۔

●●

وقت اپنی ڈگر پہ گزرتا رہا۔

سبحان چاچا اور نادر نے باری باری اسٹیشن پہ جانا شروع کر دیا' چالیس روز کہنے کو تو گزر گئے لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے چالیس برس گزر گئے ہوں' ہجویریہ جیسے اسی گھر میں پیدا ہوئی ہو۔ آس پاس پڑوس والے اس کے ایسے گرویدہ ہوئے جیسے وہ ان کا اٹوٹ انگ ہو' ان کے جسم اور زندگی کا ایک حصہ---

چالیسوں سے دو روز پہلے فیصل آباد سے حاجی صاحب بچوں سمیت آگئے اور آتے ہی انہوں نے چالیسویں کے انتظامات کرنے شروع کر دیئے اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ بیٹا! جمعہ کی نماز کے فوراً بعد ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ ضروری تیاری کر لینا' تم بھی ہمارے ساتھ جا رہی ہو۔

فیصل آباد آئے ہوئے ہجویریہ کو ایک ہفتہ ہو چکا تھا' وعدہ کے مطابق سبحان چاچا' نادر بھی شام سے کچھ پہلے پہنچ چکے تھے۔ نماز اور کھا پی کر فارغ ہوئے تو حاجی صاحب نے بات شروع کی۔

"بھائی سبحان اور بیٹے نادر! آپ دونوں نے مرحوم ہجویر بخش' ان کی بیٹی کی جس طرح خدمت کی' ہر قدم پر جس طرح ساتھ دیا' اس کی جزا تو آپ کو وہ رب العزت ہی دے گا لیکن میں ذاتی طور پر آپ کا احسان مند ہوں--- چاہیے تو یہ تھا کہ جو کام آپ نے کئے' وہ میں کرتا لیکن یہ سعادت آپ کے نصیب میں تھی' اللہ جسے دے--- اب جبکہ سب کچھ ہو چکا' اب میرا فرض ہے کہ میں مرحوم کی وصیت کے مطابق عمل کروں تاکہ میں بھی سرخرو ہو سکوں اور مرحوم کی روح کو بھی سکون مل سکے۔" انہوں نے وصیت کھولی اور تفصیل سے ایک ایک شق کی وضاحت شروع کی۔ "مرحوم کا نقد سرمائے کی صورت میں بیس لاکھ روپیہ میرے پاس امانتاً موجود ہے' قریب اتنا ہی سرمایہ ان کی جانب سے کاروبار میں گردش کر رہا ہے جس کا مکمل حساب کتاب الگ ہے۔ اب جو نقد سرمایہ موجود ہے' صرف اسی کو چار برابر حصوں میں تقسیم کرنے کی ہدایت ہے۔ کاروبار میں شامل سرمایہ وصیت کے مطابق کاروبار میں ہی گردش کرتا رہے گا' جس کا منافع ہجویریہ لے سکتی ہے' اصل رقم ہجویریہ کی اولاد کی تعلیم و تربیت اور ضروری مصارف کے لئے ہوگی--- میں نے وکیل صاحب سے مشورہ کر کے تقسیم کے سارے کاغذات مکمل کروا لئے ہیں۔ وصیت کے مطابق ہجویریہ میری کفالت و تحویل میں رہے گی--- باقی رہی ہجویریہ کی شادی کی بات تو اس ضمن میں ہجویریہ کا فیصلہ ہی آخری ہوگا۔ جیسے کہ ہجویر بخش کی خواہش تھی' مجھے یقین ہے کہ ہجویریہ بھی اپنے مرحوم والد کی خواہش کا احترام کرے گی اور میری ذاتی خواہش بھی یہی ہے۔ چونکہ آپ دونوں کی زندگی کا معاملہ ہے اس لئے آپ دونوں ہی یہ فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں' اس سلسلے میں سوچ بچار کے لئے آپ دونوں کے پاس ابھی کچھ وقت ہے مگر اتنا بھی زیادہ نہیں' ہجویر بخش کے انتقال کے بعد ان کی شہریت حاصل کرنے کے لئے اب صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ ہجویریہ کی شادی جلد ہو جائے اور پھر نئے سرے سے کارروائی کی جائے۔" پھر حاجی صاحب' وصیت بند کرتے ہوئے بولے۔ "آج جمعہ ہے' کل

صبح وکیل صاحب آجائیں گے۔ کاغذات سب مکمل ہیں' نادر نے صرف رقم وصول کر کے دستخط کرنے ہیں---" پھر سبحان چاچا سے مخاطب ہوئے۔ "آپ اپنی اور بابا جی کی تین تین تصویریں مجھے دے دیں' آپ کے لئے اس حج پہ انتظام ہو جائے گا' بیس ہزار روپے حج کی مد میں نقد موجود ہیں' دس لاکھ داتا سرکار' اگلے ہفتے آپ کی موجودگی میں پیش کر دیئے جائیں---"

نادر کی آنکھیں بھیگی بھیگی ہوئی تھیں' وہ دونوں گم صم کسی حنوط شدہ لاش کی مانند خاموشی سے سن رہے تھے۔ اس دوران ایک لفظ بھی تو ان کے منہ سے نہیں نکلا تھا۔ انہیں اس طرح خاموش اور حیران دیکھ کر وہ بولے۔

"بھائی! آپ لوگ بھی کچھ بولیں---"

سبحان چاچا اور نادر نے ایک دوسرے کی طرف استعجابیہ نظروں سے دیکھا' پھر بھی جیسے ان کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا یا کچھ سننا ہی نہیں چاہتے تھے اور یا پھر سوچ رہے تھے کہ کہاں سے شروع کریں گے--- حاجی صاحب پھر بولے۔

"خیریت---؟"

سبحان چاچا جھکی ہوئی گردن اٹھا کر' مرے مرے الفاظ ادا کرنے لگے۔

"حاجی صاحب! ہم بڑے غریب اور ٹوٹے پھوٹے لوگ ہیں۔ ہمارے پاس عاجزی' خدمت' محنت اور ایمان کے سوا اور کچھ بھی نہیں--- ہم دونوں بوجھ' ذمہ داری اور دکھ اٹھانے والے قلی ہیں۔ پانچ دس روپے حق حلال کے ہماری اوقات ہیں۔" وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "ہمیں اپنی اوقات اور اپنے حال میں مست رہنے دیں۔ ہم جھولی بھر دعاؤں کے طالب ہیں' جھولی بھر نوٹوں کے نہیں--- ہجویر بخش اور آپ نے ہمیں کس بکھیڑے میں ڈال دیا ہے؟"

وہ اس کے کندھے پہ خلوص بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ "میرے بھائی! خدا تمہاری خودداری' ایمان اور حق حلال کما کر کھانے کے جذبے کو سلامت رکھے۔ آج پہلی مرتبہ آپ لوگوں نے میرے گھر روکھے سوکھے دو لقمے کھائے جبکہ کئی دن ہم نے آپ کے دولت خانے پہ روٹیاں توڑیں' میں نے تو اپنے پلے سے آپ کو کچھ نہیں دیا اور نہ ہی اپنی جانب سے کچھ کہا' یہ تو مرنے والے کی وصیت کے مطابق ہے' ظاہر ہے آپ لوگوں نے ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی ایسی نیکی یا حسن سلوک روا رکھا جس سے متاثر ہو کر انہوں نے یہ سب کچھ کیا--- میری طرف دیکھو' میری ان سے ملاقات دلی میں ہوئی' نہ جان نہ پہچان' بس حضرت نظام الدین سرکار کے مزار مبارک پہ مجھے بھائی بنایا اور لاکھوں کا سرمایہ میرے حوالے کر دیا--- بھائی! ہجویر بخش تو داتا گنج بخش ہجویری کا غلام تھا' وہ اپنے داتا کی روایات سے کیسے روگردانی کر سکتا تھا۔ اسے بھی جو کچھ ملتا تھا' آگے بخش دیتا تھا--- کاش! یہ سعادت ہمیں بھی نصیب ہوتی۔ جس

طرح کی زندگی' جذبہ' ایمان' یقین' اولاد اور موت انہیں نصیب ہوئی ہے' کسے نصیب ہوتی ہے؟۔۔۔ اب آپ پہ منحصر ہے کہ آپ ان کی وصیت پہ عمل پیرا ہوتے ہیں یا نہیں۔۔۔؟"

نادر بولا۔ "حاجی صاحب! ہم کل صبح وکیل صاحب کی موجودگی میں عرض کریں گے۔"

یہ رات ان پہ بہت بھاری پڑی' ساری رات کروٹیں بدل بدل کر ان کے جسم دکھنے لگے' دونوں کا موقف صاف اور واضح تھا اور خاموش رہنے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ سوچوں' خیالوں کے سمندر میں ابھرتے ڈوبتے وہ صبح کے کنارے آن لگے۔ آنکھوں کے سرخ ڈورے اور شب بیداری کے آزار سے ستے ہوئے چہرے حاجی صاحب کی جہاندیدہ نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکے' ناشتے کے دوران پوچھنے لگے۔

"۔۔۔ معلوم ہوتا ہے رات آپ ٹھیک سے سو نہیں سکے۔ آپ کے گھر تو ہمیں خوب نیند آتی تھی' دل چاہتا تھا کہ سوتے ہی رہیں۔۔۔"

سبحان چاچا نے معذرت سے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "۔۔۔ آپ درست فرماتے ہیں۔ ہمارے غریب خانے پہ نہ چور کا کھٹکا' نہ مال و زر کا دھڑکا' غریبوں کے ہاں بس اک نیند ہی تو ہوتی ہے' پاؤں پسارے اپنی حسرتوں کو بہلا پھسلا کر دنیا و مافیہا سے بے خبر جہاں جگہ ملے سو رہتے ہیں۔۔۔ ہم اتنے تکلفات میں سونے کے عادی نہیں کہ مچھر نہ کھٹمل' حبس نہ گرمی' چوکیدار نہ کتوں کی آوازیں' گندے نالے اور نہ گوبر کی مہکاریں۔۔۔"

حاجی صاحب ہنسنے لگے۔ "واہ بھئی' واہ۔۔۔ سبحان بھائی! کیا نقشہ کھینچا ہے۔۔۔ لو' یہ بھی کھاؤ۔"

وہ پراٹھا بڑھاتے ہوئے بولے۔ اسی دوران وکیل صاحب اور حاجی صاحب کے صاحبزادے بھی آگئے' حاجی صاحب نے بااصرار انہیں بھی ناشتے میں شامل کر لیا۔ ناشتے چائے سے فارغ ہو کر وکیل نے اپنی پوٹلی کھول لی اور مختلف کاغذات میز پر پھیلا دیئے۔ حاجی صاحب کی اجازت سے جویریہ کو بھی طلب کر لیا' جویریہ کے ساتھ حاجی صاحب کی اہلیہ بھی آگئیں۔ وکیل صاحب نے پانچ لاکھ روپے کے نوٹوں کی گڈیاں میز پہ رکھیں اور نادر کی جانب ایک تحریر شدہ اسٹام بڑھاتے ہوئے بولے۔

"اسے آپ پڑھ لیں اور اس جگہ دستخط کر دیں۔۔۔ جویریہ بخش مرحوم کی وصیت کے مطابق مبلغ پانچ لاکھ روپے' ان گواہان کی موجودگی میں وصول کریں۔۔۔"

نادر کچھ دیر نوٹوں کی گڈیوں کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے سبحان چاچا' حاجی صاحب اور جویریہ پہ سرسری سی نظر ڈال کر اسٹام پہ دستخط کر دیئے۔ وکیل صاحب نے گواہوں سے دستخط کروا کر نوٹ اس کی جانب بڑھا دیئے۔

"گن لیجئے۔۔۔"

نادر نے خاموشی سے روپے اپنے آگے سرکا لئے۔ اسی طرح جویریہ نے بھی اپنا حصہ وصول کیا۔ داتا سرکار' مسجد اور ٹرسٹ کے لئے رقم حاجی صاحب کی تحویل میں دے دی گئی' سبحان چاچا اور ان کے والد صاحب کے لئے حج بدل کے مختص رقم بھی حاجی صاحب کے حوالے کر دی گئی۔ جب ساری کارروائی مکمل ہو گئی تو نادر نے نہایت ادب سے وکیل صاحب سے پوچھا۔

"وکیل صاحب! کیا یہ ساری رقم اب میری ہے۔۔۔؟" اس نے اپنے سامنے پڑی ہوئی گڈیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بھئی' اب تم قانونی طور پر وصیت کے مطابق اس کے مالک ہو۔" وکیل صاحب نے وضاحت کی۔

"تسلی کے لئے ایک سوال اور۔۔۔ میں جس طرح مناسب سمجھوں اسے استعمال کر سکتا ہوں؟"

"بے شک۔۔۔ آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" وکیل صاحب نے جھنجلاتے ہوئے جواب دیا۔

نادر نے نوٹوں کی گڈیوں کو جویریہ کی جانب دھکیلتے ہوئے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں باہوش و حواس' بارغبت و رضا یہ ساری رقم جویریہ کی نذر کرتا ہوں۔۔۔"

سارے اس کا منہ تکنے لگے۔ وکیل صاحب بھی جیسے بوکھلا گئے۔۔۔ پانچ لاکھ کی رقم۔۔۔ یہ غریب تھی!۔۔۔ وہ تھوک نگلتے ہوئے بڑی مشکل سے ہکلائے۔

"آپ کو اپنی اس رقم کے متعلق پورے پورے اختیار حاصل ہیں اور میرا مشورہ ہے کہ اتنی عجلت سے کام نہ لیں' سوچ سمجھ لیں۔۔۔ وقتی جذبات میں کوئی فیصلہ کرنے کی بجائے دو چار روز اور غور کر لیں۔۔۔"

حاجی صاحب نے لقمہ دیا۔ "نادر بیٹے! وکیل صاحب درست کہتے ہیں۔۔۔ جویریہ بیٹی کے پاس بہت کچھ ہے' ہم سب کی یہی کوشش ہونی چاہیے کہ جویریہ بخش مرحوم کی خواہش اور وصیت پوری ہو۔ مرنے والے کی وصیت میں اگر کوئی اخلاقی' قانونی یا شرعی سقم نہیں تو اسے پورا کرنا بڑے ثواب کا کام ہے' مرنے والے کی روح کو بڑی تسکین ہوتی ہے۔"

"حاجی صاحب! میں بھی یہ بات جانتا ہوں اسی لئے میں نے وصیت کے مطابق اپنی رقم وصول کر لی' اسٹام پہ وصولی کے دستخط کر بھی دیئے۔ اب یہ رقم میری ہے۔ میں اپنی رقم اپنی مرضی سے' اپنی صد احترام پیاری بہن جویریہ کو بھائی بن کر تحفہ پیش کرتا ہوں۔۔۔ میرے خیال میں اب کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔۔۔" جیسے سب پہ کسی نے جادو کر کے پتھر کا بنا دیا ہو۔ گنگ' گم صم۔۔۔ نادر نے حاجی صاحب کے پاؤں تھام لئے۔ "۔۔۔ کہتے ہیں کہ یار' بازو دے تو بازو کاٹنا نہیں چاہیے۔۔۔ ہم داتا کے قلی ہیں' مہمانوں اور بہنوں کا بوجھ اٹھانے والے' ان کا مال اور پیسہ کھانے والے نہیں ہیں۔۔۔ بڑے لوگوں

کا کیا ہے' وہ تو لکھ لٹ ہوتے ہیں لیکن غریب اور چھوٹے لوگوں کو اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہیے۔ پھر اس یتیم بہن کا مال' توبہ' توبہ!--- حاجی صاحب! ہم اپنی زندگی میں بڑے خوش ہیں۔ ہمیں ہزاروں لاکھوں کی طلب نہیں' ہماری ضرورتوں اور خواہشوں کا دامن بڑا محدود ہے--- میں اسی موقع پہ یہ بات بھی صاف کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ ہجویریہ میرے لئے ایک واجب الاحترام بہن کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ حیثیت انشاء اللہ ہمیشہ قائم رہے گی۔ ہجویر بخش مرحوم نے اپنی جس خواہش کا اظہار کیا تھا' وہ دراصل بڑے کھلے ذہن و ظرف کے مالک تھے لیکن ہم غریبوں کی مجبوریوں اور دلیلوں دیچاروں سے شائد واقف نہیں تھے۔ ہم اپنے کچے صحنوں' کچی دیواروں کے اندر ہی اپنی حیثیت کے مطابق زندگی گزارنے کے عادی ہوتے ہیں' اونچی اور مضبوط دیواروں کے اس پار جھانکنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہمارے رشتے ناتے اپنے گاؤں' گھرانوں میں اپنی برابری کے لوگوں میں طے ہوتے ہیں--- پھر ہم قلی ہیں' سامان اسباب اٹھا کر مالکوں کے گھر پہنچاتے ہیں' مالک بن کر اپنے گھر نہیں لاتے۔ یہ ہمارے پیشے کا اصول بھی ہے اور عین انسانیت بھی---" نادر کچھ دیر رکا۔ پھر حاجی صاحب کی جانب دیکھ کر التجا بھرے لہجے سے کہنے لگا۔ "آپ میرے بزرگ اور والد کی جگہ ہیں' آپ کے سامنے مجھے اس طرح کی گفتگو کرنا نہیں چاہیے تھی لیکن حالات ایسا رخ اختیار کرتے جا رہے تھے کہ مجبوراً مجھے اپنی پوزیشن اور خیالات کی وضاحت کرنا پڑی۔ اس دوران اگر چھوٹا منہ اور بڑی بات ہوگئی ہو تو میں سب سے معافی چاہتا ہوں---"

کہنے سننے کے لئے اب کیا رہ گیا تھا جو کوئی جواب دیتا؟--- نادر نے اپنے پاکیزہ خیالات' بے لوث' بے طلب' خدمت اور انسان دوستی کی جن ارفع و اعلیٰ قدروں کا عملی اور زبانی اظہار کیا تھا اس سے اس کا قد اور بلند ہو گیا تھا' سب ہی اسے تحسین اور ستائش بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ سبحان چاچا کی آنکھوں میں سچے موتی دمک رہے تھے' ہجویریہ بدستور خاموش تھی' یا تو وہ بے حس تھی یا پھر گہرا سمندر--- جس پہ کوئی جل تھل اثر انداز نہیں ہوتی' جو اپنی ذات کی گہرائی اور ظرف میں بڑے سے بڑے طوفانوں' موسموں اور ظاہری کیفیتوں کو بڑی پراسرار خاموشی سے جذب کر لیتا ہے۔

●●

انہیں فیصل آباد سے واپس آئے ہوئے کئی روز گزر چکے تھے' نادر آتے ہی اپنے کام میں جت گیا اور فارغ اوقات میں اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے پڑھائی بھی شروع کر دی تھی' وقتی طور پر سب کچھ بھول بھلا کر اپنا ذہن صاف کر لیا تھا۔ گزرنے والے واقعات اور موجودہ حالات نے اسے خاصی جذباتی الجھنوں میں الجھا دیا تھا۔ اس قسم کے معاملات سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا لیکن کہتے ہیں کہ گدڑی جوں جوں بھیگے توں توں بھاری ہووے--- اسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کئی نادیدہ جزیرے اس کے باطن سے

ابھر کر سامنے آ گئے ہیں' وہ اندر سے اپنے آپ کو بھیگا بھیگا سا محسوس کرنے لگا تھا اور کبھی کبھی سوڈے کی بوتل کی مانند ابل پڑتا--- دوسری جانب سبحان چاچا کی کیفیت بھی کچھ مختلف نہ تھی لیکن وہ اوپر سے ظاہر نہ ہونے دیتا تھا' شاید اس کی عمر' تجربات اور ٹھنڈے خون کا تقاضا تھا یا کوئی مصلحت--- اس تھوڑے سے عرصے میں وہ نادر کو خوب جان چکا تھا اور اس کی خودداری' ہٹ دھرمی سے خوب واقف ہو گیا تھا مگر اس کا یہ نیا روپ دیکھ کر اس سے خوف کھانے لگا تھا اور سوچتا تھا کہ یہ انسان ہے یا فرشتہ؟ جھولی بھر دولت ٹھکرا دی۔ ہجویریہ ایسی پڑھی لکھی سلجھی ہوئی نیک دولت مند لڑکی کو بیوی کی بجائے بہن بنا لیا--- سبحان چاچا اپنوں کا ڈسا ہوا' اپنے خون کی خرابی کا شاکی تھا مگر اسے خیال تھا کہ یہ دنیا ابھی اچھے اور ایثار پیشہ لوگوں سے خالی نہیں ہوئی۔ اس دنیا میں ابھی رہا اور جیا جا سکتا ہے--- حاجی عبداللہ غنی صاحب کا نورانی چہرہ سامنے آتا تو منہ سے سبحان اللہ نکل جاتا' اس قحط الرجال دور میں ایسے انسان؟ کس چیز کی کمی ہے انہیں کہ عزت' شہرت' دولت' سعادت مند اولاد ساتھ ہے لیکن ہر پل ہر لمحہ' انسانیت کی خدمت کے لئے برسرپیکار' تن من دھن سے ہر وقت خدمت کے لئے تیار--- ایسے میں ہی کچھ اپنے چہرے بھی سامنے آجاتے' دوبئی والے سگے بھائی جو نئی نئی دولت کی فراوانی سے اپنی اوقات اور خون کی پہچان کھو بیٹھے تھے' اپنی اکلوتی بیٹی رابعہ جس کا یہ پاکیزہ نام اس امید پہ تجویز کیا تھا کہ بڑی ہو کر نیک' سگھڑ اور دیندار بنے گی لیکن وہ بالکل الٹ نکلی' رابعہ کی بجائے روبی کہلوانا زیادہ پسند کرتی۔ تراشیدہ بال' بڑھے ہوئے پالش شدہ ناخن' فیشن ایبل لباس' اوچھی' بداخلاق اور مغرور--- کہیں دودھیا سی دھند سے اپنے بیٹے حافظ محمد یوسف کا چہرہ چاند کی مانند ابھرتا۔ سیدھا سادا معمولی پڑھا لکھا دیہاتی' نظر کی خفیف سی کمزوری کے باعث معذور سا' شرافت' دینداری اور حافظ قرآن ہونے کی وجہ سے بڑا مقبول' گاؤں کے مدرسے اور مسجد میں خوش' مطمئن اور پھر--- پھر جیسے اک مہر منیر اپنی تابانیوں کے ساتھ ابھرتا--- نادر--- کاش! نادر جیسا انسان میرا بیٹا ہوتا اور اندر--- کہیں دور سے آواز آتی--- سبحان چاچا! کیا میں تمہارا بیٹا نہیں ہوں؟--- میں تو تمہارا بیٹا ہوں!

پھر انہی دنوں اسے خبر ملی کہ بھائی باہر سے آئے ہوئے ہیں' ہو کر تو وہ لاہور سے ہی گئے تھے لیکن وہ ہوائی اڈے پر اترے ہوں گے اور سبحان چاچا اسٹیشن پر قلی تھا' اسے کون اطلاع دیتا؟--- سبحان چاچا نے ان کی اس ادا کو بھی دل سے نہ لگایا اور وہی بات دل سے لگائے رکھی جو بچپن سے طے تھی دونے والی--- رابعہ کا حال وہ دیکھ چکا تھا اور کچھ یہ یقین بھی اس کے دل میں بیٹھنے لگا تھا کہ وہاں رہ کر کہیں وہ بالکل ہی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ بس یہی کچھ سوچ کر اس نے گاؤں جانے کی ٹھانی' بیوی سے بات کی تو وہ بھی تیار ہو گئی اور یوں وہ دونوں وہاں جا پہنچے لیکن وہاں کا تو عالم ہی اور تھا' حافظ محمد یوسف کی دین داری کا وہی عالم تھا اور رابعہ کے وہی لچھن--- ان کا استقبال وہاں کس نے کرنا تھا' خود ہی گھس کے بیٹھ رہے

اور اگلے ہی دن موقع پا کر بات بڑھا دی۔ پچھلی باتیں یاد دلائیں اور آئندہ کے لئے ساتھ مانگا۔ بھائی نے پوری بات سننے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

"دیکھ بھائی! میں تو کچھ بھی نہیں کہتا لیکن تو جانتا ہے کہ میرے بچے اب بگڑ گئے ہیں' ان کے دماغ اونچے ہو گئے ہیں۔۔۔ مجھ میں تو ان سے یہ بات کرنے کی ہمت ہی نہیں' اگر تجھ میں حوصلہ ہے تو خود ان سے پوچھ لے لیکن یہ یاد رکھنا کہ تیری حیثیت کیا ہے۔۔۔ بیٹا تیرا مسجد میں نمازیں پڑھانے والا اور تو خود اسٹیشن پر قلی۔۔۔ پھر تو کیسے ان سے بات کر پائے گا؟"

سبحان چاچا اس کا منہ تکتے گیا' اسے خدشہ تو تھا لیکن پھر خون کا ابال اسے منا لیتا تھا لیکن اب جو کچھ بھائی نے کہا تھا وہ لفظا تو نہیں' طمانچے تھے۔ پھر اس نے بہت کچھ کہا' بڑوں کی بات کی اہمیت کو احساس دلایا لیکن باتوں کے ساتھ مطالبے بھی بڑھتے گئے۔ وہ اپنے عہد سے راہ فرار کرتے ہوئے کسی بل میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سبحان چاچا کے کانوں میں ابھی تک۔ "مسجد میں نمازیں پڑھانے والا اور اسٹیشن پہ قلی۔" کے الفاظ ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ اس نے ان الفاظ میں چھپے ہوئے طنز اور تحقیر بھرے لہجے کی چوٹ اور کاٹ کو بھی انتہائی واضح طور پر محسوس کیا تھا' ظاہر تھا کہ اب جب ان کی صاحبزادی اسکول میں پڑھ رہی ہو' فیشن ایبل اور میک اپ کی عادی ہو اور وی سی آر' ٹیلی ویژن دیکھتی ہو' گھر میں قالین پڑے ہوئے ہوں تو وہ محض ایک حافظ نیم نابینا' معمولی پڑھے لکھے' نمازی' اللہ ہو کرنے والے سے زندگی بھر کا رشتہ کیسے جوڑ سکتی ہے؟۔۔۔ واقعی' وقت کے ساتھ انسانی سوچ' رشتوں ناتوں کا پاس' اپنوں کی اپنائیت' پرم پرا کی اہمیت' اخلاق' انسانی قدروں کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔۔۔ وہ اندر سے جیسے بجھ سا گیا' ڈھے سا گیا۔۔۔ کاش! اس قیامت کی گھڑی نادر ساتھ ہوتا۔ وہ دیکھتا' سنتا' اسے سارا دن اور دیکھتا کہ اپنوں نے اسے کہاں پہ لا کر گندہ اور ننگا کیا ہے' خون کیسا سفید ہوا' دولت نے کیسا کھیل کھیلا؟۔۔۔ بھائی کی ان باتوں کا کیا جواب دیتا' تھوڑی سی اونچ نیچ' خدا رسول' اپنا خونی تعلق رشتہ بتانے سمجھانے کی مقدور بھر کوشش کی مگر جن کے دلوں پہ حرص و طمع' غرور جہل اور ناعاقبت اندیشی کے بھاری قفل پڑے ہوئے ہوں انہیں کسی آہ و فریاد یا نصیحت و نسیحت سے راہ راست پہ نہیں لایا جا سکتا اور یہی ہوا۔ انہوں نے اپنے فیصلے کے خلاف کوئی ایک بات بھی سننے سے انکار کر دیا بلکہ الٹا یہ بھی جتلا دیا کہ رابعہ کا رشتہ قبول کر کے وہ بہت بڑا احسان کر رہے ہیں' بقول ان کے محمد سلیم اور رخسانہ کے لئے صاحب حیثیت' عزت دار پڑھے لکھے اور اچھے اچھے مالدار گھرانوں سے پیغام آ رہے ہیں۔۔۔ بھائیوں کی اس سرد مہری اور سنگدلی سے دل برداشتہ ہو کر سبحان کوئی جواب دیئے بغیر' حافظ محمد یوسف اور بیوی کو لے کر لاہور واپس آ گیا۔ بھائیوں نے ابھی مہینہ ڈیڑھ مہینہ یہیں رہنا تھا' آتے وقت اس نے انہیں لاہور آنے کی دعوت دی اور کہا کہ آپ بھی میری بات پہ ٹھنڈے دل سے غور کریں اور میں بھی اپنے گھر مشورہ کر لیتا ہوں' لاہور آنے پہ کوئی

فیصلہ ہو جائے گا۔

پچھلی جمعرات بھی جویریہ لاہور آئی تھی' حاجی صاحب کی دونوں بیٹیاں اور بڑے صاحبزادے ساتھ تھے۔ داتا سرکار سلام کے بعد وہ قبرستان گئی' وہاں سے فارغ ہونے کے بعد سبحان چاچا کے گھر آئی۔ یہ تو بچی کے ساتھ گاؤں گئے ہوئے تھے۔ گھر میں اکیلے بابا جی تھے' گھر کی صفائی' ستھرائی اور انہیں کھانا کھلانے کے بعد واپس چلی گئی۔ نادر' اسٹیشن پر تھا لیکن صبح تڑکے وہ داتا سرکار اور قبرستان ہو آیا تھا' قبر پہ سرہانے سنگ مرمر کا کتبہ بھی استادہ کروا دیا تھا۔ قبر پہ چھڑکاؤ' اگربتیاں اور گلاب کے تازہ پھول بھی ڈال آیا تھا' گھر آیا تو بابا جی کی زبانی جویریہ کے آنے اور واپس جانے کی اطلاع ملی اور ایک پیغام بھی کہ آپ اپنا چھڑ وہیں قبر کے سرہانے بھول آئے تھے۔ میں اماں' ساتھ لے جا رہی ہوں' اگلی جمعرات ہم سب اکٹھے ملیں گے۔۔۔ وہ ہلکے سے مسکرا دیا۔

سبحان چاچا جب سے لاہور پہنچا تو گم صم اور چپ چپ تھا۔ نادر محسوس تو کر رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے جسے وہ چھپا رہا ہے' کئی بار کریدنا بھی چاہا لیکن یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اس کے بھائی آئے ہوئے ہیں' آپس کا کوئی ذاتی معاملہ ہو گا اور جب وہ ضرورت محسوس کرے گا تو خود ہی کہہ دے گا' تنہائی اور فرصت میں مل بیٹھنے کا موقع بھی کم ہی ملتا تھا۔ وہ اسٹیشن تو یہ گھر' وہ گھر پہ تو یہ اسٹیشن۔۔۔ اتفاق سے آج دونوں اسٹیشن پہ مسجد کے اندر اکٹھے اور فارغ بیٹھے تھے۔ کوئٹہ ایکسپریس اکٹھے تین گھنٹے لیٹ تھی' چناب ایکسپریس بھگتانے کے بعد نماز پڑھنے کا وقت نکل آیا۔ نماز کے بعد سبحان ذرا کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹ گیا تو نادر بولا۔

"چاچا! جب سے گاؤں سے واپس آئے ہو' کچھ پریشان سے ہو۔۔۔ اپنے بیٹے سے چھپاتے ہو' یہ اچھی بات نہیں۔۔۔"

سبحان ایکا ایکی اٹھ بیٹھا' اسے گھورنے لگا۔ پھر منبر کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"۔۔۔ کہنا تو نہیں چاہتا تھا مگر اللہ کے گھر بیٹھ کر جھوٹ بھی نہیں کہہ سکتا۔۔۔ نادر! میرے بھائیوں نے میرے ساتھ' بھائیوں جیسا سلوک نہیں کیا' میرا سارا مان مٹی میں ملا دیا ہے۔ اس وقت میں ساری بات نہیں بتا سکتا' یہی کافی ہے جو بتا چکا ہوں۔"

نادر قریب آ گیا' پاؤں پکڑ کر بولا۔ "مگر کیوں ساری بات کیوں نہیں بتا سکتے؟۔۔۔ اکیلے اکیلے اندر ہی اندر سلگ رہے ہو۔۔۔"

"مجھے تم سے خوف آتا ہے۔ نادر!۔۔۔ پرسوں جویریہ اور حاجی صاحب آ رہے ہیں' ان کی موجودگی میں ساری بات بتاؤں گا۔۔۔ ویسے اطمینان رکھو' کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں۔ محض ہم بھائیوں کے درمیان بچوں کے رشتے کے مسئلے پہ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ بھلا تمہارے ہوتے

ہوئے مجھے کیا پریشانی اور پرواہ ہو سکتی ہے۔" وہ اس کے شانے تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

●●

اس مرتبہ جویریہ کے ساتھ حاجی صاحب اپنی اہلیہ اور تمام بچوں سمیت جمعرات کی بجائے بدھ کی شام کو ہی تشریف لے آئے۔ سبحان چاچا اور نادر اسٹیشن پر تھے' گھر میں چاچی' محمد یوسف اور باباجی تھے انہیں دیکھ کر سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے کیونکہ پروگرام کے مطابق ان کی آمد جمعرات کو متوقع تھی بہرحال حافظ محمد یوسف اطلاع کرنے کے لئے اسٹیشن جانے لگا تو حاجی صاحب نے ہاتھ پکڑ کے پاس بٹھایا اور جب یہ معلوم ہوا کہ یہ سبحان چاچا کا بیٹا ہے' گاؤں سے ساتھ ہی آیا ہے اور حافظ قرآن اور قاری ہے تو خوش ہو کر سینے سے لگالیا۔ یہ سادہ' نیک اور دیندار نوجوان انہیں بہت بھلا لگا' دونوں صاحبزادے حاجی صاحب کے اشارے پہ' گھر کے لئے کھانے پینے کا سامان لانے کے لئے بازار نکل گئے اور جویریہ' حسبِ معمول گھر کے کاموں میں جت گئی۔ چاچی اور تائی' ایک دوسرے کا حال احوال کہنے سننے کے لئے فراغت سے بیٹھ گئیں۔ حاجی صاحب' حافظ محمد یوسف اور باباجی کی میٹھی میٹھی' بھولی بھالی باتوں سے لطف اندوز ہونے لگے۔

سبحان چاچا اور نادر اپنی چال اپنے حال میں گھر پہنچے تو یہاں رونق لگی ہوئی تھی' پر تکلف پکوانوں کی خوشبو سے پورا گھر مہک رہا تھا اور اندر' باہر' صحن' ہر جگہ جیسے اپنائیت' پیار' محبت کے پھول ہی پھول کھلے ہوئے تھے۔ ایک لمحہ کے لئے ان کو اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آیا' علیک سلیک کے بعد حاجی صاحب مسکراتے ہوئے فرمانے لگے۔

"بھائی' آپ حیران کیوں ہو رہے ہیں؟--- کل کی بجائے ہم آج پہنچ گئے' بچوں نے ضد کی' سو ہم آگئے اور اپنا گھر ہے' جب دل چاہے گا' آئیں گے۔ جب چاہیں گے واپس چلے جائیں گے--- آپ کو کوئی اعتراض؟"

سبحان چاچا نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "بے شک--- یہ آپ کا اپنا گھر ہے لیکن خوشی کی انتہا بھی کبھی حیرانی میں بدل جاتی ہے--- دیکھئے نا! آپ سب کے تشریف لانے سے گھر میں کیسی رونق اور خیر و برکت کی لہر بسر ہو گئی ہے---"

جویریہ نے آج بڑے اہتمام سے دلی کی مخصوص بریانی پکائی تھی' جاوتری اور زعفران کی خوشبو نے اشتہا کو بے پناہ تیز کر دیا تھا۔ شامی کباب' الٹے توے کے رومالی پھلکے' بیسن' آلو بخارے اور املی کی چٹنیاں کھڑے مصالحے کا قورمہ' رائتہ اور میٹھے میں شیر خورما کھانے بیٹھے تو انگلیاں چاٹنے لگے' سادہ ساگ روٹی کھانے والوں کے لئے یہ نعمتیں من و سلویٰ سے کم نہ تھیں۔ سبحان چاچا' سبحان اللہ کہتے ہوئے' اللہ کی بے حساب نعمتوں اور جویریہ کے سلیقے' ہاتھ کی برکت' لذت کی تعریف کرنے لگے۔ کھانے سے فارغ

ہوئے تو نمکین چائے کا دور چلا اور خوش گپیوں میں وقت گذرنے کا احساس تک نہ ہوا۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہوتے ہی پھر باتوں' دکھوں' سکھوں کی پٹاری کھول کر بیٹھ گئے--- اچانک حاجی صاحب' سبحان چاچا سے دریافت کرنے لگے۔

"میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم کچھ پریشان ہو--- آنکھیں بجھی بجھی' چہرہ اترا ہوا' تمہاری صحت بھی ٹھیک دکھائی نہیں دیتی---؟"

نادر کہنے لگا۔ "آپ کا اندازہ درست ہے--- یہ جب سے گاؤں سے واپس آئے ہیں' یہ ہی حالت ہے۔ مجھے بھی کچھ نہیں بتاتے' صرف یہ معلوم ہو سکا ہے کہ وہاں کویت سے آئے ہوئے بھائیوں سے کچھ کھٹ پٹ ہو گئی ہے--- آپ کا انتظار تھا' اب آپ ہی ان سے معلوم کریں---"

سارے گھر والے بھی یہ سن کر قریب سمٹ آئے' جویریہ بولی۔

"چچا! کیا بات ہے--- میں نے بھی محسوس کیا ہے کہ آپ کسی معاملے میں الجھے ہوئے ہیں--- ہمیں بتائیں بات کیا ہے؟"

باباجی بھی کھانستے ہوئے بولے۔ "حاجی صاحب! قلجگ آگیا ہے' خون سفید ہو گیا ہے' رشتے ناتوں کی پہچان ختم ہو گئی ہے اور مال و دولت ہی سب کچھ بن گیا ہے۔ غریب سادہ اور شریف آدمی کی حیثیت نہیں---"

وہ شدت جذبات سے کانپنے لگے تو نادر نے انہیں سنبھالا۔

"باباجی! آپ نہ بولیں' سبحان چاچا کو بات کرنے دیں---"

فضا خاصی سنجیدہ ہو چکی تھی' ایسے میں سبحان چاچا نے شروع سے آخر تک تفصیل سے سب کچھ بیان کر دیا۔

"حاجی صاحب! نادر بڑا جذباتی اور ہٹیلا بچہ ہے' یہ سب کچھ جاننے کے بعد یقیناً کچھ نہ کچھ کر گزرتا اور یہی وجہ تھی کہ میں نے اسے بے خبر رکھا' یہی سوچ رکھا تھا کہ آپ تشریف لائیں گے تو آپ کے مشورے سے کوئی فیصلہ کروں گا۔ بھائیوں سے بھی یہ کہہ آیا تھا کہ آپ لاہور آئیں' وہیں آپ سے مزید بات ہو گی۔ اب آج کل میں ہی وہ لوگ یہاں پہنچنے والے ہیں--- اب آپ ہی مجھے مشورہ دیں کہ میں انہیں کیا جواب دوں؟"

چاچی بڑے غصے سے بولی۔ "حاجی صاحب! ان کی آنکھوں پہ دولت کی چربی چڑھی ہے--- میری بات یاد رکھیں' نہ وہ رشتہ دیں گے اور نہ لیں گے' زمین اور جہیز کی آڑ بھی انہوں نے اسی لئے لی ہے۔ انہیں یقین ہے کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے' اسی طرح ہماری طرف سے انکار ہو جائے گا اور جواب میں انہیں بھی رشتہ نہ دینے کا بہانہ مل جائے گا۔ وہ پیسے کے مترین بچے ہیں' وہ رشتہ داریاں وہیں کریں گے جہاں

سے جہیز اور دولت ملے گی۔۔۔"

نادر نے ان کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر' انہیں بھی خاموش رہنے کی درخواست کی۔ حاجی صاحب پوچھنے لگے۔

"یہ محمد سلیم کیسا لڑکا ہے۔۔۔؟"

"۔۔۔ ہے تو اپنا خون' اپنا بھتیجا مگر اس کے لچھن بھی درست نہیں ہیں۔ نک سک سے درست گھبرو جوان ہے۔ دیکھا تو نہیں لیکن سنا ہے اور محسوس بھی ہوتا ہے کہ کوئی نشہ کرتا ہے اور سگریٹ تو سرعام پھونکتا رہتا ہے۔ مذہب سے متنفر' آوارہ مزاج۔۔۔ باپ نے اکلوتا ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی کھلی آزادی دے رکھی ہے' گاؤں محلے میں بھی اس کی شہرت اچھی نہیں' لڑکیوں کے معاملے میں دو چار بار جوتے کھا چکا ہے۔۔۔"

حاجی صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے روک کر' ایک سوال کیا۔ "اپنی بچی کے متعلق تمہاری رائے کیا ہے۔۔۔؟"

وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔ "جیسے کہ میں پہلے بتا چکا ہوں' وہ بچپن سے ہی ان کے گھر رہنا اور کھیلنا پسند کرتی تھی اور پھر جب میں لاہور آ گیا تو وہ ضد کرکے وہیں رہ گئی۔۔۔ یوں سمجھیے وہ جوان ہی وہیں پہ ہوئی۔ میں یہ سوچ کر کہ ایک دن اسے وہیں جانا ہے' وہ خود ہی اپنے رنگ ڈھب سے تربیت دے لیں گے' اسے چھوڑ آیا تھا لیکن وہ وقت اور تھا' ابھی اس گھر میں دوبئی کی دولت نہیں آئی تھی' اپنی طرح غریبی اور آنکھوں میں دید لحاظ تھا۔ اب وہ بھی ان کے رنگ میں ہی رنگی ہوئی ہے' میں اور میرا کام تو اسے زہر لگتے ہیں۔۔۔ بچپن میں وہ بڑی معصوم تھی۔ ماں کے ساتھ نماز پڑھتی تھی' بچی اور دھتی تھی' کلمے درود یاد کرتی تھی اور اب۔۔۔"

سنجیدگی کی کہر میں سب دھندلائے سے بیٹھے تھے۔ نادر سرخ چہرہ ہوکر اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا اور حاجی صاحب جیسے مراقبے میں ڈوبے ہوں۔ ایک گہری خاموشی کے بعد انہوں نے "ہوں" کی آواز نکال کر سر اٹھایا' اردگرد در و دیوار کو گھورنے لگے اور پھر بڑی پختہ آواز میں بولے۔

"سبحان بھائی! میرا مشورہ ہے کہ کل تم جب داتا سرکار جاؤ تو سرکار کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کردو اور صبر اور انتظار کرو۔۔۔ دیکھو کہ وہاں سے کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے؟ مجھے یقین کامل ہے کہ جو فیصلہ وہاں سے ہوگا' وہ ہر لحاظ سے تمہاری بہتری کے لئے ہوگا۔۔۔ اور ہاں! اگر اس دوران وہ لوگ یہاں آئیں تو تم صاف صاف کہہ دو کہ جو بات طے ہو چکی ہوئی ہے' اسی بات کی تکمیل میں ہم سب کی بہتری ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ مت کہو۔۔۔"

حاجی صاحب کے مشورے نے جیسے اسے کسی تپتے ہوئے صحرا سے اٹھا کسی چمن زار میں لا اتارا ہو'

وہ بڑا پرسکون ہو گیا۔ سب نے اس پاکیزہ مشورے کو سراہا اور جویریہ کے تو یہ جیسے دل کی بات تھی۔۔۔ ماحول سے سنجیدگی چھٹی تو چائے کے لئے فرمائش ہوئی' سبحان چاچا کو پرسکون پا کر حاجی صاحب بولے۔

"بھائی صاحب! اصل میں تو ہم ایک ضروری مشورے کے لئے حاضر ہوئے تھے۔۔۔ اگر اجازت ہو تو ہم بھی کچھ عرض کریں۔۔۔؟"

سبحان چاچا دھیرے سے مسکرایا۔ "مجھے تو آپ داتا سرکار کے پاس بھیجتے ہیں اور خود آپ اس گنہگار کے پاس آکر شرمندہ کرتے ہیں۔۔۔"

حاجی صاحب اس پیار بھری میٹھی سی چوٹ سے بڑے محظوظ ہوئے' فرمانے لگے۔

"بھائی! دنیاداری کے چھوٹے چھوٹے معاملوں میں بڑے بڑوں کو زحمت نہیں دینی چاہیے۔۔۔ بات یہ ہے کہ جویریہ بی بی کو ہر جمعرات' فیصل آباد سے لاہور آنے کے لئے خاصی زحمت اٹھانی پڑتی ہے اور مجھے خود بھی محسوس ہوا ہے کہ اس کے لئے داتا سرکار کے قدموں سے دور رہنا مشکل ہے۔۔۔ جویریہ بخش مرحوم بھی یہیں دفن ہیں۔ باباجی' سبحان بھائی' بہن جی' نادر بیٹا' حافظ صاحب' سب کچھ تو یہیں ہیں۔ پھر اس کی اپنی خواہش بھی یہیں لاہور رہنے کی ہے۔ یہاں رہ کر وہ دینیات پڑھنا چاہتی ہے' قرآن حفظ کرنا چاہتی ہے۔۔۔"

سبحان چاچا خوش ہو کر بولے۔ "اگر جویریہ بیٹی کی یہی خواہش ہے اور آپ کی اجازت اور خوشی بھی اسی میں ہے تو بسم اللہ۔۔۔ یہ غریب خانہ حاضر ہے۔ جو روکھی سوکھی ہوگی' اکٹھے مل بیٹھ کر کھائیں گے۔۔۔"

چاچی بھی چہک کر بولیں۔ "ہمارے گھر تو اللہ کی رحمت آجائے گی' ہمیں اور کیا چاہیے۔۔۔؟"

"میری ایک تجویز ہے۔۔۔" حاجی صاحب محتاط لہجے میں کہنے لگے۔ "یہ مکان آپ سب کے لئے کچھ موزوں نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ اردگرد کا ماحول کچھ ٹھیک نہیں' یہ چار دیواری بھی محفوظ نہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو۔۔۔"

سبحان چاچا بیچ میں ہی بول اٹھا۔ "آپ درست کہتے ہیں' میں خود بھی جویریہ کے لئے یہ ماحول اور مکان مناسب نہیں سمجھتا۔۔۔ بھینس کی مجبوری نہ ہوتی تو کبھی کے ہم کہیں اور منتقل ہو گئے ہوتے۔۔۔ مکان کے باہر کا کھلا میدان' سایہ دار درخت' اسٹیشن قریب' دراصل یہ کچھ ہماری بھینس' باباجی' حیثیت اور طبع کے مطابق تھا۔۔۔ آپ فکر نہ کریں' میں بہت جلد کسی مناسب سے مکان کا بندوبست کرلوں گا۔"

حاجی صاحب داڑھی کھجاتے ہوئے نہایت نرمی سے بولے۔ "مکان کے معاملے میں اگر میں آپ کی مشکل حل کردوں تو۔۔۔؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

سبحان چاچا نے ان کی بات کی تہہ تک پہنچتے ہوئے جواب دیا۔ "حاجی صاحب! گستاخی معاف' یہ ہمارا ذاتی مسئلہ ہے اور اسے ہم خود ہی حل کریں گے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ--- میری نظر میں ایک دو مکان ہیں' انشاء اللہ جلد ہی کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ حافظ محمد یوسف بھی مستقل یہیں رہے گا' مکان تو لینا ہی لینا ہے---"

"مجھے اندازہ تھا' سبحان بھائی کہ تم مجھے ایسا ہی جواب دو گے اور ایسے ہی مجھے بیگانہ سمجھو گے لیکن تمہارے اور نادر کے ذرائع آمدن مجھ سے ڈھکے چھپے نہیں--- صحیح ہے کہ میں آپ کا سگا بھائی تو نہیں لیکن خدا گواہ ہے کہ آپ مجھے سگے بھائیوں سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ اللہ نے مجھے بہت کچھ دے رکھا ہے اور الحمدللہ جو کچھ بھی میرے پاس ہے وہ شرعی اور جائز طریقے سے کمایا ہوا ہے۔ ان حالات میں اگر میں کسی طور آپ کے کام آسکوں تو میری خوش نصیبی ہوگی' میرا دل بھی خوش ہو جائے گا---"

"اللہ آپ کو خوش اور خوشحال رکھے' آپ کا یہ کہنا ہی میرے لئے بہت ہے--- اللہ ہمارے ہاتھ پاؤں سلامت رکھے۔ بیٹیاں اللہ کی رحمت ہوتی ہیں' بوجھ نہیں اور پھر جویریہ ایسی بیٹی تو سراپا رحمت و برکت ہے---"

حاجی صاحب زچ ہو گئے' گھٹی سی آواز میں بولے۔ "نادر بیٹے کی لوٹائی ہوئی رقم جو اصل میں اسی کا حق ہے' اس سے ایک معقول سا مکان خریدا جا سکتا ہے---"

اس بار نادر نے جواب دیا۔ "ہم غریب لوگ دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتے چاہے وہ زبان ہو' رشتہ یا پیسہ--- جویریہ بہن کے لئے جان بھی قربان ہے' مکان تو کوئی مسئلہ نہیں--- آپ بے فکر رہیں' صرف ہمارے حق میں دعا کیا کریں---"

"اچھا صاحبو! آپ جیتے' میں ہارا--- تم لوگ جانو اور جویریہ جانے---"

چاچی دوپٹہ درست کرتی ہوئی بولیں۔ "بھائی حاجی صاحب! آپ ان کی بات دل پہ نہ لگائیں۔ ہمارے گھر جویریہ آئی' دین و دنیا کی دولت آگئی' یہ کرماں والی تو جب آتی ہے' گھر نور اور برکت سے بھر جاتا ہے۔ گھر بھر میں اس طرح کام کاج کرتی ہے جیسے اسی گھر میں پیدا ہوئی ہو--- اسے دیکھتی ہوں تو ایک خواہش دل کی گہرائیوں سے ابھر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ مگر اپنا تار تار دامن دیکھ کر شرمندہ سی ہو جاتی ہوں اور اس خواہش کو حسرت بنا کر واپس دل کی گہرائیوں میں دفن کر دیتی ہوں--- وہ خواہش اس وقت بھی میرے ہونٹوں پہ الفاظ کا روپ لینے کے لئے مچل رہی ہے' آپ ہی بتائیں کہ میں کیا کروں؟"

سب ہی سیدھی سادی' بھولی بھالی چاچی کا منہ دیکھنے لگے۔ چاچی کے منہ سے ایسے موتی تو کبھی نہ جھڑے تھے' ایسی حکمت و جذب سے بھرپور گفتگو کبھی نہ سنی تھی۔ چاچی کس قلزم سے بول رہی تھی؟ سبحان بھی حیران تھا--- حاجی صاحب لطف لیتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"بہن جی! اس خواہش کو آج اپنے دل کے پنجرے سے آزاد کر دیں---"

چاچی' چڑیا سے جن بن گئی۔ اپنے دوپٹے کا پلو' حاجی صاحب کی اہلیہ کی گود میں ڈالتے ہوئے التجا کرنے لگی۔

"مجھے جویریہ بیٹی دے دیجئے' ہماری عاقبت سنور جائے گی---"

ایک بم سا پھٹا اور سبحان چاچا شیر کی مانند دھاڑا۔

"یوسف کی ماں! تو کیا بکواس کر رہی ہے---؟" وہ غصے اور شدت جذبات سے تھر تھر کانپتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ "چل' اندر دفع ہو---"

حاجی صاحب نے اسے پکڑ کر بٹھایا۔ وہ اندر گئی تو ساتھ جویریہ اور حاجی صاحب کی بیوی بچیاں بھی چلی گئیں۔ سبحان چاچا' گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا' عجیب ڈرامائی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ ہر شخص سر بلب' کانوں میں سنسناہٹ سی محسوس کرتا ہوا' انجام پہ غور کرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ پھر حاجی صاحب نے سبحان چاچا کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بڑی نرمی سے کہا۔

"بھائی! کیا ہوا' اس قدر غصہ؟--- بہن نے کوئی ایسی انہونی یا نازیبا بات تو کی نہیں--- بیٹی' میرے گھر ہو' تیرے گھر یا جویریہ بخش کے گھر' جہاں بیٹی ہوگی' وہاں یہ باتیں بھی ہوں گی اور پھر ہم تو اپنے گھر بیٹھے ہیں۔ اپنوں میں---"

"حاجی صاحب! اسے ایسی بات کہنے کی جرات کیونکر ہوئی؟--- ہم تو اس نیک اور عظیم بچی کی جوتیاں اٹھانے کے لائق نہیں' ہم نے تو پانی تک نہ پینے کی قسم اٹھا رکھی ہے اور وہ کم بخت کنواں مانگ بیٹھی--- خدا کے واسطے' آپ ہمیں معاف کر دیں--- میں خود جویریہ سے بھی معافی مانگوں گا۔" وہ تھر تھر کانپنے لگا۔

نادر اپنی جگہ سے اٹھا اور پاس بیٹھ کر کہنے لگا۔ "چاچا! چاچی اپنی سادگی اور بھولپن میں ایسی بات کر گئی ہے اور پھر یہ کوئی بری بات بھی نہیں--- وہ تمہاری بیوی کے علاوہ' ایک جوان بیٹے کی ماں بھی ہے' ہر ماں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے گھر نیک سگھڑ بہو لائے سوا سے یہ خوبیاں جویریہ بہن میں نظر آئیں' اسی بنا پہ اس نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا لیکن ایک غلطی چاچی سے بھی سرزد ہوئی۔ چاچی کو اپنا بیٹا اور اپنی حیثیت بھی دیکھنا چاہئے تھی--- چلو' جو ہوا سو ہوا۔ چاچی کی غلطی کو معاف کر دو---"

حاجی صاحب قدرے درشتگی سے بولے۔ "آپ لوگ یہ بار بار حیثیت اور غریبی کی گردان کیوں کرتے رہتے ہیں--- غریب انسان نہیں ہوتے' کیا وہ اس رب العزت کی قابل عزت مخلوق نہیں۔ ان کی ضرورتیں' انسانی تقاضے' خواہش' مرنا جینا' دولت اور حیثیت والوں سے علیحدہ ہوتا ہے؟--- نہیں بیٹے! غریب بھی اپنے اصولوں' طریقوں' محنت' خیالات اور یقین کے حوالے سے امیر ہوتا ہے اور اصل چیز تو

استغنا اور قناعت پسندی ہے۔ میری نظروں نے آپ لوگوں سے زیادہ امیر آج تک نہیں دیکھا۔۔۔ آپ سب مجھے امیر سمجھتے ہیں نا! میرا سب کچھ لے لیں مجھے اپنی خودداری' استغنا اور یقین دے دیں۔۔۔ یہ بچہ حافظ محمد یوسف' جسے ان لوگوں نے بے حیثیت' کمزور نظر' حافظ' نمازی سمجھ کر ٹھکرا دیا ہے یہ دنیا کا امیر ترین انسان ہے۔ اس کے سینے میں قدرت نے خزانہ بھر دیا ہے' یہ ایمان اور یقین کی دولت سے مالا مال ہے۔ یہ اپنے ہاتھ میں اگلی پچھلی سات سات پشتوں کو بخشوانے کا پروانہ تھامے ہوئے ہے۔۔۔"

یہ کہہ کر اچانک وہ اٹھے' سبحان چاچا سے اجازت لے کر اندر چلے گئے۔۔۔ اندر چاچی لیٹی رو رہی تھی' لڑکیاں چارپائی پہ بیٹھی چاچی کو تسلی دے رہی تھیں اور جویریہ مصلے پہ قرآن کھولے گم صم بیٹھی تھی۔ حاجی صاحب نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا' کچھ کہنے سے پہلے آنکھوں سے دو آنسو اس کے سر پہ گرے تو سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور بولی۔

"میں جانتی ہوں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟۔۔۔ میرا رب اور میرا دادا میرے حق میں کیا فیصلہ کرتا ہے' یہ جاننے کے لئے آنکھیں بند کر کے قرآن کھول لیا ہے۔ ابھی تک میں نے آنکھیں نہیں کھولیں اور کیا لکھا ہے' یہ نہیں پڑھا۔۔۔ لیجئے' آپ ہی پڑھیئے' میں راضی بہ رضا ہوں۔۔۔"

حاجی صاحب جھکے' بسم اللہ کہہ کر قرآن شریف پہ نظر ڈالی تو سامنے سورۂ یوسف کا پہلا رکوع کھلا پڑا تھا۔ ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"لو بیٹا! تم بھی پڑھ لو۔۔۔"

جویریہ نے دیکھا اور سر جھکا دیا۔

حاجی صاحب باہر نکلے تو یوں لگ رہا تھا جیسے کسی لمبے وظیفے سے فارغ ہوئے ہوں۔ چہرے پہ نور کا ہالہ' آنکھوں میں ستاروں ایسی چمک' خراماں خراماں سبحان چاچا کے پاس آئے۔

"بھائی! اپنی بیوی کو ذرا باہر بلاؤ۔۔۔"

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھنے لگا۔ پھر اٹھا' اندر چلا گیا۔۔۔ وہ باہر آئے تو حاجی صاحب نے انہیں اپنے سامنے چارپائی پہ بٹھایا۔

"آپ سب' عزیزی حافظ محمد یوسف کو لے کر اس جمعہ کے بعد والے جمعے یعنی ٹھیک نو دن بعد' صبح دس بجے فیصل آباد پہنچ جائیں۔۔۔ چاہیں تو ساتھ اپنے عزیز و اقارب بھی لا سکتے ہیں' نکاح انتہائی سادگی سے ہوگا۔۔۔"

نادر کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "اگر مناسب سمجھیں تو اپنی بات کی ذرا اور وضاحت فرما دیں۔۔۔"

"جو بات میں خود نہیں سمجھ سکا اس کی وضاحت کیا کروں گا؟۔۔۔ بس ذرا وقت پہ پہنچنے کی کوشش

کیجئے گا' اللہ بہتر کرنے والا ہے۔۔۔"

رات بھیگ چلی تھی۔ اس کے ساتھ کچھ آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں' کچھ دل بھی بھیگ چکے تھے۔ سبحان چاچا' باباجی' نادر' حافظ محمد یوسف' والدہ' حاجی صاحب کی اہلیہ' بچیاں' بچے' سارے اپنی اپنی ادھیڑ بن میں مصروف کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا' سب حیران تھے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو ہو گیا ہے؟۔۔۔ واہ مولا! تیرے نوازنے کے ڈھنگ نرالے ہیں' تو وہ کچھ بخش دیتا ہے' جو وہم و گمان میں نہیں ہوتا۔۔۔ نادر کی سمجھ میں اب آیا کہ چاچی کے اندر کون بول رہا تھا۔ اس کو یہ خیال' یہ خواہش' یہ زبان' الفاظ اور یہ جذبہ کس نے عطا کیا تھا۔ وہ چاہے تو کنکریوں کو قوت گویائی عطا فرما دے اور یہ تو انسان تھی۔

ابھی شاید حاجی صاحب' فیصل آباد پہنچ بھی نہ پائے تھے کہ ادھر گاؤں سے کویت والے دونوں بھائی مع بچوں اور رابعہ کا لاہور پہنچ گئے۔ سبحان چاچا اور نادر دا تا دربار سے سیدھے اسٹیشن کی طرف چلے گئے اور اب گھر میں چاچی' باباجی اور حافظ محمد یوسف ہی تھے۔ ان کا بڑے تپاک سے استقبال کیا۔ گلے لگے' دعائیں دیں' رخسانہ اور رابعہ کھانے پکانے میں مصروف ہو گئیں اور حافظ محمد یوسف باپ اور نادر کو اطلاع دینے کی غرض سے اسٹیشن چلا گیا۔۔۔ اسٹیشن سے آتے ہوئے نادر نے کہا۔

"چاچا! بہتر ہے کہ میں یہاں اسٹیشن پر ہی رہوں۔۔۔ میں چونکہ ان کے لئے اجنبی ہوں اس لئے ایسا نہ ہو' میری موجودگی سے کوئی بدمزگی پیدا ہو جائے یا کھل کر بات کرنے سے اجتناب کریں۔"

"تم سیدھے میرے ساتھ چلو۔۔۔ جو ہوتا ہے' ہونے دو۔ مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔" سبحان چاچا نے بڑے مضبوط لہجے سے اس کی بات کا جواب دیا۔

گھر پہنچے تو ملنے ملانے کے بعد نادر کا تعارف کرایا۔ نادر صاف محسوس کر رہا تھا کہ انہوں نے اسے نہ تو کوئی اہمیت دی اور نہ کشادہ دلی سے کسی خلوص اور اپنائیت کا اظہار کیا جبکہ محمد سلیم نے اسے ہاتھ ملانے کے قابل بھی نہ سمجھا۔ اپنے ماں باپ کے لئے وہ چند کپڑے' ادھر ادھر کی معمولی چیزیں لائے تھے اور مزید دو ہزار روپے نقد بھی دیئے' کھانے کے بعد بولے کہ ہم نے آج ہی واپس جانا ہے' کچھ اور ضروری کام ہیں لہٰذا تم نے جو کچھ سوچا یا فیصلہ کیا ہے اس سے ہمیں آگاہ کر دو۔ سبحان چاچا پہلے جویریہ' حاجی صاحب اور حافظ محمد یوسف کے متعلق بتانا چاہتا تھا مگر انہوں نے موقع ہی نہ دیا۔ سبحان چاچا نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ باباجی بول پڑے۔

"پتر رحمان! میں نے سنا ہے کہ تم رابعہ کا رشتہ تو لینا چاہتے ہو لیکن رخسانہ کا رشتہ دینا نہیں چاہتے اور رابعہ کے جہیز میں آدھی زمین اور سامان مانگا ہے۔۔۔ پتر! میں ابھی زندہ ہوں' مر نہیں گیا۔ یہ زمین' مکان ابھی میں نے تقسیم نہیں کئے۔۔۔"

رحمان نے جواب دیا۔ "جس وقت آپ نے یہ رشتے طے کئے تھے وہ وقت' زمانہ اور تھا۔ اس وقت

اولاد چپ چاپ بڑوں کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیتی تھی لیکن اب وقت کچھ اور ہے۔ اب بڑوں کو بچوں کے فیصلے پہ آمین کہنا پڑتی ہے' پھر جوڑ اور حالات کو بھی دیکھنا پڑتا ہے۔۔۔ باقی رہی جہیز کی بات' وہ تو ماں باپ بیٹیوں کو دیتے ہی ہیں۔ میں نے کوئی انوکھی بات نہیں کی۔۔۔ سبحان اگر اپنے صحن والی زمین کا ٹکڑا' اپنی بیٹی کو دے دے تو میں اپنا مکان ذرا کھلا کر لوں گا' یہ کونسا وہاں رہتا ہے۔ حافظ اکثر مسجد میں' رابعہ ہمارے گھر اور بے چاہے ادھر رہے یا ادھر۔۔۔"

یہ خرافات سن کر نادر کی کنپٹیاں سرخ ہو گئیں لیکن مجبور تھا' کچھ کہنا چاہتے ہوئے بھی کہہ نہیں سکتا تھا' زبان دانتوں تلے دابے وہ اپنے آپ میں پیچ و تاب کھا رہا تھا البتہ سبحان چاچا بظاہر بڑا پرسکون ٹکٹکی باندھے بھائی کے منہ کو دیکھ رہا تھا۔ آخر بڑے تحمل سے بولا۔

"تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔۔۔؟"

بڑی بھابی بولی۔ "ہاں سبحان! یہی ہمارا آخری فیصلہ ہے۔۔۔"

سبحان چاچا سوچ میں پڑ گیا۔ چند لمحوں کی خاموشی بڑی بھاری ہو گئی تھی' زمین آسمان کی گردشیں جیسے تھم سی گئی تھیں۔ نادر کے چہرے پہ بیک وقت کئی رنگ ابھرے' ڈوبے۔ پھر سبحان چاچا نے نادر کا ہاتھ تھام کر فیصلہ کیا سنایا' جیسے گرینڈ کی پن نکال کر صحن میں اچھال دیا ہو۔

"رحمان بھائی! مجھے تمہارا فیصلہ منظور ہے' تمہیں اپنے مکان کو وسیع کرنے کے لئے زمین بھی مل جائے گی اور جہیز بھی۔۔۔ تم جب چاہو' شادی کا دن مقرر کرنے کے لئے آ سکتے ہو۔۔۔"

ہکا بکا سب اس کا منہ تکنے لگے' نادر کے تھامے ہوئے ہاتھ کی کپکپاہٹ وہ واضح طور پہ محسوس کر رہا تھا۔۔۔ کسی کو اس کے فیصلے پہ زبان کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ سبحان چاچا کے بھائی اپنی اس جیت پہ بہت خوش ہوئے' مبارکبادیاں دیں۔ پھر خوش خوش شاداں و فرحاں شام سے پہلے گاؤں لوٹ گئے۔ چند دنوں تک پھر لاہور آنے اور دن پکے کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کر گئے۔۔۔ رابعہ بیس رک گئی تھی۔

دھند چھٹی' مطلع صاف ہوا تو سبحان چاچا' نادر کا ہاتھ تھامے اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گیا۔ راستے میں حضرت گھوڑے شاہ کا دربار' لمبا سا بازار' کچے چمڑے کے گودام' بدبو' خوشبو۔۔۔ ریلوے کے آہنی پل کی شکستہ سیڑھیوں کو پھلانگتے ہوئے' پل کے اوپر عین درمیان پہنچے تو نادر نے سبحان چاچا کو روک لیا۔ نیچے چمک کرتی' غلیظ دھواں اگلتی شتنگ گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ پٹڑیوں کا جال' جھونپڑیاں' غلاظت کے انبار' گدھے بکریاں' مزدور' کھیلتے ہوئے بچے۔۔۔ عجیب سا منظر تھا۔ وہ دونوں چپ چاپ' بظاہر ایک دوسرے سے بے نیاز نیچے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے یا دھوکا دے رہے تھے۔

"چاچا۔۔۔"

"ہوں۔۔۔"

"ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔۔۔"

"یہ تم نے کیا فیصلہ کر دیا۔۔۔۔؟"

"میں نے تو کوئی فیصلہ نہیں کیا۔۔۔ یہ فیصلہ داتا سرکار کا ہے' میں نے دربار جا کر یہ مسئلہ پیش کر دیا تھا' عرض کی تھی کہ میں بڑا کمزور ہوں' آپ کا قلی ہوں۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ میں کتنا بوجھ اور دکھ سہار سکتا ہوں۔ بس!۔۔۔ فیصلہ کرتے ہوئے مجھے کچھ علم نہیں کہ میں نے کیا کہہ دیا۔ تمہاری ان پڑھی' بھولی بھالی چاچی کی طرح نہ تو وہ میرے الفاظ تھے اور نہ کوئی ارادہ۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ آؤ' چلیں؟"

شتنگ انجن کا کھچا دھکا کھایا ہوا' ایک ڈبہ' اپنے آپ لہراتا ہوا' اپنے مستقر کی جانب رواں تھا۔

●●

چار روز بعد سبحان چاچا' اپنی بیوی کے ساتھ اپنے بھائی رحمان کے گھر ہجویری' حاجی صاحب اور نادر کی تمام کہانی سنا رہا تھا۔ دراصل وہ حافظ محمد یوسف اور ہجویریہ کی شادی میں شرکت کی دعوت دینے آیا تھا۔ تمام کہانی سن کر وہ حیرت میں ڈوب گئے' بڑی دلچسپی اور اپنائیت سے ایک ایک بات تفصیل سے پوچھنے لگے۔ ان کے برتاؤ میں اچانک ایسی بڑی تبدیلی بڑی حیران کن بات تھی۔ انہوں نے بڑی کشادہ دلی سے عزت خاطر کی' ضروری تیاری کے بعد ایک آدھ روز میں لاہور پہنچنے کا وعدہ کرتے ہوئے ہر طرح سے تعاون کا یقین دلایا۔

حسب وعدہ وہ سارے مع اہل و عیال بدھ کی شام سے ذرا پہلے لاہور آ گئے' ان کے جوش و خروش اور بے پناہ اظہار اپنائیت سے قطعی یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ یہی وہ لوگ ہیں جو صرف چند روز پہلے بڑی رکھائی' بیگانیت کا اظہار کرتے ہوئے ماتھے پہ آنکھیں رکھے بیٹھے تھے۔۔۔ نیرنگئ زمانہ' کہ انسان کتنی سرعت سے اپنا اور کتنی عجلت سے بیگانہ بن جاتا ہے اور آگے آگے دیکھئے کیا کیا ہوتا ہے؟۔۔۔ حافظ محمد یوسف تو جیسے ان کی آنکھوں کا تارا بن گیا تھا۔ جو خوبیاں اس میں سرے سے موجود ہی نہیں تھیں' وہ بھی اب دریافت ہو گئیں' بڑی بھابیاں صدقے واری ہو کر نہال ہو رہی تھیں۔ دولہا کے جوڑے' سہرا' گلے کے ہار' نقشین جوتا' رومال' سب کچھ لے کر آئے تھے اور نادر کو بیٹا' بیٹا کہتے زبان نہ تھکتی تھی۔ اس کے لئے بھی کپڑوں کا جوڑا اور گھڑی لائے تھے۔۔۔ گئی رات تک ڈھولک کی تھاپ پہ شگنوں کے گیت ابھرتے رہے۔ حاجی صاحب اور حاجی صابر بٹ نے بڑی سادگی سے سارا اہتمام کیا ہوا تھا۔ سادہ سا کھانا' تنبو نہ قناتیں' باجے نہ گاجے۔۔۔ دولہے کے گلے میں ہار اور دولہا والیوں کے زرق برق لباس سے اگر قطع نظر کیا جائے تو یہ تقریب شادی بیاہ کی تقریب ہرگز دکھائی نہیں دیتی تھی۔ شرعی حق مہر' جہیز میں ایک قرآن

189

شریف' مصلی' تسبیح' دولہا دلہن کے پارچات' معمولی سے برتن اور بس!--- بھابیوں اور لڑکیوں نے تو وہیں پہ کانا پھوسی شروع کر دی کہ اتنے امیر آدمی اور یہ جہیز' یہ کھانا' یہ انتظام؟--- جیسے شادی نہ ہو' کوئی مرگ ہو۔ اس سے زیادہ تو ہمارے لوگوں میں چالیسویں پہ انتظام ہوتا ہے۔ دلہن بھی سادا مردار سی' نہ میک اپ اور نہ بھاری جوڑا' نہ کام کا کوئی زیور اور رشتہ داروں کے تحفے نہ کپڑے۔

حاجی صاحب' ہجویریہ کو خدا کے سپرد کرتے ہوئے داتا کی نگری روانہ کرنے سے پہلے تنہائی میں ایک بند لفافہ تھماتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہنے لگے۔

"ہجویریہ بیٹی! تمہیں خدا اور داتا سرکار کے سپرد کیا--- تمہاری خواہش کے مطابق میں نے سب کچھ کر دیا ہے' ہجویر بخش کی وصیت کے مطابق پانچ لاکھ کی رقم سے پانچ ہزار کی رقم تمہاری خواہش کے مطابق اخراجات کی مد میں خرچ ہوئی۔ چار لاکھ پچانوے ہزار اور پانچ لاکھ نادر والے' کل ملا کر نو لاکھ پچانوے ہزار کا چیک لفافے میں بند ہے--- مجھ گنہگار کی جانب سے تو تم نے کچھ بھی قبول نہیں کیا۔"

حاجی صاحب کے سینے سے لگ کر وہ بولی۔ "مجھے صرف آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے---"

شاید پہلی مرتبہ کسی کان نے ہولے سے سسکیوں کی آواز سنی۔

"بیٹی! اس مسکین سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا---"

دلہن کے ساتھ حاجی صاحب کی دونوں صاحبزادیاں بھی روانہ ہوئیں۔ لاہور پہنچتے پر پہلے داتا سرکار حاضری دی' پھر حاجی صابر بٹ صاحب نے اپنے گھر دودھ مٹھائی سے تواضع کی' تحفے اور دعائیں دیں۔ امام صاحب نے بھی قرآن شریف کا نسخہ دیا اور شام سے پہلے وہ سب گھر پہنچ گئے۔

بھائی بھابیوں کے موڈ تو جہیز اور ان کے سادہ معمول سے انتظامات دیکھ کر ہی بگڑ چکے تھے لیکن وہاں منہ سے کچھ نہ بولے تھے' گھر پہنچتے ہی انہوں نے سبحان چاچا کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"تم تو کہتے تھے کہ وہ بڑے لکھ پتی ہیں لیکن انہوں نے اپنی بیٹی کو کیا دیا' ہماری کیا عزت کی ہے؟--- رونق نہ خوشیاں' شگن نہ سلامیاں' نہ دولہا والوں کے کپڑے جوڑے--- اس طرح شادیاں ہوتی ہیں--- گوشت آلو اور لمبا شوربا---؟"

سبحان چاچا نے بڑے تحمل سے انہیں جواب دیا۔ "--- در اصل میں نے انہیں خود ہی منع کر دیا تھا۔ ان فضول رسموں اور بے جا فضول اخراجات کو نہ تو میں خود پسند کرتا ہوں اور نہ ہی میری پہلی ہے۔ جو کچھ انہوں نے جہیز میں دیا' اس سے بڑھ کر اور کیا نعمت اور دولت ہو سکتی ہے--- ہجویریہ مل گئی' ہمیں سب کچھ مل گیا۔ میں جہیز اور شو' شا کا قائل نہیں ہوں اور نہ ہی خدا رسول کا حکم ہے---"

نادر بھی اب تک خاموش کھڑا سب کچھ سن رہا تھا' کہنے لگا۔

"چاچا ٹھیک کہتے ہیں--- لیکن ہم آپ کی خواہش کے مطابق رابعہ کو سب کچھ دیں گے' فکر نہ

کریں۔"

گھر آتے ہی اس قسم کی گفتگو سے اچھی خاصی بد مزگی پیدا ہو گئی تھی' نادر نے انہیں سمجھا بجھا کر کسی حد تک ٹھنڈا کر دیا تھا لیکن سبحان چاچا کے منہ کی کڑواہٹ دور نہ ہو سکی۔

رات میاں بیوی اکٹھے ہوئے تو ہجویریہ نے چیک اپنے خاوند کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ یہ رقم آپ کے نام ہے' اپنے نام بنک میں جمع کرا دیں۔ وہ اللہ والا کیا جواب دیتا' چیک پاس رکھ لیا اور صبح ناشتے پہ سب کے روبرو اپنے باپ کے حوالے کر دیا۔ نادر نے جب یہ انکشاف کیا کہ قریباً دس لاکھ روپے ہجویریہ کو جہیز میں ملے ہیں اور چیک حافظ محمد یوسف کے نام ہے تو آدھے سے زیادہ ناشتہ کرنے والے بے ہوش ہوتے ہوتے بچے' منہ کھلے کے کھلے رہ گئے اور بھائی بھابیوں کو جیسے سکتہ سا ہو گیا۔ منہ سے کیا بولتے' بس ٹکر ٹکر چیک کو دیکھ رہے تھے۔ سبحان چاچا نے چیک نادر کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ اسے فی الحال اپنے پاس رکھو' پھر بات کریں گے۔

بھائی بھابیوں کا جانے کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن جگہ کی تنگی اور پیچھے گھر بار کی مجبوری کے باعث بادل نخواستہ انہوں نے تیاری کر لی۔ ہجویریہ کے جہیز کے بارے میں جو گفتگو ہوئی' اسے اپنی نا سمجھی اور غلط فہمی گردانتے ہوئے اپنے رویئے کے بارے میں معافی مانگی اور اگلے جمعہ کو رابعہ کے دن پکے کرنے کے لئے دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئے--- ادھر حاجی عبداللہ غنی مع اہل و عیال تشریف لے آئے۔ سبحان چاچا اور نادر نے اپنے بھائیوں اور بھابیوں کے برتاؤ' رویئے اور خیالات کو تفصیل سے بیان کیا اور آئندہ کے لائحہ عمل کے لئے مشورہ چاہا۔ حاجی صاحب نے بغور سب کچھ سننے کے بعد کہا۔

"سبحان بھائی! وہ لوگ لالچی اور حریص تو ضرور ہیں لیکن تمہارے اپنے ہیں' تم نے ان کی غلط یا صحیح شرائط کو قبول کر کے عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اب بھی کوشش کرو کہ رابعہ بیٹی کی شادی جلد سے جلد ہو جائے---"

نادر قطع کلامی کی معذرت کرتے ہوئے بولا۔ "--- اس حد تک تو ٹھیک ہے لیکن جہاں تک میں نے محسوس کیا ہے' وہ لوگ محض اسی پہ اکتفا نہیں کریں گے۔ مجھے تو ان کے حرص کا دامن مزید دراز ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے--- ہجویریہ بس کی دولت دیکھ کر ان کے منہ سے رال ٹپکنے لگی ہے۔"

"نادر بالکل ٹھیک کہتا ہے---" سبحان چاچا نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"بہرحال دیکھو تو سہی کہ اگلے جمعے کو کیا ہوتا ہے---؟"

حاجی صاحب نے بات سمیٹنے کی غرض سے کہا۔ انہیں واپس جانے کی جلدی تھی۔ وہ حافظ محمد یوسف' ہجویریہ اور اپنی بچیوں کو ساتھ لے جانے کی غرض سے آئے تھے۔

"اچھا--- اللہ بہتر کرنے والا ہے۔" سبحان چاچا چیک ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ

چیک آپ نے حافظ محمد یوسف کے نام لکھا ہے' آپ ہمیں کیوں بار بار آزمائشوں میں ڈالتے ہیں؟--- جویریہ بیٹی ہمیں مل گئی' ہمیں سب کچھ مل گیا ہے۔ یہ آپ واپس لے لیں---"

"بھائی! میں نے آپ کو کچھ نہیں دیا' ایک پائی بھی نہیں---- یہ رقم جویریہ بیٹی کو اپنے مرحوم والد اور اپنے بھائی نادر کی جانب سے ملی ہے--- آپ کو شاید علم نہیں کہ نکاح اور اس موقع پہ اٹھنے والے تمام اخراجات' جویریہ نے اسی رقم سے ادا کئے ہیں اور مزید جو کچھ بھی ہوا' وہ اسی کی عین خواہش کے مطابق ہوا اور یہی میری ڈیوٹی اور فرض ہے کہ میں اس کی خواہشات کا احترام کروں۔ یہ چیک بھی اسی کی مرضی سے اس کے شوہر کے نام لکھا گیا۔ اب یہ آپ کا آپس کا معاملہ ہے' آپ جانیں آپ کا کام کہ آپ اسے رکھیں' پھاڑیں یا کہیں خرچ کریں مگر مجھے درمیان میں نہ لائیں---"

حاجی صاحب' حافظ محمد یوسف اور جویریہ کو ساتھ لے کر فیصل آباد روانہ ہو گئے تو یہ دونوں بھی کسی مناسب سے مکان کی تلاش میں باہر نکل آئے۔ سارے دن کی دوڑ دھوپ کے بعد شیرانوالے دروازے کے اندر ایک مکان حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تین کمرے' دالان' پانی بجلی کی سہولت' قریب ہی مسجد مدرسہ' اسٹیشن بھی قریب' داتا سرکار سے بھی نزدیک--- بہت خوش ہوئے۔ کرایہ بھی مناسب تھا' وہ یہی چاہتے تھے کہ جویریہ جب واپس آئے تو سارے فوراً نئے مکان میں منتقل ہو جائیں--- اتنے دنوں سے رابعہ بھی یہیں تھی۔ شروع شروع میں تو کھنچی کھنچی سی رہی مگر اب یوں محسوس ہوتا تھا کہ آہستہ آہستہ راہ راست پہ آ رہی ہے۔ تھوڑا بہت دوپٹے کا اہتمام بھی کر لیتی' زبان چلانے میں بھی محتاط ہو گئی تھی' ماں باپ کو بھی جی جناب کہنے لگی تھی۔ باتوں باتوں میں ایک دن ماں کو بتانے لگی کہ سلیم بھی کویت جانے کی ضد کر رہا ہے' تایا اس کے ویزے کا بندوبست کر رہے ہیں۔ پھر اس نے ہی بتایا کہ سلیم ایک پولیس کیس میں بھی پھنسا ہوا ہے' پولیس جان خلاصی کے لئے رشوت مانگ رہی ہے اور تایا کی کوشش ہے کہ کسی طرح یہ کیس ختم کرا دیں۔ وہ بدنامی کے خوف سے پولیس کو رشوت دینے کو بھی تیار ہیں لیکن ان کی مانگ کچھ زیادہ ہی معلوم ہوتی ہے۔ سلیم کے بارے میں بھی وہ کچھ صاف ذہن نہیں رکھتی تھی۔ جیسے وہ تذبذب کا شکار تھی اور کھل کر اپنی رائے کا اظہار نہیں کر پاتی تھی۔ نادر اور جویریہ کے بارے میں بھی اس کا رویہ اب تبدیل ہو گیا تھا--- کہتے ہیں صحبت تاثیر' تم تاثیر سے زیادہ پراثر ہوتی ہے اور شائد یہ اسی کا اثر تھا۔ ماں کی وساطت سے سلیم کے بارے میں یہ اطلاعات سبحان چاچا اور نادر تک پہنچیں تو وہ سخت متردد ہوئے' اس موضوع پر وہ دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔

حافظ محمد یوسف اور جویریہ کے واپس آنے سے پہلے پہلے انہوں نے نئے مکان کی صفائی ستھرائی کرانے کے بعد کافی سامان ادھر منتقل کر دیا تھا' ضرورت کے مطابق کچھ نیا سامان بھی خریدا تھا۔ جمعرات کے روز جب وہ لوگ واپس آئے تو گھر کو خالی خالی دیکھ کر سخت متعجب ہوئے' باباجی نے انہیں نئے مکان

کے بارے میں بتایا کہ سامان ادھر بھیج دیا ہے۔ شام کو سب مکان دیکھنے گئے تو جویریہ وہاں جاتے ہی مختلف کاموں میں مصروف ہو گئی' پرانے گھر سے ضروری یا نمائندہ سامان بھی فوری طور پر منگوایا گیا اور رات گئے تک یہ مکان بود و باش کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ سوائے جہیز اور ایک دو بھاری صندوقوں کے علاوہ پرانے گھر میں صرف اللہ کا نام باقی رہ گیا تھا۔ نادر اور باباجی کے علاوہ سب لوگ اسی نئے گھر میں منتقل ہو گئے۔

جمعہ کی نماز سے کافی دیر پہلے جب گاؤں سے وہ لوگ آئے تو یہ گھر پہچانا تک نہ گیا۔ باباجی اور نادر ان کے انتظار میں کیکر کے سائے تلے بیٹھے باتیں کرتے ملے۔ نئے مکان کا سن کر ان کی باچھیں کھل گئیں' خوش ہو کر مبارک دی' نادر ان کو ساتھ لے کر نئے مکان پر آ گیا اور باباجی مزدوروں سے باقی سامان اور جہیز کو لے جانے کا بندوبست کرنے لگے۔

گاؤں والے بھائی اپنے ساتھ شگن کی شیرینی اور کچھ تحفے بھی لائے تھے' بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ انہوں نے آتے ہی جویریہ کو گلے سے لگایا' چوما' دعائیں دیں۔ حافظ محمد یوسف کو پیار کیا' جویریہ کو خوش رکھنے کی نصیحت کی۔ رابعہ کو چاند کا ٹکڑا کہا' بھائی بھابی کو نصیبوں اور مقدروں والے کہا۔ پھر اوپر نیچے مکان کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا اور کھاپی کر اصل مسئلہ لے کر بیٹھ گئے۔ بڑا بھائی بولا۔

"ہاں بھئی' سبحان! اب ہم کس مبارک دن بارات لے کر آئیں؟"

"بھائی جی' آپ کی مرضی ہے--- میری جانب سے کل آ جائیں۔" سبحان چاچا بولا۔

"اپنے' اپنے ہی ہوتے ہیں--- سبحان' تم نے دل خوش کر دیا ہے---" بھابی سونے کی چوڑیوں کو آستین سے باہر سرکاتے ہوئے بولی۔

"سبحان! تم تو مصروف رہتے ہو اور پھر لاہور میں پھنسے ہوئے ہو لہٰذا میں نے تمہاری مصروفیت کو مدنظر رکھتے ہوئے خود ہی پٹواری سے مل کر زمین کی منتقلی کے کاغذات تیار کروا لئے ہیں--- یہ لو!" بڑا بھائی کاغذات بڑھاتے ہوئے بولا۔

سبحان چاچا کاغذات پر سرسری سی نظر ڈال کر نادر کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن اتنی بھی جلدی کیا ہے' شادی کے ساتھ ہی یہ کام بھی ہو جائے گا--- جہیز کی چیزیں تو بیٹی کے ڈولے کے پیچھے پیچھے جاتی ہیں' آگے نہیں---"

"یار---" وہ بڑے پیار اور اپنائیت سے بولا۔ "میں یہاں بہت تھوڑے دن کے لئے ہوں' کام بہت ہیں۔ شادی کے انتظامات میں بھی کافی دن لگیں گے۔ اگر تم دستخط کر دو تو میں کل ہی وہاں بنیادیں کھدوانے کا کام شروع کروا دوں۔"

بھابی بڑے وثوق سے بولی۔ "آج اور کل کیا؟--- جو کام کرنا ہے سو کرنا ہے' ہم غیر تھوڑے ہی

ہیں---"

"سنا ہے سلیم بھی کویت جا رہا ہے---؟" سبحان چاچا ان سنی کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"تمہیں کس نے بتایا---؟" وہ دونوں میاں بیوی اسے گھورتے ہوئے بیک وقت بولے۔

"مجھے بھی معلوم ہو گیا ہے--- اور یہ بھی کہ وہ کسی پولیس کے چکر میں پھنسا ہوا ہے' مجھے بھی تو بتاؤ کہ کیا قصہ ہے؟"

وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ "--- دراصل گاؤں میں کچھ لوگ ہم سے حسد کرتے ہیں' وہ اوپر کے ڈیرے والوں نے ساز باز کر کے سلیم کو ایک لڑکی کے جھوٹے کیس میں ڈال دیا ہے۔ اب پولیس نے ہمارا جینا حرام کر دیا ہے' یہی سوچ کر میں اسے یہاں کے گندے ماحول سے نکال کر کویت لے جانا چاہتا ہوں--- تم سے اس سلسلے میں مشورہ بھی کرنا تھا لیکن اس پریشانی اور ان شادی بیاہ کے چکروں میں موقع ہی نہیں ملا۔"

"یہ تو بتاؤ' یہ سب کچھ تمہیں کس نے بتایا؟" بڑی بھابی نے پھر پوچھا۔

بڑا بھائی جھنجلا کر چیخا۔ "--- تم تو اپنی بکواس بند کرو' ہمیں بات کرنے دو--- آج نہیں تو کل پتہ چلنا ہی تھا۔ کالے چور نے بتایا' تم کیا کر لو گی اس کا---؟"

وہ بچاری سہم کر دبک گئی تو سبحان چاچا نے ایک اور سوال داغا۔

"اس کا مطلب ہے کہ سلیم شادی کر کے کویت چلا جائے گا---؟"

"ہاں--- کیا فرق پڑتا ہے' ہم بھی تو کویت گئے ہوئے ہیں---"

"مگر کیا یہ شادی اس کے واپس آنے پہ نہیں ہو سکتی---؟"

"--- ہو تو سکتی ہے مگر میں صرف اپنے گھر کا رشتہ ہونے کی وجہ سے ایسا کر رہا ہوں--- دراصل کئی اور لوگ سلیم پہ نظر رکھے ہوئے ہیں' اچھا خاصا جہیز اور نقد روپیہ بھی دے رہے ہیں مگر میں لالچی نہیں ہوں' اگر یہ سب کچھ گھر سے ہی مل جائے تو باہر جھانکنے کی کیا ضرورت ہے؟--- تم تو جانتے ہو کہ یہاں کی پولیس کے پھندے میں جو پھنس گیا' وہ ذلیل اور برباد ہو جاتا ہے۔ پولیس والے لاکھ روپیہ رشوت مانگ رہے ہیں' کویتی ہونے کی وجہ سے انہوں نے بھی دام بڑھا دیئے ہیں اور پھر ویزے کے لئے بھی ستر اسی ہزار چاہئے۔ میں بال بچے دار ہوں' اتنی بڑی رقم کا انتظام کیسے کروں؟--- تم میرے اپنے چھوٹے بھائی ہو' اس وقت میری مدد کرو۔ تمہاری ایک ہی بچی ہے' ایک ہی بار اسے دینا ہے۔ تم جہیز میں دو لاکھ روپیہ اور زمین دے دو' ہم دونوں کا بھلا ہو جائے گا---"

نادر کا دماغ خراب ہو چکا تھا مگر سبحان نے اس کے پاؤں کے اوپر اپنا پاؤں دبا کر رکھا ہوا تھا جیسے ٹرک ڈرائیور اترائی پہ پاؤں بریک پہ رکھتے ہیں۔ اس وقت بھی اس نے پاؤں کے دباؤ سے اسے کنٹرول میں رکھا

ہوا تھا ورنہ خدا جانے کیا ہو جاتا--- سبحان نے کمال صبر و تحمل سے جواب دیا۔

"بھائی جی! آپ جانتے ہیں کہ میں معمولی قلی ہوں' اتنا پیسہ کہاں سے لاؤں گا؟--- زمین تو آپ لے لیں لیکن دو لاکھ!--- میں تو اتنی رقم کا تصور بھی نہیں کر سکتا---"

"سبحان! تمہارے پاس پیسے کی کیا کمی ہے' تمہاری تو لاٹری نکل آئی ہے--- حافظ یوسف اب دس لاکھ کا مالک ہے۔ میں بھی آخر تمہارا بھائی ہوں' تمہاری بچی کو سونے کا نوالہ کھلا کر پالا پوسا ہے تو ہمارا بھی کچھ حق ہے--- دس لاکھ میں سے دو لاکھ اگر بچی کے نام کر دو گے تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا اور پھر ہم کون سا کسی سے ذکر کرنے والے ہیں' گھر ہی کی تو بات ہے---"

سبحان نے اپنے پاؤں کے نیچے پھر گڑبڑ محسوس کرتے ہوئے دباؤ بڑھا دیا اور پھر پہلے سے زیادہ تحمل اور انتہائی نرمی سے بولا۔

"بھائی صاحب! وہ تو ایک یتیم کا مال ہے جو ہمارے اور آپ کے لئے حرام ہے---"

"--- حرام' حلال کو چھوڑو۔ انہوں نے یہ روپیہ حافظ کے نام کر دیا ہے' بچی کے نام نہیں اور اب تم ہی اس کے مالک ہو---"

"--- میں ایسا نہیں کر سکتا۔" سبحان چاچا نے قطعیت سے جواب دیا۔

"تو پھر--- پھر یہ رشتہ بھی نہیں ہو سکتا--- ہمارے پاس اور رشتے بھی موجود ہیں جو ہماری شرائط پوری کرتے ہیں---"

"بسم اللہ!--- آپ کے بیٹے کے لئے اگر ایسا کوئی کر سکتا ہے تو آپ بصد شوق وہاں طے کر لیں۔"

سبحان چاچا نے نادر کے پاؤں پر سے پاؤں اٹھا لیا۔ نادر نے زمین کے کاغذات چار ٹکڑوں میں تبدیل کر دیئے اور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سبحان چاچا نے پھر بریک پہ پاؤں رکھ دیا۔

"--- تو آپ کی طرف سے انکار ہے؟" بڑا بھائی پوچھنے لگا۔

"میں کہاں انکار کر رہا ہوں--- بچی حاضر ہے' بیاہ کر لے جاؤ۔ جو میرے پاس اور اختیار میں نہیں' وہاں میں بھی مجبور ہوں۔"

اب بڑی بھابی بڑبڑا کر پھوٹی۔ "میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ تھوڑے میں زیادہ پڑ جائے تو دماغ خراب ہو جاتا ہے--- اب اسے اپنے بہن بھائیوں کی کیا پرواہ ہے' اس کی تو کروڑپتیوں سے رشتہ داریاں ہو گئی ہیں---"

"اسے چھوڑ' یہ تو بکتی رہتی ہے--- تو ایسا کر کہ دو لاکھ نہ سہی' ایک لاکھ روپے کی مدد کر---" بڑا بھائی جیسے سودا بازی پہ اتر آیا۔

"میں تو ایک پیسہ بھی نہیں دے سکتا--- بچی کا رشتہ اور زمین حاضر ہے۔"

"ٹھیک ہے--- تو نہیں مانتا تو نہ مان--- تو اپنے گھر راضی' ہم اپنے گھر--- لیکن یہ زمین تو مجھے دے دے' میرا مکان کھلا ہو جائے گا۔"

"زمین' آسمان کا مالک تو اللہ ہے--- ہمارا باپ زندہ ہے اور میں اس کی زندگی میں کون ہوتا ہوں جو تقسیم کروں؟--- باپ کے پاس جاؤ' وہ تمہیں سب کچھ دے دے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا---"

بڑا بھائی چاروں شانے چت گرا ہوا اب اپنی اوقات پہ آگیا' کہنے لگا۔ "تم ایسا بے غیرت انسان میں نے نہیں دیکھا--- جوان بیٹی کو ہمارے ٹکڑوں پہ بٹھا رکھا ہے اور دولت بٹورنے کے لئے جمعراتی حافظ کی شادی انڈیا کی سکنی سے کر دی۔ اب سنبھال اپنی بیٹی کو' چاہے تو اسے بھی دس بیس لاکھ کے عوض کسی سکھ سے بیاہ دینا---"

سبحان نے پورا بوجھ نادر کے پاؤں پہ ڈال رکھا تھا۔ کانوں کے راستے ابلتا ہوا سیسہ اس کے دل تک آ پہنچا تھا' زبان دانتوں تلے دبی ہوئی تھی اور نگاہیں سامنے دیوار پر لٹکے ہوئے داتا سرکار کے روضے والے کیلنڈر پر جمی ہوئی تھیں--- معا" ہجویریہ کمرے سے باہر آئی' اسلام علیکم کہہ کر بڑے ادب سے بولی۔

"آپ کو روپوں کی ضرورت ہے' میں آپ---"

سبحان چاچا دھاڑا۔ "ہجویریہ بیٹی! مزید ایک لفظ کے بغیر واپس اندر چلی جاؤ---"

اس کے اندر جاتے ہی یہ لوگ بھی قطع تعلق کی دھمکی دے کر اور گالیاں' کوسنے طعنے دیتے ہوئے باہر نکل گئے--- طوفان گزر گیا تھا مگر اپنی ذہنیت' گالیوں' طعنوں اور بد مزگی کے اثرات چھوڑ گیا تھا۔ سبحان چاچا ابھی تک کلینڈر کے روضے مبارک پر نظریں جمائے' ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ نادر پہ لرزہ طاری تھا۔ ہجویریہ' رابعہ آہستہ سے باہر نکلیں' پانی کا جگ بھر کر سامنے رکھا۔ حافظ محمد یوسف دالان کے تخت پہ بیٹھا تھا' نیچے اتر آیا' اپنی گم صم ماں کے پاس آبیٹھا--- اسی لمحے بابا جی بھینس کی زنجیر تھامے اندر داخل ہوئے۔ مزدور پیچھے پیچھے ریڑھوں پر سامان لئے چلے آ رہے تھے' اندر داخل ہوتے ہی ٹھٹک گئے۔

"پتر نادر! آج تو اللہ نے ہی بچایا ہے ورنہ ایک ویگن والا تو اپنی طرف سے مجھے مار کر ہی چلا گیا تھا---"

سبحان چاچا ادھر دیکھے بغیر ہی بولا۔ "ہمیں بھی آج اللہ نے داتا سرکار کے صدقے میں بچا لیا ہے ورنہ ہم بھی مارے گئے تھے۔"

ہجویریہ اور رابعہ نے اپنے کمرے سے باہر ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سن لیا تھا' کیا مجال جو ہجویریہ کے ماتھے پہ کوئی شکن بھی ابھری ہو۔ دونوں نہایت سعادت مندی سے سبحان کے پاس چارپائی کی پٹی پہ آ کر بیٹھ گئیں' البتہ رابعہ کے چہرے پر ناگواری اور فکر مندی کی ملی جلی گرد جمی ہوئی تھی۔ ہجویریہ نے نہایت سکون' ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

"چاچا!--- بھول جاؤ' جو بھی ہوا۔ اپنوں میں یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ یقین کرو' مجھے کچھ بھی برا نہیں لگا---"

سبحان چاچا اس کا ہاتھ پکڑ کر رونے لگا۔ "بیٹی! مجھے کچھ بھی کہہ لیتے' میں ان کا چھوٹا بھائی تھا لیکن جو کچھ تمہارے بارے میں انہوں نے کہا ہے وہ انہیں زیب نہیں دیتا تھا--- ہجویریہ بیٹی! میں بہت شرمندہ ہوں' اللہ مجھے معاف کرے۔ تم بھی مجھے معاف کر دو--- خدا جانتا ہے کہ وہ تمہیں نہیں جانتے اور جانتے ہوتے تو یہ سب کچھ کبھی نہ کہتے---"

"میں جانتی ہوں چاچا! اسی لئے کہتی ہوں کہ انہیں معاف کر دیں--- وہ بھی ہمارے بزرگ ہیں' بڑے ہیں۔ ان کی بات دل پہ نہیں لگانا چاہیے--- اللہ نے جو کیا' یقیناً اسی میں کوئی نہ کوئی بہتری ہوگی---"

رابعہ اپنا سر باپ کے کاندھے پہ ٹکا کر بولی۔ "چاچا! دل میلا نہ کرو' میں جانتی ہوں کہ آپ اور نادر بھی مجھ سے خفا ہیں--- مجھے معاف کر دیں کہ میں نے آپ کا دل دکھایا ہے' آئندہ آپ کو کوئی شکایت نہ ہوگی--- میں نے بھابی سے وعدہ کر لیا ہے کہ آئندہ دوپٹہ لیا کروں گی---"

سبحان نے ساون بھری آنکھوں سے دونوں کو دیکھا' دائیں بائیں دونوں کے شانوں پہ ہاتھ رکھے سر جھکا کر بیٹھ گیا--- نادر اٹھ کر باہر جانے لگا۔

"---کہاں جا رہے ہو؟"

"جہاں مجھے کوئی اس حالت میں نہ دیکھ سکے جو تم نے بنا رکھی ہے---"

سبحان نے بازو پھیلا دیئے اور نادر گولی سی تیزی کے ساتھ سینے سے آن لگا--- ساون بھادوں اکٹھے برس رہے تھے۔

●●

رابعہ اکثر بجھی بجھی' خاموش سی رہتی تھی گھر والوں کا یہی خیال تھا کہ نئی جگہ' نئے ماحول' نئی تبدیلیوں کی وجہ سے اداس اداس رہتی ہے۔ گھر میں کھانے پینے اور دیگر سہولتوں کی کوئی کمی نہ تھی سوائے ٹیلی ویژن' وی سی آر' فریج اور ماڈرن فرنیچر کے--- ہجویریہ نے محلے اور ارد گرد کے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ ہر وقت رونق رہتی' کچھ لڑکیاں بالیاں کڑھائی' سینا پرونا اور دیگر خانہ داری سیکھنے بھی آتیں۔ ہجویریہ سب کچھ فی سبیل اللہ کرتی بلکہ اکثر ان کے لئے کھانا پینا بھی پیش کر دیتی اور ایسی رونق میں رابعہ کے اداس اور چپ رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اکثر اس کا چہرہ دھواں ہو جاتا جیسے جلتی بھڑکتی لکڑی پر پانی پھینک دیا جائے۔ ایسے میں وہ سر درد یا پیٹ درد کا بہانہ لے کر چادر اوڑھے گھنٹوں پڑی رہتی۔

اس روز وہ صبح سے اپنی بے کلی اور ابکائیاں چھپاتی پھر رہی تھی۔ جویریہ نے کئی بار پوچھا کہ کیا بات ہے' کیا تکلیف ہے مگر وہ یہی کہتی کہ طبیعت خراب ہے' دل گھبرا رہا ہے۔۔۔ نادر گھر آیا تو جویریہ نے اس سے کہا۔

"نادر بھائی! رابعہ کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ' یہ بیمار ہے۔۔۔ میرا خیال ہے اسے انفلوائنزا کی شکایت ہو گئی ہے۔"

رابعہ برقع اوڑھے اس کے ساتھ باہر چلی گئی۔ سڑک پر پہنچ کر اس نے نادر سے کہا۔

"یہاں سے تانگہ پکڑو اور یادگار چلو۔۔۔"

"خیریت۔۔۔ ڈاکٹر کے پاس نہیں چلو گی؟"

"۔۔۔ چلوں گی مگر پہلے یادگار چلو' میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا وہ باتیں گھر میں نہیں ہو سکتیں۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔ یہ باتیں وہیں ہو سکیں گی۔"

وہ لمبی سی "ہوں" کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ شائد گھر پڑے پڑے گھبرا گئی ہے۔

"گھر میں بتا دیتیں تو جویریہ کو بھی لے آتے۔" وہ بولا۔

"نہیں۔۔۔ مجھے اکیلے میں تم سے کچھ کہنا ہے۔"

"اچھا' چلو۔۔۔"

وہ یادگار پہنچ کر مینار کے سامنے پتھر کی دیوار پر بیٹھ گئے۔ ارد گرد بہت سے بچے کھیل رہے تھے' ایک ننھا سا بچہ ان کے پاس آ گیا۔

"کتنا پیارا بچہ ہے۔۔۔" نادر نے بچے کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں' بہت ہی پیارا۔۔۔" چہرے سے نقاب ہٹا کر وہ بچے کو پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی' اس کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔

"ہائیں۔۔۔ تم رو رہی ہو رابعہ!۔۔۔ خیریت؟"

"خیریت ہی تو نہیں نادر۔۔۔!"

"اللہ نہ کرے۔۔۔ میرا خیال ہے تمہیں گاؤں کی سہیلیاں اور تایا' تائی بہت یاد آ رہے ہیں۔۔۔ کہو تو چاچا سے کہہ کر کچھ دنوں کے لئے گاؤں بھجوا دوں؟"

"نہیں' میں اب گاؤں کبھی نہیں جانا چاہتی۔ اس گاؤں اور تایا تائی کے گھر نے مجھے برباد کر دیا ہے۔۔۔" وہ نقاب ڈال کر پھر سسک سسک کر رونے لگی۔

نادر نے ادھر ادھر دیکھا' بڑے آرام سے کہنے لگا۔ "یہ پارک ہے۔۔۔ رونا دھونا چھوڑو اور کام کی بات کرو۔۔۔ گھر بھی جانا ہے۔"

"نادر! میں بہت شرمندہ ہوں' مجھ سے ایک بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں' چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور صرف تمہاری ذات ہی میرے لئے امید کی آخری کرن ہے۔۔۔ نادر! آج میں تم سے ایک ایسی بات کہنا چاہتی ہوں جو کسی اور کو نہیں بتا سکتی اور میں یہ بھی نہیں جانتی' میری بات سن کر تمہارا ردعمل کیا ہو گا۔۔۔؟" وہ بات کرتے کرتے رکی' پھر بولی۔ "مگر۔۔۔ مگر ایک بات کا مجھے پکا یقین ہے کہ صرف تم ہی ہو جو میری مدد کر سکتے ہو؟"

"پہیلیاں نہ بجھواؤ' سیدھی بات کرو تحمل اور آرام سے۔۔۔ اگر تمہیں یقین ہے' میں تمہاری مدد کروں گا تو بلا جھجک و خوف کم سے کم الفاظ میں اپنی مشکل بیان کرو۔" وہ مینار پاکستان سے نظریں ہٹا کر بڑی تشویش سے دختر پاکستان کو دیکھنے لگا۔

وہ اپنے ہاتھوں سے برقعے کے کنارے کو مروڑتے ہوئی نحیف سی ممیاتی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے برباد ہونے سے بچا لو نادر!۔۔۔ میرا گناہ میرے وجود کے اندر اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگا ہے۔۔۔"

وہ سسکیاں لینے لگی۔۔۔ نادر نے سبحان چاچا سے ایک سبق سیکھا تھا کہ حالات اور جذبات خواہ کیسے بھی ہوں' صبر و تحمل اور ہوش و خرد کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے' اس طرح ہمیشہ جیت ہوتی ہے۔ اس خوبصورت بات یا نصیحت کا عملی مظاہرہ وہ کئی بار دیکھ چکا تھا۔۔۔ گو اس کے اندر ایک دھماکا ہو چکا تھا' یہ بات سن کر وہ لرز گیا تھا مگر یہ نصیحت یاد آتے ہی وہ نارمل ہو گیا اور کمال تحمل اور آہستگی سے پوچھا۔

"اس ذات شریف کا نام' اتا پتہ۔۔۔؟"

"میرے تایا کا بیٹا۔۔۔ سلیم!"

دونوں جانب دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر وہ خود ہی ممیائی۔

"اس کے کویت بھاگنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔۔۔"

"رابعہ! تم تو سمجھ دار اور بھلے برے کی تمیز رکھنے والی ہو' اس کے باوجود یہ غلطی۔۔۔ جانتی ہو کہ اس کا نتیجہ کیا نکل سکتا ہے؟۔۔۔ تمہیں اپنے شریف عزت دار ماں باپ کا خیال بھی نہ آیا' انہیں جب پتہ چلے گا تو کیا ہو گا' ان پہ کیا گزرے گی؟"

وہ ارد گرد کی پرواہ کئے بغیر' باقاعدہ رونے لگی۔ نادر نے اسے وہاں سے اٹھایا اور وہ دونوں جھیل کے پاس ایک بنچ پہ بیٹھ گئے۔

"نادر! میں بڑی بے وقوف نکلی۔۔۔ یقین کرو' میرا کوئی قصور نہیں اور نہ ہی میں ایسی گندی ذہنیت کی لڑکی ہوں۔ اس ظالم بدکار نے میرے ارد گرد ایسا جال بن دیا تھا جیسے مکڑا مکھی کو پھانسنے کے لئے تیار کرتا

ہے--- ساتھ والے گاؤں میں کوئی سیانا حکیم آیا ہوا تھا۔ تائی' رخسانہ کے پتے کی پتھری کے لئے دوا لینے رخسانہ اور فہمیدہ کے ساتھ وہاں چلی گئیں' گھر میں دادی اور میں رہ گئیں۔ پہلے بھی کئی بار ایسا ہوا کہ میں گھر اکیلی رہتی تھی' سلیم بھی ہوتا تھا لیکن اس دفعہ اس نے دادی کو بھائی یوسف کے پاس پانی دم کرانے کے بہانے مسجد بھیج دیا' اس کو علم تھا کہ دادی گھنٹہ' دو گھنٹے سے پہلے واپس نہیں آئیں گی کیونکہ وہ راستے میں سب سے ملتی ملاتی' باتیں کرتی رہتی تھیں۔ دادی کے جاتے ہی وہ مجھ سے کہنے لگا کہ آج میں اپنا ای لائی ہوئی کافی بناتا ہوں' دونوں پئیں گے۔ میں ٹیلی ویژن دیکھ رہی تھی' اس نے خود ہی باورچی خانے میں جا کر کافی بنائی--- کالی' بدمزہ سی کافی! میں نے کہا بھی کہ اس میں دودھ اور چینی ملاؤ مگر وہ کہنے لگا کہ کافی ایسے ہی پیتے ہیں' زبردستی اس نے پورا کپ پلا دی--- اس کے بعد کیا ہوا' مجھے کچھ علم نہیں--- ہوش آیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں برباد ہو چکی ہوں--- مرتی کیا نہ کرتی' اپنی اور باپ کی بدنامی کے خوف سے چپ ہو گئی' نہ کسی کو بتا سکتی تھی اور نہ رو سکتی تھی۔ اسے یہ علم تھا کہ ہم دونوں کی شادی ہونے والی ہے۔ بعد میں کئی دفعہ اس نے اکیلے میں میری کمزوری کا فائدہ اٹھایا۔ جب بھی میں نے احتجاج کیا یا سمجھانے کی کوشش کی تو یہی کہتا کہ بس' جلد ہی ہماری شادی ہو جائے گی۔ ایک بار اس نے مجھے کوئی دوا بھی لا کر دی کہ یہ کھانے سے سب ٹھیک ہو جاتا ہے مگر کسی انجانے خوف کی وجہ سے میں وہ دوا نہ کھاتی تھی---"

وہ رک گئی' پھر کہنے لگی کہ میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ نادر اٹھا' قریب دوکان سے جوس کا ڈبہ لے آیا' جوس پینے کے بعد بولی۔

"اس دوران مجھے گاؤں کی چند لڑکیوں سے اس کی کالی کرتوتوں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوا' یہ جو پولیس کیس بنا ہے' یہ بھی اسی طرح کا ہے۔ گاؤں کی انتہائی شریف لڑکی جو بدقسمتی سے گاؤں بھر میں سب سے زیادہ خوبصورت بھی تھی' پہلے اس کے بھائی کے ساتھ دوستی گانٹھی اور آہستہ آہستہ اس کے گھر آنا جانا شروع کیا۔ پھر کسی طرح اس کی تصویر حاصل کر کے اپنی تصویر کے ساتھ جڑوا کر اس تک پہنچائی' اس طرح بلیک میل کر کے اس کی عزت لوٹی۔ اسی خوف اور دہشت سے وہ بیچاری نیم پاگل سی ہو کر خودکشی کر گئی--- بات دب جاتی اور اصل وجہ کسی کو معلوم بھی نہ ہوتی مگر ایک دن اس کی ماں کو گھر کی لپائی کرتے ہوئے لڑکی کے کمرے کی کسی طاق سے سلیم کی دھمکیوں والے خط اور تصویریں مل گئیں۔ اس مرنے والی کا ایک ہی بھائی تھا' باپ پہلے ہی مر گیا تھا۔ غریب لوگ تھے' مزید بدنامی کے خوف سے خاموش ہو گئے۔ اسی دوران سلیم نے ایک اور لڑکی کو ہاتھ ڈالا' وہ لڑکی مرنے والی کی سہیلی تھی اور ساری حقیقت سے واقف تھی۔ اس نے انتقاماً سلیم کے خط اور جعلی تصویریں' خودکشی کی اصل وجہ مع ثبوت' گمنام بن کر پولیس کے بڑے افسر کو بھیج دیئے' اب پولیس سلیم اور تائے کو بلیک میل کر رہی ہے---"

وہ رکی' آنسو پونچھ کر پھر کہنے لگی۔ "نادر! مجھ میں اور مرنے والی میں صرف خودکشی کا فرق ہے---

"اب تم کیا چاہتی ہو---؟" نادر گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "جلدی بتاؤ' بہت دیر ہو گئی ہے---"

وہ خلاؤں میں گھورتی ہوئی اک لمبی سانس بھر کر بولی۔ "ہاں نادر' بہت دیر ہو گئی ہے اور اسی لئے تو تمہیں یہاں لائی ہوں کہ کم از کم تمہیں تو میری خودکشی کی اصل وجہ معلوم ہو---"

"---تو تم خودکشی کرنا چاہتی ہو---؟" نادر اندر سے کانپ سا گیا۔

"ہاں' اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی تو نہیں--- میرا باپ' میری ماں چند روز رو پیٹ کر صبر کر لیں گے۔ میں موجودہ حالت میں ان کے سامنے آتے ہوئے بھی گھبراتی ہوں' یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا چھپایا ہوا' میرا ڈھانپا ہوا سب کچھ انہیں دکھائی دے رہا ہے---" پھر اپنے ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ "اس سے پہلے کہ میرا باپ خود مر جائے یا سلیم کو مار دے' میں خود ہی مر جانا چاہتی ہوں۔"

"حرام موت مرو گی--- ایک گناہ کے بعد دوسرا گناہ---؟"

"حرام زندگی سے حرام موت بہتر ہے--- کاش! میں اس حرامزادے کو اپنے ساتھ لے کر مر سکتی جس نے جیتے جی مجھے مردوں سے بدتر بنا دیا ہے---"

"ایک بات کہوں' برا تو نہیں مانو گی---"

"نادر! آج جی بھر کر جو کہنا ہے' کہہ ڈالو۔ اچھا برا ماننے کا وقت گذر چکا ہے--- کہو؟" وہ زیر لب مسکرائی۔

"جن کی آنکھوں کا پانی مر گیا ہو ان کے جینے' مرنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا--- جو لڑکی یا عورت اپنا سر سینہ' منہ' بازو کھول کر سر عام محرم' نامحرموں میں دندناتی پھرے تو اس کا حشر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس میں مردوں کا کیا قصور؟--- ڈھکی چھپی' پردے میں مستور چیز کے محفوظ رہنے کا امکان تو ہوتا ہے مگر ننگی کھلی چیز کو انسان تو کیا' کتا بھی منہ مارنے سے نہیں ڈرتا۔ عزت کی طرح عفت اور عصمت کی حفاظت بھی اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے--- تم اب اپنے انجام کو پہنچ گئی ہو۔ اس سیدھی سڑک پہ راوی دریا ہے' بسم اللہ کرو--- سبحان چاچا' چاچی یا کسی اور کے لئے کوئی پیغام ہو تو دیتی جاؤ' میں پہنچا دوں گا--- اور ہاں' چھلانگ لگانے سے پہلے برقع اتار لینا' ہوا میں یہ پیراشوٹ اور گہرے پانی میں یہ ہوا بھری ٹیوب بن جاتا ہے---"

"میری جان پہ بنی ہے اور تم میرا مذاق اڑاتے ہو' طعنے دیتے ہو۔ یہی تمہاری ہمدردی ہے---؟" وہ منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

"رابعہ!--- اب مذاق ہی ہو گا' سنجیدگی جب انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو پھر مذاق ہی تو باقی رہ جاتا ہے--- بتاؤ' مذاق نہ کروں تو کیا کروں' اب باقی کیا بچا ہے---؟" وہ آسمان پہ تیرتے ہوئے بادلوں کو گھورتے ہوئے بولا۔

"نادر---!" وہ ناخنوں سے نیل پالش کھرچنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ---" وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

"بولو--- رک کیوں گئی ہو؟"

"اس اسٹیج پہ یہ داغ مٹ سکتا ہے--- میرا مطلب ہے کہ یہ ضائع ہو سکتا ہے۔"

"گناہ در گناہ--- بڑا سخت جرم بھی ہے اور جان کا خطرہ بھی--- یہ تو قتل ہے۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "اچھا' خدا حافظ--- نادر! میرے والدین پہ یہ سب کچھ کبھی ظاہر نہ کرنا اور تم بھی میرا کہا معاف کر دینا۔"

"کوئی پیغام' کوئی آخری خواہش---؟" نادر پوچھنے لگا۔

"کوئی پیغام نہیں' کوئی خواہش نہیں--- ہاں' اگر ہو سکے تو تھوڑی دور ساتھ چلو۔" وہ برقع سنبھالتے ہوئے بولی۔

چلتے چلتے وہ راوی روڈ پر آ گئے' کوئی آدھا میل اور چلے ہوں گے تو رابعہ بولی۔

"نادر!--- کاش' ہم یونہی چلتے رہیں--- راستے میں کوئی سلیم نہ ہو اور آگے کوئی راوی نہ ہو--- تمہیں کچھ یاد ہے کہ تم میرے لئے ایک برقع لائے تھے--- یہ وہی برقع میں پہنے ہوئے ہوں---"

"ہوں--- پھر؟"

"تمہاری خواہش تھی نا' کہ میں یہ برقع پہنوں؟"

"ہاں--- پھر؟"

"--- پھر یہ تم نے مجھے اور میرے عیبوں کو ڈھانپ دیا' میں تمہاری احسان مند ہوں---"

"تم نے ابھی ابھی ایک بات کہی تھی کہ کاش' ہم دونوں اسی طرح ساتھ ساتھ رہیں---"

"ہاں' کہی تھی---"

"میرے ساتھ چلو گی---؟"

"کہاں---؟"

"جہاں میں لے چلوں--- مجھ پہ اعتماد ہے؟"

"مجھے تم پر پورا پورا بھروسہ ہے---" وہ بولی۔

"مجھے ایک راستہ دکھائی دیا ہے لیکن وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ راستہ ہمیں منزل تک لے جائے گا یا نہیں--- کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں' باقی جو اللہ کو منظور!"

"نادر! اس راستے پہ چلنے سے پہلے ایک بار پھر غور کر لو کہ تم اس راستے پہ میرا بوجھ اٹھا سکو گے' جبکہ بوجھ میں بھی اک اور بوجھ ہے---؟"

"رابعہ! میں نے یہ مسئلہ اس دربار میں پیش کر دیا ہے' جس دربار کا میں قلی ہوں--- میرا کام بوجھ اٹھانا ہے۔ یہ دیکھنا اور پوچھنا نہیں کہ یہ بوجھ کیسا ہے' اندر کیا ہے اور اس کے اندر کیا ہے---؟"

●●

مغرب کی نماز سے ذرا پہلے وہ فیصل آباد حاجی صاحب کے ہاں پہنچ چکے تھے' ان کے آنے سے انہیں بے پناہ مسرت ہوئی۔ لاہور میں سب کا حال احوال پوچھا۔ حاجی صاحب نے اسے کچھ فکر مند دیکھ کر' مسکرا کر پوچھا کہ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو--- یوں بھی ان کی حالت یہ تھی جیسے گھر سے سیر کرنے نکلے ہوں۔ کوئی سفری سامان' نہ کوئی بیگ' نہ تھیلا--- نادر ہلکے سے مسکرا دیا لیکن اس کی مسکراہٹ میں بھی پریشانی کی ہلکی سی جھلک نمایاں تھی جو حاجی صاحب کی تجربہ کار نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

"حاجی صاحب! آپ میرے والد کی جگہ ہیں' مجھ سے اور میرے خیالات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس وقت میں ایک انتہائی سنجیدہ معاملے میں آپ کی سرپرستی حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں--- معاملے اور حالات کی نوعیت ایسی ہے کہ میں آپ سے زیادہ کسی اور پہ اعتماد بھی نہیں کر سکتا اور نہ ہی ان حالات میں میری کوئی مدد کر سکتا ہے۔"

اسی دوران رابعہ اور دوسرے تمام لوگ اٹھ کر اندر چلے گئے۔ حاجی صاحب نے اس کے کاندھے پہ شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹے! تم صحیح جگہ پہ آئے ہو--- جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہو' بلا خطر اور کم و کاست کہہ ڈالو۔"

وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "اصل بات کہنے سے پہلے ایک عرض کرنا چاہتا ہوں' ہے تو وہ گستاخی لیکن میری مجبوری ہے اور حالات کا بھی تقاضا یہی ہے--- آپ مجھ سے میرے عمل یا فیصلے کی وجہ سردست دریافت نہیں فرمائیں گے' وقت پہ آپ سب کچھ جان جائیں گے۔"

حاجی صاحب کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "ٹھیک ہے' تم سے کچھ بھی نہیں پوچھا جائے گا--- اب بولو' اصل بات کیا ہے؟"

"میں رابعہ سے اسی وقت آپ کی سرپرستی میں نکاح کرنا چاہتا ہوں---"

حاجی صاحب کی آنکھیں پھیل گئیں' چند لمحے اسے گھورتے رہے پھر ہلکے سے مسکرائے اور بولے۔

"بے شمار سوالات' خدشات میرے ذہن میں کلبلا رہے ہیں لیکن مجھے اپنا وعدہ یاد ہے' میں تم سے کوئی سوال نہیں کروں گا--- کوئی اور حکم---؟"

نادر انتہائی سعادت مندی سے نیچے بیٹھ گیا' پاؤں پکڑ کر کہنے لگا۔ "اللہ آپ کا دین دنیا میں بھلا کرے' اس وقت آپ نے سرپرستی فرما کر مجھے اور رابعہ کو نئی زندگی بخشی ہے--- اسی سلسلے میں کچھ اور بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ نکاح کے بعد کم از کم سال ڈیڑھ سال کے لئے ہم دونوں سبحان چاچا اور دیگر تمام گھر

والوں سے پوشیدہ رہنا چاہتے ہیں۔ آپ مہربانی سے کہیں بہت دور ہماری روزی کے وسیلے کا بندوبست فرمادیں۔"

وہ بات کاٹتے ہوئے پوچھنے لگے۔ "یہ تو سب ہو جائے گا لیکن ایک بات کا جواب دو' اگر میرا یہ سوال تمہاری شرط کی زد میں نہ آتا ہو تو۔۔۔"

"فرمائیں۔۔۔" وہ بولا۔

"تم سبحان چاچا کو اچھی طرح جانتے ہو۔۔۔ اس ساری کارروائی' میرا مطلب ہے کہ تمہاری اور رابعہ کی اچانک گمشدگی کا نتیجہ کیا نکلے گا' تمہارے اور اپنی بیٹی کے بارے میں وہ کیا رائے قائم کریں گے۔ ان کے حساس دل پہ کیا بیتے گی' اپنے بیگانوں کو کیا جواب دیں گے' رابعہ کی ماں اور جویریہ' حافظ صاحب پہ کیا گذرے گی۔۔۔ ان باتوں پہ تم نے غور کرلیا ہے؟"

"مجھے ہربات اور ہر ردعمل کا پورا پورا احساس ہے مگر۔۔۔" اچانک کچھ کہتے کہتے وہ رک گیا اور پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "مگر جہاں زندگی اور موت کا سوال ہو تو وہاں شاید یہ سب کچھ اتنا اہم نہیں رہتا اور دوسری جانب ضمیر مطمئن ہو' اللہ دیکھ رہا ہو' نیتوں کا حال جانتا ہو تو انسان سب کچھ اسی کی رضا اور صوابدید پر چھوڑ دیتا ہے اور شائد آزمائش اسی کو کہتے ہیں۔۔۔ حاجی صاحب! میرے لئے دعا فرمائیں' میں بھی اس آزمائش میں پورا اتروں۔ اس مشکل مرحلے پہ آپ نے ہی سبحان چاچا اور گھر والوں کو سنبھالنا ہے' ان کو ٹوٹنے نہیں دینا۔ آپ کچھ ایسا انداز اختیار فرمائیں کہ وہ مطمئن ہو جائیں۔ انہیں یہ یقین اور تسلی ہو جائے کہ ہم نے شادی کرلی ہے لیکن کسی مصلحت یا مجبوری کی وجہ سے دور رہ رہے ہیں۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سب کچھ سنبھالنا اور سبحان چاچا کی تسلی کرنا آپ کے لئے مشکل نہیں ہے۔"

اس گفتگو کے ایک گھنٹے بعد نادر اور رابعہ کا نکاح ہو گیا۔ یہ رات فیصل آباد میں بسر ہوئی۔ صبح نادر' رابعہ' چھوٹی صاحبزادی' صاحبزادہ محمد شفیق کوئٹہ روانہ ہو گئے۔ حاجی صاحب کا وہاں کپڑے کا ہول سیل اسٹور اور گودام تھا۔ ایران اور بلوچستان کے گردونواح میں کپڑا یہیں سے بھیجا جاتا۔ اسی اسٹور کے اوپر دو کمروں کا فلیٹ ان کے لئے خالی کروادیا گیا' کپڑے کی ترسیل اس کے سپرد کرکے معقول تنخواہ مقرر کردی گئی۔ گھر کا سارا ضروری سامان' کپڑے' برتن' فرنیچر کا انتظام کردیا گیا۔۔۔ ادھر فیصل آباد میں حاجی صاحب ان کو روانہ کرنے کے بعد کچھ مطمئن تو ہو گئے لیکن پھر بھی کئی ایک باتیں ایسی تھیں جو انہیں بے چین کئے ہوئے تھیں۔ سبحان چاچا کی لاعلمی میں اتنی عجلت میں نکاح' سال ڈیڑھ سال لاپتہ رہنا۔۔۔ اپنی فہم و فراست سے انہوں نے کچھ اخذ تو کرلیا لیکن حتمی طور پہ کچھ اب بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ نادر کے بارے میں وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ نوجوان کبھی کسی کے اعتماد کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ اپنی ہٹ اور قول کا پکا ہے' خدمت خلق کو جزو ایمان سمجھتا ہے۔ لالچی اور حریص نہیں' کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتا۔ جویریہ جیسی لڑکی کو آسانی سے قبول کرسکتا تھا' اس کی دولت لے سکتا تھا مگر اس نے جویریہ کو بہن سمجھ کر اپنے ہاتھوں اس کی شادی کردی' اس کی دولت اسے لوٹا دی۔ یہ شخص انسان نہیں' فرشتہ ہے اور یقیناً رابعہ کسی مشکل میں پھنس گئی ہوگی ورنہ نادر اپنے محسن کی بیٹی سے نکاح نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے اپنی قربانی دے کر رابعہ کو کسی بڑی مصیبت سے بچایا ہے' نادر کا یہ انتہائی قدم یقیناً کسی بڑے حادثے کے بعد اٹھا ہے۔۔۔ حاجی صاحب کو سبحان چاچا اور اس کے بھائیوں کے باہمی تعلقات' اختلافات' تضادات کا بخوبی علم تھا' سلیم کے بارے میں بھی سب کچھ جانتے تھے۔۔۔ سلیم کا خیال آتے ہی ان کے دماغ میں بجلی سی کوندی اور دل ہی دل میں انہوں نے واقعات کی آپس میں کڑیاں ملانی شروع کیں۔ فوری نکاح پہ اصرار' کوئی سوال نہ کرنے کی درخواست' سال ڈیڑھ کا عرصہ' دونوں کا اکیلے بے سروسامان بے وقت آنا' لاپتہ رہنا۔۔۔ وہ فوری طور پر لاہور جانے کی تیاری کرنے لگے۔

لاہور پہنچے تو عین توقع کے مطابق گھر والے سارے پریشان تھے' دو دن سے چولہا ٹھنڈا پڑا تھا۔ اسپتال' تھانے' داتا دربار جہاں کہیں بھی ان کی موجودگی کا شبہ تھا وہ سب جگہیں چھان ماریں' گاؤں سے بھی پتہ کروایا مگر ان کا کہیں سراغ نہ ملا تھا۔ جویریہ کے کہنے کے مطابق وہ ڈاکٹر حکیم کے پاس گئے تھے' آس پاس کے ڈاکٹر حکیموں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ چاچی اور بابا جی مصلیٰ بچھائے آہ و زاری کررہے تھے' سبحان چاچا اور حافظ جی پریشان جوان بیٹی اور نادر کی گمشدگی پہ قیاس آرائیاں کررہے تھے۔ حاجی صاحب کو دیکھا تو جان میں جان آئی۔۔۔ حاجی صاحب نے انہیں پریشان دیکھا تو پوچھا کہ خدا خیر کرے' آپ لوگ اس طرح چپ چاپ سے کیوں بیٹھے ہیں؟ سبحان چاچا نے نادر اور رابعہ کی گمشدگی کا تمام واقعہ گوش گزار کردیا۔

"بھئی' حد ہو گئی۔۔۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ وہ بچے تھوڑے ہی ہیں جو بھیڑ بھاڑ میں کہیں گم ہو جائیں گے' یہیں ادھر ادھر کہیں چلے گئے ہوں گے اور ہو سکتا ہے گاؤں چلے گئے ہوں۔۔۔"

"حاجی صاحب! اصل فکر تو رابعہ کی ہے' وہ کچھ بیمار تھی۔۔۔ خدا نہ کرے کہیں زیادہ تکلیف نہ ہو گئی ہو' کم از کم انہیں گھر اطلاع تو کرنا چاہیے تھی۔۔۔"

"ہاں' یہ تو تم درست کہہ رہے ہو لیکن اگر اتنی ذمہ داری بچوں میں ہو تو انہیں بچہ کون کہے؟۔۔۔ گھبراؤ مت' آجائیں گے۔۔۔ کچھ کھلاؤ پلاؤ یار! سفر کرکے آیا ہوں۔۔۔"

جویریہ نے کہا۔ "میں ابھی کھانا تیار کرتی ہوں' انہیں بھی کھلائیں۔۔۔ دو روز سے کسی نے کچھ نہیں کھایا۔"

"جلدی کرو بیٹی' بڑی سخت بھوک لگی ہے۔۔۔ ہاں تو سبحان بھائی! میں دراصل ایک ضروری کام سے آیا تھا اور یہ کام صرف تم ہی کرسکتے ہو۔۔۔"

"حکم کریں حاجی صاحب!--- جان بھی حاضر ہے۔"

"سبحان بھائی! ہم اپنے بیٹے اور بیٹی کے لئے رشتہ لینے آئے ہیں---"

"رشتہ لینے---؟" وہ حیران ہوتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"ہاں بھائی' رشتہ لینے--- حیران کیوں ہو گئے ہو؟"

"میں جہاں تک جانتا ہوں' آپ کے بیٹوں کی منگنیاں طے ہو چکی ہیں اور بیٹیاں ابھی کم سن ہیں---"

"مگر ایک بیٹے کی منگنی ابھی تک نہیں ہوئی اور ایک بیٹی بھی جوان ہے---"

"حاجی صاحب! کھل کر بات کریں' میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا---"

"بھائی! اپنے بیٹے نادر اور بیٹی رابعہ کا ذکر کر رہا ہوں---"

سبحان چاچا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا' حاجی صاحب نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"پریشان کیوں ہوتے ہو بھائی! میں نے کوئی انوکھی یا انہونی بات نہیں کی ہے۔ جہاں جوان بیٹیاں' بیٹے ہوتے ہیں تو لوگ رشتے ناتوں کے لئے آتے ہی ہیں اور آج میں بھی یہ درخواست لے کر آیا ہوں--- نادر کو اپنی فرزندی میں قبول کر لو۔"

"--- نہ نادر کی خبر' نہ رابعہ کا پتہ' پہلے انہیں تلاش تو کر لیں--- میرا تو دل گھبرا رہا ہے۔"

"--- گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے--- میں نے پہلے بھی عرض کی ہے کہ وہ دونوں بچے نہیں ہیں' آجائیں گے۔ یہ لاہور شہر ہے' داتا دربار چلے گئے ہوں گے۔ یہ داتا کی نگری ہے' یہاں پہنچنے والا خود کو کھو نہیں سکتا بلکہ خود کو تلاش کر لیتا ہے اور نادر--- وہ تو داتا کا قلی ہے' کسی کا بوجھ اٹھا رکھا ہو گا--- تم میری بات کا جواب دو۔"

"حاجی صاحب! سب کچھ اللہ کا ہے' وہی مالک ہے۔ اس کے بعد جو آپ کا جی چاہے کریں' ہم بولنے والے کون ہیں--- پہلے نادر اور رابعہ کو تو تلاش کریں' ان کو آنے دیں' ان کی رائے معلوم کر لیں---"

"--- اگر وہ راضی ہو جائیں تو پھر آپ کی طرف سے اجازت ہے؟"

"آپ کے ہوتے ہوئے میری اجازت کی ضرورت نہیں ہے--- آپ میرے بڑے بھائی ہیں۔ ہم نے سب کچھ اللہ' داتا کے بعد آپ کو سونپ رکھا ہے۔"

"آپ سب کو مبارک ہو--- میں نے اللہ کے حکم اور داتا سرکار کی اجازت سے دونوں بچوں کا نکاح کر دیا ہے' دونوں ماشاء اللہ راضی خوشی ہیں---"

سبحان کی آنکھوں میں آنسو تھے' جویریہ اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی' باقی سارے حیران و ششدر رہے یہ باتیں سن رہے تھے--- سبحان چاچا آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

"اللہ آپ کو جزائے خیر دے' آپ نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا مگر جو کچھ ہوا' وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا--- رشتہ کہاں سے ٹوٹا' کہاں آ کر نصیب جڑے' کیا سوچا اور کیا ہوا؟--- نادر جیسے برخودار' فرشتہ سیرت انسان کے بارے میں تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا--- حاجی صاحب! یہ سب کچھ ہوا کیسے' اس وقت وہ دونوں کہاں ہیں؟"

"--- بتاتا ہوں' ذرا صبر سے سنیں--- جب وہ دونوں میرے پاس پہنچے تو بہت خوش تھے' کہنے لگے کہ دل چاہا تو آپ سے ملنے چلے آئے ہیں۔ میں نے دعائیں دیں' پیار کیا' اپنے پاس بٹھایا--- سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ جوڑی بڑی بھلی لگی' معاً" میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ان دونوں کو مضبوط بندھنوں میں باندھ دینا چاہیے--- دراصل وقت وقت کی بات ہوتی ہے' کوئی وقت ایسا بھی آتا ہے کہ سوچ' خیال' خواہش مستجاب ہو جاتی ہے۔ میری وہ ایک لحہ کی سوچ بھی پل بھر میں حقیقت میں بدل گئی ورنہ ہماری کئی سوچیں' خواہشیں مدتوں بے رنگ و نام حسرتوں کے آسیب بن کر ہمارے گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ وہ قبولیت کا وقت تھا' جو ٹالنا ٹال جاتا--- اس دن میں اپنے ایک کاروباری مسئلے میں بھی پریشان تھا' تمہیں علم ہو گا کہ ہمارا کپڑا ہندوستان' ایران' افغانستان بھی جاتا ہے۔ مجھے ایک با اعتماد' ہوشمند آدمی کی فوری ضرورت تھی جو اسی دن مال کے ساتھ باہر جا سکے اور نادر سے زیادہ میرے بھروسے کا آدمی کون ہو سکتا تھا لہٰذا فوری طور پر ان دونوں کو روانہ کر دیا گیا۔ نادر اور رابعہ نے بڑا اصرار کیا کہ لاہور آ کر آپ سے ملیں اور اجازت لیں مگر میں نے اپنی ذمہ داری پر انہیں روانہ کر دیا--- بھائی! اب مجھے جو چاہے سزا دے لو' میں حاضر ہوں۔ ان بچوں کا کوئی قصور نہیں--- یہ نکاح نامہ اپنے پاس رکھ لو اور یہ نکاح کی تصویریں بھی---"

سبحان چاچا نے نکاح نامہ اور تصویریں دیکھ کر ماشاء اللہ کہا۔ حاجی صاحب پھر بولے۔

"انشاء اللہ! سال بھر میں واپس آجائیں گے' پھر خوب خوشیاں کریں گے---"

سبحان چاچا کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے' وہ صرف یہ کہہ سکا کہ کم از کم جاتی دفعہ میرا پیار ہی لے جاتے--- وہ تصویریں چومنے لگا' حاجی صاحب کی آنکھوں کے کونے بھی بھیگ گئے۔ وہ اب کیا بتاتے کہ تم پیار کرتے یا ان ہاتھوں سے گلا دباتے؟--- اپنے آنسو اور دلی کیفیت پہ قابو پاتے ہوئے بولے۔

"سبحان بھائی! کوئی بات ناگوار گزری ہو تو معاف کر دینا--- تم سے ڈرتے ہوئے میں نے کچھ جھوٹ بھی بولا ہے' وہ بھی معاف کر دینا---"

سبحان چاچا کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا اور پھر جواب دیئے بغیر' ان سے لپٹ گیا۔

●●

گاؤں سے خیر خبر کیا آتی' بھائی تو سارے رشتے توڑ گئے تھے۔ حافظ محمد یوسف' رابعہ اور والدہ بھی

یہیں لاہور منتقل ہو چکے تھے' خالی گھر آنگن پہ تالا پڑا ہوا تھا۔ سبحان چاچا کے بھائی رحمان نے دے دلا کر بڑی مشکل سے پولیس والوں سے سلیم کا پنڈا چھڑایا۔ مہینہ' ڈیڑھ رہنے کے بعد سلیم کو اپنے ساتھ باندھ کر کویت لے گیا' دوبئی والا بھائی بھی واپس چلا گیا اور گاؤں کے کسی آنے جانے والے سے ایک دوجے کی خیر خیریت معلوم ہو جاتی۔۔۔ ادھر کوئٹہ میں نادر نے اپنی ذمہ داریاں خوب اچھے طریقے سے سنبھال لی تھیں' رابعہ بھی اپنوں بیگانوں کی ٹھوکریں کھانے کے بعد سدھر چکی تھی' نادر جیسے انسان کو پا کر جیسے اس نے دو عالم کی خوشیاں اور نعمتیں حاصل کر لی تھیں' نادر بھی خوش تھا کہ وہ اپنی قربانی اور محنت سے رابعہ کو بربادی اور بدنامی کے دلدل سے نکال کر عزت' وقار اور آسودگی کی جنت میں لے آیا ہے اور اپنے محسن کے کسی کام آسکا ہے۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے' رابعہ کے چہرے پہ ممتا کا نور پھیلتا جا رہا تھا مگر کبھی کبھی خدشے اور ایک انجانے سے خوف سے وہ لرز جاتی۔۔۔ نادر مرد ہے اور اس کی کوکھ میں پلنے والا بچہ اس کا نہیں ہے' کیا وہ اس بچے کو باپ کا سچا پیار دے سکے گا' اسے اپنا نام اور شفقت دے گا؟ لیکن نادر کا نرم' محبت بھرا رویہ اس کی تردید کر دیتا۔۔۔ اس نے کبھی اشارتاً بھی گزری ہوئی کسی بات کا ذکر تک نہ کیا' ہمیشہ اسے حوصلہ دیتا' گزری باتوں کو بھول جانے کا مشورہ دیتا۔ ایک دن وہ دبے دبے الفاظ میں کہنے لگی۔

"نادر! میں نے کسی سے سنا تھا کہ ایسی حالت میں نکاح نہیں ہو سکتا۔ تم کسی مولوی سے پوچھنا؟"

نادر نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ دو قیمتی جانوں کو حرام موت سے بچانے کے لئے جبکہ اس کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی نہ ہو' مجبوری اور معذوری میں جان اور عزت بچانے کی حد تک یہ قابل قبول ہو جاتا ہے۔ یہ اللہ کا حکم بھی ہے' یہ سارا گناہ سلیم کی گردن پر ہے' تم تو معصوم ہو۔۔۔"

وہ سر جھکا لیتی۔

●●

لاہور میں خدا کی بندی بجویریہ' راضی برضا' ہر حال میں صابر و شاکر' حافظ محمد یوسف جیسا نیک شریف اللہ اللہ کرنے والا شریک حیات پا کر بہت خوش تھی' دل و جان سے خدمت و عزت کرتی۔ اس کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ قرآن پاک کی حافظہ اور قاریہ بنے۔ اللہ نے اس کی پاکیزہ خواہش کا بندوبست گھر کی چار دیواری کے اندر ہی کر دیا' کام کاج سے فارغ ہو کر ایک سعادت مند طالب علم کی طرح دو زانو ہو کر اپنے مجازی خدا کے روبرو بیٹھ جاتی۔ بلاناغہ صبح شام محلے' آس پاس کی بچیوں اور بچوں کو پڑھاتی' ادھر سے فارغ ہوتی تو باباجی' بے بے جی اور والدہ کے چھوٹے موٹے کاموں اور خدمت میں بیٹھ جاتی۔ دودھ دھونا' چھاچھ بلونا بھی سیکھ لیا تھا' پنجابی بھی بولنے لگی۔ گھر بھر میں نور ظہور اور برکت کی لہر بہر تھی۔ حافظ صاحب کو جیسے جنت کی حور اسی دنیا میں مل گئی تھی۔ جیسی نیت ویسی مراد!

گاؤں میں بڑی بھابی اب بڑی اداس رہتی۔ گھر میں وہ چہل پہل سی رونق ختم ہو گئی تھی۔ سلیم کویت چلا گیا تھا۔ رابعہ' ساس اور حافظ لاہور آبسے تھے۔ رخسانہ اور فہمیدہ اب گھر بھر میں اداسیوں کے ساتھ کھلی کھلی کھیلتی رہتیں۔ بڑی بھابی کے اپنے اندر کا کرودھ اسے چین نہیں لینے دیتا تھا۔ حافظ محمد یوسف کی بجویریہ سے شادی' دس لاکھ کا جہیز کا صدمہ۔۔۔ حسد' نفرت اور کدورت نے اس کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ رابعہ کے رشتہ کی آڑ میں بجویریہ کا مال ہڑپ کرنے کے سارے منصوبے راکھ کا ڈھیر ہو چکے تھے بلکہ اس لالچ میں پلے سے بھی کافی کچھ خرچ کر دیا تھا' سلیم کے کیس اور ویزے ٹکٹ پہ بھی کافی خرچ ہو چکا تھا۔ اب جب نادر اور رابعہ کی اچانک شادی اور کاروبار کا سنا تو آپے سے باہر ہو گئی۔ اب رابعہ میں سو سو کیڑے نکلنے لگے' گاؤں بھر میں خوب دشنام طرازی اور بدنامی کرتی پھرتی۔ گھر بھر کا کوڑا کرکٹ' پچھواڑے سبحان کے آنگن میں پھینکتی رہتی۔ حسد اور نفرت کی آگ کی لپٹیں سبحان تک تو کیا پہنچتیں' ان میں خود ہی اپنے گھر کا سکون پھونک رہی تھی اور صحیح پاگل تو اس دن ہوئی جب اچانک کویت سے رحمان اور سلیم خالی ہاتھ پریشان حال گاؤں وارد ہوئے اور آتے ہی چارپائیاں پکڑ کر بیمار پڑ گئے۔ وہاں کسی سے جھگڑا ہوا اور کسی مقامی سے جھگڑنے کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہی ان کے ساتھ ہوا۔ آنے جانے' ملنے ملانے والوں نے اظہار ہمدردی کی آڑ میں انہیں ذہنی اور مالی طور پر اور بھی ادھ موا کر دیا۔ سبحان چاچا کو بھی بھائی پہ پڑی بپتا کی خبر ملی' سبحان چاچا اپنی فطرت سے مجبور کہ اچھا یا برا جو بھی تھا' بھائی تھا۔ وہ بھاگم بھاگ گاؤں پہنچا۔ ساتھ باباجی' والدہ اور بیوی بھی آئے۔ بھائی' بھتیجے کی حالت دیکھی' حالات سنے' تسلی دی' صبر کی ہدایت کی۔۔۔ بیمار کی تیمارداری اور خدمت سے بیمار کو حوصلہ اور تشفی ملتی ہے مگر یہ تو بیمار حرص و حسد تھے' ان کی خالی خولی لفظی ہمدردی سے کیا تسلی ہوتی؟۔۔۔ بھابی نے اپنی تنگی دستی اور برے وقت کا بھرپور نقشہ کھینچا۔ اپنے خون' دیوار کے ساتھ دیوار' ناخن اور گوشت' وقتی ناراضی' چھوٹا بڑا بھائی' بڑی بڑی مثالیں دے کر یہ کہنا چاہا کہ اس آڑے وقت تمہیں ہماری مدد کرنا چاہیے' دس لاکھ کا اشارہ دیا کہ اس میں ہمارا بھی حق ہے۔ سبحان چاچا سب کچھ سمجھتا اور جانتا تھا' خاموشی سے سنتا رہا۔ جو کچھ جیب میں تھا' خرچ کرتا رہا۔ وہ اسے بار بار لاہور جا کر مزید روپیہ لانے پہ اکساتے رہے۔ آخر تنگ آ کر اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں خود غریب مزدور آدمی ہوں۔ اپنی حق حلال کی کمائی سے اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھے ہوئے ہوں' اپنی حیثیت سے بڑھ کر کچھ نہیں کر سکتا۔ دوسروں کے مال پہ نظر رکھنا میری فطرت میں شامل نہیں ہے اور دس لاکھ کا بار بار ذکر کرتے ہوئے آپ کو شرم آنی چاہیے۔ وہ یتیم بچی کا ورثہ ہے' ہمارا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔۔۔ آپ یہ گھر کی قیمتی چیزیں فروخت کیوں نہیں کرتے؟ یہ ٹیلی ویژن' وی سی آر' فریج' زیور' آخر یہ سب کچھ کس لئے ہوتا ہے؟۔۔۔ میرے پاس یہ سب کچھ نہیں ہے لیکن گزارہ کر رہا ہوں۔ ساری عمر ہم ان غیر ضروری چیزوں کے بغیر رہتے رہے ہیں پھر اور بھی تو ہم جیسے لوگ اس گاؤں میں بسر

اوقات کر رہے ہیں۔۔۔ آپ انہیں بیچ دیں' خدا دے تو پھر خرید لیں مگر ان پہ اس کی باتوں کا اثر کیا ہوتا تھا' الٹا ناراض ہو گئے۔ اسی دوران بخار بڑھ کر نمونئے کی شکل اختیار کر گیا۔ نمونئے سے جان چھوٹی تو گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا' کئی دن ڈاکٹروں اور اسپتالوں کے چکر لگاتے لگاتے گزر گئے۔ پریشانی' بیماری' اسی دوران ٹیلی ویژن اور وی سی آر بک گیا۔ چھوٹا بھائی بیماری کا سن کر دوبئی سے دوڑا ہوا آیا۔ اس نے آتے ہی دوڑ دھوپ شروع کر دی اور حسب توفیق دوا دارو کرتا رہا مگر رحمان تھا کہ ایک بیماری چھوڑتی تو دوسری دبوچ لیتی' سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ جی جان سے ہار کر مستقل چارپائی کی پٹی سے لگ گیا اور تھک ہار کر چھوٹا بھائی بیچارا نوکری پر چلا گیا۔ واشنگ مشین اور ڈنر سیٹ بھی بک گئے۔ سبحان کبھی ادھر' کبھی ادھر لڑھکتا رہتا اور جو بن پڑتا' مدد امداد کرتا رہتا۔ سلیم بھی اب وہ سلیم نہ رہا' پہلے والے نخرے چونچلے اور کروفر' وہ طنطنہ قصہ پارینہ بن چکے تھے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ یونہی ہاتھ پاؤں توڑ کر گھر بیٹھے رہو گے تو گھر بھی بک جائے گا' کوئی نوکری یا چھوٹا موٹا کاروبار کر لو۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ شہر میں ویڈیو فلموں کی دوکان کھولی جائے' بڑے فائدے کا کاروبار تھا لیکن اس کے لئے پیسہ چاہیے تھا۔ یہاں زیور کام آیا۔ ماں نے اپنی بیٹی' بہو سب کا زیور پوٹلی میں باندھ دیا۔۔۔ کہتے ہیں کہ مصیبت کبھی اکیلی نہیں آتی' ہمیشہ اپنی سہیلیاں بھی ساتھ لاتی ہے۔ دوکان پہلے دو تین ہفتے خوب چلی' امید بندھی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

ایک روز کرائے پہ اٹھنے والا ایک وی سی آر مع چودہ انچ کلرٹی وی واپس نہ آیا' معلوم ہوا کہ وہ کرائے دار رات ہی رات دکان اپنی بڑھا گئے ہیں۔ کوشش بسیار کے باوجود ان لوگوں کا سراغ نہ ملا۔ اٹھارہ ہزار کی تھی' پولیس رپٹ کرائی تو پولیس والوں نے پرانے کیس کے حساب میں ایک وی سی آر مع ٹیلی ویژن اور پانچ انڈین فلمیں ڈکار لیں' واویلا کرنے پر مسروقہ اور کسٹم کے بغیر وی سی آر رکھنے کے الزام میں چھاپہ پڑ گیا۔ دوکان پہ تالا' اور سلیم حوالات میں۔۔۔ اسی رات رحمان بھی پہلے اٹیک میں ہسپتال کے خصوصی نگہداشت والے کمرے میں آکسیجن کے سہارے بے سدھ پڑا تھا۔ بازو' ہاتھ' سینہ' ناک مختلف ٹیوبوں اور مشینوں سے جکڑے پڑے تھے' وہ ایک روز زندگی اور موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد وہ جی جان سے ہار گیا اور اس کے مرنے سے گھر کی بربادی کے تابوت میں آخری کیل بھی ٹھک گئی۔ اس موقع پہ بھی سبحان چاچا کام آیا۔ حاجی صاحب کو فیصل آباد اطلاع دی گئی تو وہ فوراً آ گئے اور تین روز یہاں رکنے کے بعد واپس چلے گئے' وہاں سے انہوں نے نادر کو بھی اطلاع دی۔۔۔ مرنے والا مر گیا' اپنی مٹی پاک کر گیا مگر پسماندگان کو حالات کے جس دلدر میں چھوڑ گیا وہاں دن بہ دن اب ان کی مٹی پلید ہو رہی تھی۔ بھابی تو پرانے دق کی مریضہ دکھائی دیتی تھی۔ رخسانہ' فہمیدہ بھی باپ کی بے وقت موت اور پریشانی' تنگدستی کے تھپیڑوں سے مرجھائی گئیں۔ سلیم نے پے درپے ناکامیوں اور مایوسیوں سے بوکھلا کر ہیروئن کے نشے میں پناہ ڈھونڈلی تھی۔ گھر کی ہر قابل ذکر اور قابل فروخت چیز کچے رنگ کی مانند اڑ گئی۔ سبحان

چاچا' ان کی حالت دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتا رہتا اور وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟۔۔۔ اچھے وقتوں میں تو انہوں نے برے وقت کا خیال نہ رکھا' نہ اپنے کسی بہن بھائی سے بنا کر رکھی' نہ اخلاقی یا انسانی قدروں کی کوئی پاسداری اور لحاظ روا رکھتے ہوئے کسی کے دل میں اپنے لئے ہمدردی کے جذبات برقرار رکھے اور اب اپنے کھودے ہوئے گڑھوں میں یہ خود ہی گر رہے تھے۔ وہ لوگ جو ہر وقت ان کا دم بھرتے رہتے تھے' اب یوں کنی کترانے لگے کہ جیسے یہ کوڑھ کے مریض ہوں۔ درخت دھوپ میں سایہ دینے سے دریغ کرنے لگے۔ بھابی اور سلیم کو حالات اور سیہ بختی میں قریب ایک ہی چھتنار درخت نظر آتا تھا جس کی جڑ میں دفینہ تھا اور یہ سبحان چاچا تھا جو ان کے ہتھے سے اکھڑا ہوا تھا۔ بھابی اب منتوں اور خوشامد پہ اتر آئی۔

"تم تو اللہ والے اور داتا کے ملنگ ہو' تمہارے سوا ہمارا اور کون ہے؟۔۔۔ اپنے خون اور آل کا کچھ تو احساس کرو۔ گھر میں جوان بیٹیاں بیٹھی ہیں' انہی کا کچھ خیال کرو۔۔۔ تمہارے تو بھتیجے جاگ اٹھے کہ بیٹی کے لئے اچھے مالدار گھرانے تلاش کر لئے' وہ وہاں عیش کر رہے ہیں۔ تم نے ہمارا انتظار بھی نہ کیا' تمہاری بیٹی کو پھولوں کی طرح رکھا' پال پوس کر جوان کیا اور اب ہم پہ برا وقت آیا تو تم نے آنکھیں پھیر لیں۔"

وہ اپنے اندر کی سڑاند نکالتی رہتی اور یہ سنتا رہتا' کوئی جواب دینا فضول تھا۔ پھر از راہ ہمدردی رخسانہ اور فہمیدہ کو اپنے ساتھ لاہور لے آیا کہ چند روز ہوا تبدیلی سے یہ سہمی ہوئی بچیاں کچھ سنبھل جائیں گی۔

⊕●

نادر کے دو تفصیلی خط اور دو ہزار روپے کا منی آرڈر ان لوگوں کے پہنچنے سے دو روز قبل مل چکے تھے' کچھ تصویریں بھی تھیں۔ اس نے بڑی تفصیل سے سب کچھ لکھا تھا کہ حاجی صاحب کے کاروبار کو بڑی ذمہ داری سے سنبھالا ہوا ہے' تنخواہ بڑی اچھی ہے' رہنے کے لئے فلیٹ ملا ہوا ہے۔ گھر میں آسائش کی ہر چیز موجود ہے۔ موسم اور آب و ہوا بڑی خوشگوار ہے اور رابعہ بہت خوش اور صحت مند ہے۔ انشاء اللہ! خط لکھتے رہیں گے اور پیسے بھی روانہ کرتے رہیں گے۔ یہ دو ہزار روپے گاؤں میں تائی صاحبہ کے لئے ہیں' تایا جی کی وفات کا سن کر سخت صدمہ ہوا' افسوس کہ ہم پہنچ نہیں سکتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔ یہ منی آرڈر اور خطوط فیصل آباد سے روانہ کئے گئے تھے۔ جواب کے لئے ہدایت تھی کہ فیصل آباد کے پتہ پر ہی ارسال کیا جائے جہاں سے حاجی صاحب کی وساطت سے مجھے مل جائے گا۔

رخسانہ اور فہمیدہ یہاں آکر بڑی حیران ہوئیں۔ ہجویریہ نے گھر کو جنت کا نمونہ بنا رکھا تھا۔ کمرے' دالان صاف ستھرے' ہر جگہ سادگی اور پاکیزگی کی خوشبو سے مہکتی ہوئی' نماز کا اہتمام' قرآن کی تلاوت' سروں پہ دوپٹے' نرمی' شائستگی' ادب آداب' جیسے یہ دنیا ہی دوسری تھی۔ دو چار روز میں ہجویریہ نے انہیں بھی اپنے حسن اخلاق کے سحر میں جکڑ لیا اور اپنے ڈھب پہ لگا لیا۔ بیس پچیس روز بعد جب وہ سبحان چاچا

کے ساتھ گاؤں واپس جانے لگیں تو سسکیاں بھر کر رونے لگیں جیسے وہ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جا رہی ہوں۔ جویریہ نے انہیں اپنی بہنوں کی طرح روانہ کیا' اچھے اچھے کپڑے سلوا کر دیے۔ کتابیں' پانچ سو روپے' کچھ اور تحفے' دو ہزار روپے نادر والے اور دو ہزار اپنی جانب سے دیے۔ وہ اصرار کر کے رابعہ اور نادر کی ایک تصویر بھی لے گئیں۔

سبحان چاچا' بھتیجیوں کو ساتھ لئے شام تک گاؤں پہنچ گیا' گاؤں قصبوں میں شام ہوتے ہی اندھیرا گہرا ہو جاتا ہے مگر اس گھر میں اندھیرا جیسے کچھ زیادہ ہی گہرا تھا۔ خالی خالی' اجڑا اجڑا' اداسیوں کی دھند سے بھرا ہوا بھوت بسیرا۔۔۔ سبحان چاچا ڈر سا گیا' کہیں اندر دور سے آواز آئی۔

"کون ہے۔۔۔؟"

رخسانہ نے جوب دیا۔ "امی! ہم ہیں۔۔۔ چاچا بھی آئے ہیں۔"

نہ گرم چولہا' نہ مناسب روشنی' پیلا سا یرقان زدہ بلب' جیسے وہ کسی اجنبی گھر میں گھس آیا ہو۔۔۔ اتنی جلدی سب کچھ بدل گیا؟۔۔۔ اسے رونا سا آ گیا۔

"اندر آ جاؤ۔۔۔"

اندر داخل ہوئے تو وہ سر پہ دوپٹا باندھے' بخار سے پھنک رہی تھی۔

"امی! آپ بیمار ہیں۔۔۔ کب سے بخار ہے؟"

بچیاں گھبرا سی گئیں۔

"چھوڑو میرے بخار کو۔۔۔ تم سناؤ' کیسی ہو؟" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"۔۔۔ سلیم بھائی کہاں ہیں؟" رخسانہ ادھر ادھر تلاش کرتے ہوئے بولی۔

"پتہ نہیں۔۔۔ چار روز ہو گئے' گھر نہیں آیا۔" اس کی بخار سے چھلکتی ہوئی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"گھر نہیں آیا۔۔۔ کہاں گیا ہے؟" سبحان چاچا نے گھبرا کر پوچھا۔

وہ اپنے زانوں پہ ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ "کیا بتاؤں' کیا چھپاؤں؟۔۔۔ سبحان! خدا جانے کس کی نظر لگ گئی ہے اس گھر کو' کسی نے جادو تعویذ کرائے ہیں میرے سلیم پہ کہ اسے تو ہوش ہی نہیں ہے۔ ہر وقت پوڈر کے نشے میں ڈوبا رہتا ہے' نہ کھانا' نہ پینا' ہڈیاں نکل آئیں ہیں میرے پتر کی۔۔۔ سبحان! وہ تو اب مجھے بھی نہیں پہچانتا۔" وہ رونے لگی۔

"۔۔۔ اس وقت کہاں ہے؟"

"اپنے جیسے نشئیوں کے ساتھ بابے کرم شاہ کی خانقاہ پر پڑا رہتا ہے' دو وقت کھانا لے کر جاتی ہوں مگر کھاتا نہیں بس پیسے مانگتا ہے پوڈر کے لئے اور نہ دوں تو روتا ہے' اپنے آپ کو کے مارتا ہے۔ دانتوں

سے ہونٹوں' انگلیوں کو کاٹ کاٹ لہولہان کر لیتا ہے اور گھر نہیں آتا۔"

سبحان وہاں پہنچا تو اسے دیکھ کر پہچان نہ سکا' پھول جیسا جوان سوکھ کر کانٹا بن گیا تھا۔ چہرے کی ابھری ہوئی ہڈیاں' بڑھی ہوئی داڑھی' سیاہ پھٹے ہوئے ہونٹوں کے پیچھے غلیظ دانت' دھنسی ہوئی بے نور آنکھیں' بڑھے ہوئے میلے ناخن' ہڈیوں کا پنجر!

"چاچا!۔۔۔ بس پچاس روپے دے دے۔"

سلیم اسے دیکھتے ہی لپکا۔ سبحان نے اسے جواب دینے کی بجائے اٹھا کر کاندھے سے لٹکایا اور گھر لے آیا۔ بہنوں نے دیکھ کر رونا پیٹنا شروع کر دیا تو وہ سہما ہوا' ڈرا ڈرا' ٹک ٹک بہنوں کو دیکھنے لگا۔ پھر ماں کے پاس لگ کر بیٹھ گیا۔

"امی!۔۔۔ چاچا مجھے مارے گا؟"

چاچا اسے کیا مارتا' وہ تو خود اپنے آپ میں مر گیا تھا۔ وہ سر تھام کر سوچ میں ڈوب گیا کہ کیا کرے' کیا نہ کرے؟۔۔۔ کافی دیر اسی طرح مراقبے میں پڑا رہا۔ پھر سر جھٹک کر رخسانہ سے کہنے لگا۔

"بیٹی! تم چولہا گرم کرو' میں کچھ کھانے پینے کو لاتا ہوں۔۔۔"

کھانے کے بعد بھابی سے کہنے لگا۔

"اگر تم اجازت دو تو میں اسے لاہور لے جاتا ہوں۔ وہاں اس قسم کے مریضوں کے لئے بہت سے اسپتال ہیں' اللہ نے چاہا تو یہ ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ کاروبار میں نقصان اور باپ کی موت نے اس کی یہ حالت کر دی ہے' وہاں آب و ہوا کی تبدیلی' علاج معالجے اور داتا سرکار کی برکت سے یہ بندہ بن جائے گا۔ میں باباجی اور بے بے جی کو یہاں بھجوا دوں گا' خود بھی آتا جاتا رہوں گا۔۔۔" پھر نادر اور جویریہ والے چار ہزار روپے دے کر تسلی دیتا ہوا بولا۔ "اپنے آپ کو سنبھالو' اللہ سب بہتر کرے گا۔"

لاہور آتے ہی اس نے زبردستی سلیم کا حلیہ درست کروایا۔ اس کی حالت نیم پاگلوں جیسی تھی' چودہ پندرہ گھنٹوں سے اسے اس کی مقدار نہیں ملی تھی' جسم اینٹھ رہا تھا۔ نیم ہیجانی کیفیت میں اول فول بک رہا تھا۔ ایک آدھ بار دیوار سے سر ٹکرانے کی کوشش بھی کی' گالیاں بھی بکیں۔ سبحان چاچا مسلسل اس کے سر پر بیٹھا پہرہ دے رہا تھا۔ باباجی اور جویریہ نے پانی دم کر کے پلانے کی کوشش کی مگر یہ ترلے منتیں کر رہا تھا کہ خدا کے لئے مجھے تھوڑا سا پوڈر لا دو' نہیں تو میں آپ کے سر چڑھ کر مر جاؤں گا۔۔۔ جب سنبھالنا مشکل ہو گیا تو اسے چارپائی کے ساتھ باندھ دیا گیا۔

سلیم کے آنے سے گھر کا سکون غارت ہو گیا۔ سبحان چاچا' بس اسی کام کا ہو کر رہ گیا تھا۔ دوسرے روز شام کے وقت یہ مرنے کی حالت پہ پہنچ گیا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے' پتلیاں چڑھ گئیں۔ دل کی دھڑکن اب ڈوبی کہ ڈوبی' تشنج کی کیفیت در آئی تو ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے مشورہ دیا کہ یہ حالت بڑی

خطرناک ہے' کچھ بھی ہو سکتا ہے اور بہتر ہے کہ اسے مناسب مقدار میں اس کی خوراک دے دی جائے اور اس طرح آہستہ آہستہ بتدریج مقدار میں کمی کر کے کنٹرول کیا جائے۔ سبحان چاچا نے کہا کہ یہ مرتا ہے تو مرجائے' اس گھر اور اس داتا کی نگری میں اسے پوڈر نہیں دیا جا سکتا۔ ایک ہمسائے نے گرم دودھ میں تھوڑا سا گھی شامل کر کے پلانے کا مشورہ دیا مگر اس کی حالت زیادہ بگڑ گئی۔ آدھی رات کو اسے مجبوراً منشیات کے مریضوں کے خیراتی اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔

حافظ محمد یوسف کو محلے کی مسجد اور ملحقہ مدرسے میں امام اور مدرس کی ذمہ داریاں سونپ دی گئی تھیں۔ اپنی سادگی' علمی اور خوش خلقی سے انہوں نے اچھا خاصا حلقہ احباب بنا لیا تھا۔ اس ماہ صیام میں پہلی دفعہ لوگوں کو ان سے مکمل قرآن پاک سننے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ ان کے جذب و کیف میں ڈوبے انداز قرات نے اہل علاقہ کو گرویدہ کر لیا۔ جہاں عزت و توقیر بڑھی' وہیں اللہ تبارک و تعالیٰ نے روزی رزق میں بے پناہ برکت اور وسعت عطا فرما دی تھی۔ گھر میں ہجویریہ بھی ایک ہونہار اور نہایت فہیم و ذہین شاگرد ثابت ہوئی' دو پارے بڑی سرعت و صراحت سے حفظ کر لئے تھے۔ گھر کے کام کاج کے دوران بھی وہ زیر لب اپنی منزل یاد کرتی رہتی' اس دوران اس کے وجود کے اندر ایک ہمکتا ہوا ننھا سا وجود بھی عالم وجد میں ہوتا۔۔۔ اللہ اللہ' کیسا باپ اور کیسی ماں!۔۔۔ اور ماں تو ماں ہوتی ہے' اولاد کیسی بھی کیوں نہ ہو۔ سلیم کی ماں ہر ہفتے لاہور آتی۔ ایک آدھ دن یہاں ٹھہرتی' سلیم کے پاس جاتی جو اب قریب قریب سنبھل چکا تھا۔ جن لوگوں نے منشیات کے عادی مریضوں کے یہ شفا خانے اور ان کا طریقہ علاج دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہاں کیسے کیسے دل ہلا دینے والے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مریضوں کی آہ و بکا' چیخیں' فریادیں اور تڑپنا دیکھنے والوں کو کیا کیا سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کاش! منشیات کے سوداگر یہ مناظر دیکھیں یا ان کی اپنی اولادوں پہ یہ سب کچھ گزرے تو انہیں معلوم ہو کہ وہ کیا کر رہے ہیں' کیا بیچ رہے ہیں؟۔۔۔ سلیم کی منتیں' فریادیں' دل ہلا دینے والی چیخیں اس کی ماں' کلیجہ پھاڑ دیتیں۔ کئی بار اس کے جی میں آیا کہ چپکے سے پوڈر کی چٹکی اس کی جانب بڑھا دے مگر یہ دونوں کام اس کے بس میں نہ تھے' نہ اس کا تڑپنا دیکھ سکتی تھی اور نہ پوڈر دے سکتی تھی۔ مضبوط نائلون کی پٹیوں سے بندھے ہوئے نیم جان سلیم کو دیکھ کر خود نیم جاں ہو جاتی اور واپسی پہ داتا سرکار کے حضور رو رو کر آہ و زاری کرتی' رو رو کر دعائیں مانگتی۔

جس دن سلیم گھر آیا تو اس کا وزن چھ پونڈ بڑھ چکا تھا۔ چہرے پہ رونق' جسم و جان میں طاقت آ چکی تھی۔ دواؤں کا استعمال اور نگہداشت' خوراک' سیر' ورزش' سب ذمہ داری سبحان چاچا نے اٹھا رکھی تھی۔ حافظ محمد یوسف اور ہجویریہ اس کی طہارت اور وقت کی نماز پہ توجہ دیتے۔ ہجویریہ اب بھاری کام کاج سے پرہیز کر رہی تھی۔۔۔ نادر اور رابعہ بھی تمام حالات سے باخبر تھے' ہر ماہ باقاعدگی سے دو ہزار

روپے گاؤں تائی جی کو بھجواتے۔ فیصل آباد والے حاجی صاحب بھی چکر لگا جاتے' نادر کی کارکردگی کی تعریف کرتے۔ ہجویریہ کی صحت دریافت کرتے' دعائیں دیتے۔ سلیم کے بارے میں ایک دفعہ علیحدگی میں ہجویریہ سے کہنے لگے کہ بیٹا! اس سے محتاط رہنا۔۔۔ اچھا بھی ہر وقت یا ہر جگہ کام نہیں آتیں اور احتیاط کے باوجود کچھ ہونیاں ہو جاتی ہیں۔ سلیم اب واپس گاؤں جانے کی تیاری کر رہا تھا' دوا کا ایک کورس چند دنوں بعد مکمل ہونا تھا اور اسی انتظار میں وہ دل بہلانے کے لئے باہر بھی نکل جاتا' گھر کے لئے چھوٹی موٹی چیزیں بھی خرید لاتا۔ گو وہ اب تائب اور کسی حد تک تندرست بھی ہو گیا تھا پھر بھی گھر والے اس پہ کڑی نظر رکھتے۔

ایک شام وہ لڑکھڑاتا ہوا گھر واپس لوٹا اور نیم غنودگی کی کیفیت میں چارپائی پہ لیٹ گیا۔ سبحان چاچا کی چھٹی حس نے محسوس کیا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے' پوچھا تو کوئی خاطر خواہ جواب نہ دے سکا' آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ تلاشی لی تو سگریٹ کے پیکٹ کے اندر والی المونیم کی باریک پنی' جوس پینے والی نکی' ماچس کی جلی ان جلی تیلیاں اور پوڈر کی پڑیا برآمد ہوئی۔۔۔ ساری محنت اور تگ و دو اکارت ہو گئی تھی۔ سبحان چاچا نے نتائج کی پرواہ کئے بغیر رات خوب پٹائی کی' چارپائی پہ نیلا پیلا باندھ دیا۔ صبح آنکھ کھلی تو چارپائی خالی تھی' رات وہ کسی نہ کسی طرح فرار ہو گیا تھا۔۔۔ کہاں گیا؟ شائد گاؤں واپس چلا گیا ہو یا کہیں کسی اپنے جیسے تلاش کر لئے ہوں؟۔۔۔ ادھر بھابی کا خوف بھی تھا اگر وہ گاؤں نہ پہنچا تو کیا آفت ڈھائے گی۔ سبحان چاچا' اسی کشمکش میں اسے ڈھونڈنے باہر نکل گیا۔ آس پاس پارکوں' ایک دو ملنگوں کے ڈیروں پہ تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔ اسی تلاش میں پریشان سا داتا دربار چلا آیا' سلام کرنے کے بعد کھلے میدان کی جانب نکل گیا۔ یہاں کئی مست ملنگ' بھنگی چرسی اپنی اپنی موج میں مگن تھے اور یہیں سلیم بھی دنیا و مافیہا سے بے خبر' بے سدھ سا پڑا ہوا تھا۔ اسے اٹھایا' چائے پلائی' گھسیٹتا ہوا بڑی مشکل سے گھر لایا' نہلایا' کھلایا' پلایا اور دوسرے روز وہ اسے گاؤں چھوڑ آیا۔ اس حرکت کا ذکر تو نہ کیا کہ ناحق پریشان ہو گی البتہ یہ تاکید ضرور کی کہ اس کا بہت خیال رکھے' دوستوں سے ملنے نہ دے اور اسے ہر پندرہ روز بعد لاہور بھیجا کرے' شفا خانے والوں کی ہدایت کے مطابق اسے ہر پندرہ روز بعد اپنا چیک اپ کروانا چاہیے اور اگلے چھ مہینے اسے اپنی دواؤں کے کورس بھی مکمل کرنے ہیں۔

اگلے کئی پندرھواڑے وہ اپنی ماں کے ساتھ آتا رہا' پھر اکیلے بھی آنا شروع ہوا۔ بظاہر دکھائی تو یہی دیتا تھا کہ پھر کچھ سنبھل گیا ہے لیکن سبحان چاچا مطمئن نہیں تھے۔ ماں تو ذکر نہ کرتی لیکن یہ جانتا تھا کہ یہ نشے باز' باز نہیں رہ سکتے۔ اس کا تجربہ اسے لاہور ہو چکا تھا جبکہ اس کی خواہش تھی کہ یہ سنبھل جائے تو فیصل آباد والے حاجی صاحب سے کہہ سن کر اسے کسی کام دھندے پہ لگا دے۔ اس کی ماں کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ پھر کوئی کاروبار کرنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ چچا سے مجھے کم از کم ایک لاکھ روپے لے دو' کاروبار

کروں گا تو یہ بری عادت بھی چھوٹ جائے گی مگر سبحان چاچا اسے لاکھ روپے کہاں سے دیتا؟

بڑی عید سے کچھ دن پہلے سلیم اپنے معمول کے مطابق لاہور آیا اور شفاخانے سے فارغ ہو کر ادھر ملنے بھی چلا آیا۔ گھر میں جویریہ اکیلی تھی۔ ایک دو چھوٹی بچیاں سبق کی دہرائی کر رہی تھیں' بابا جی اور بے بے جی گاؤں تھے۔ سبحان چاچا اسٹیشن اور حافظ مدرسے تھے۔ شائد یہ پہلا موقع تھا کہ جویریہ اسے گھر میں اکیلی ملی۔ حسب عادت اس نے بڑی فراخ دلی سے اس کا استقبال کیا۔ گاؤں میں سب کی خیر و عافیت دریافت کی' کھانا نکال کر سامنے رکھا۔

"کیا بات ہے' آج گھر خالی خالی دکھائی دے رہا ہے---؟" وہ بڑا سا نوالہ توڑتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"سلیم بھائی! آج اتفاق ہی کہہ لیجئے کہ حافظ ابھی آدھ گھنٹہ پہلے مدرسے گئے ہیں' چاچی جی پڑوس میں کمیٹی دینے گئی ہیں اور بچے بھی ابھی ابھی فارغ ہو کر چلے گئے ہیں---" وہ ہنستی ہوئی بولی۔

"---کوئی رابعہ اور نادر کا خط آیا ہے؟"

"ہاں--- دو روز پہلے خط آیا تھا' ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک ہیں--- ایک خوشخبری بھی لکھی ہے' سناؤں؟"

"ہاں' ہاں--- بتاؤ۔"

"ماشاء اللہ رابعہ ماں بننے والی ہے۔"

اس کے منہ کے لقمے میں جیسے کوئی بڑا سا کنکر آ گیا' لقمہ زمین پہ تھوکتے ہوئے اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کرتے ہوئے بڑے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"---نادر باپ بننے والا ہے؟"

"ماشاء اللہ--- اور سبحان چاچا' دادا اور نانا بننے والے ہیں--- بڑے خوش ہیں۔"

"وہ قلی کیا باپ بنے گا---؟" اس نے ایک شیطانی قہقہہ لگایا۔

جویریہ' ہونقوں کی طرح اس کا منہ تکنے لگی' تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ "---کیا کہہ رہو سلیم بھائی' ہوش میں تو ہو؟"

"میں تو ہوش میں ہوں' تم ہی سب بے ہوش ہو--- شائد تم نہیں جانتیں مگر میں جانتا ہوں کہ نادر اور رابعہ کی شادی اتنی خاموشی اور جلدی میں کیوں ہوئی کہ منگنی نہ بارات' ڈولی نہ ولیمہ' کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور شادی ہو گئی--- اس لئے کہ رابعہ کے پیٹ میں میرا بچہ تھا--- رابعہ میری تھی' مجھ سے چھین کر اسے نادر کے حوالے کر دیا گیا مگر اس کے ہونے والے بچے کا باپ میں ہوں' نادر نہیں---"

جویریہ کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ٹپک رہا تھا' وہ منہ کھولے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے تک رہی

تھی۔ حلق تر کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"رابعہ سے تمہارا نکاح ہوا تھا---؟"

وہ کمال ڈھٹائی سے بولا۔ "--- نکاح ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے--- میرا کسی کو خیال ہوتا تو نکاح بھی ہو جاتا--- بچے کا باپ میں ہی ہوں' رابعہ سے قرآن پہ ہاتھ رکھوا کر پوچھ لینا۔"

"نکاح سے پہلے تم نے ایسی حرکت کی--- یہ تو بہت بڑا گناہ ہے۔"

"گناہ' ثواب میں نہیں جانتا اور جو ہونا تھا وہ ہو گیا--- اب میں دیکھتا ہوں' چاچا مجھے ایک لاکھ روپیہ کیسے نہیں دیتا؟"

جویریہ نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پہ قابو پایا' ایک تو گھر میں اکیلی' دوسرے وہ خود بھی اچھی نہ تھی۔ اپنی دھیمی طبیعت سے بھی مجبور تھی۔ اس نے بڑی نرمی سے بات کی۔

"سلیم بھائی! ہم تمہاری مجبوری اور حالات سے واقف ہیں اور جو ممکن تھا وہ کیا بھی ہے' آئندہ بھی کریں گے۔ تمہیں فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں--- تمہیں کاروبار کے لئے ایک لاکھ روپے مل جائیں گے' میں وعدہ کرتی ہوں--- تم نے جو کچھ بتایا سچ یا جھوٹ' خدا جانے--- لیکن واقعی میں یہ سب کچھ نہیں جانتی تھی۔ اب اگر یہ سب کچھ صحیح بھی ہے تو انسانی اور اخلاقی تقاضہ یہی ہے کہ تم اپنی زبان بند رکھو--- سلیم! تم کیسی قیامت بپا کر چکے ہو' اس کا شائد تمہیں احساس نہیں اور اب تمہاری ذرا سی بے احتیاطی سے بڑی بربادی ہو گی جس سے تم بھی محفوظ نہیں رہو گے۔ ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا--- اب تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ یہ الفاظ بھولے سے بھی کبھی اپنی زبان پہ نہ لانا---"

"اپنی زبان بند رکھنے کے لئے ہی لاکھ روپے مانگ رہا ہوں--- روپے دے دو' زبان بند!"

"میں تمہیں اپنا بھائی سمجھتے ہوئے' تمہارے حالات اور بیروزگاری کا احساس کرتے ہوئے تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں اور تم مجھے سیدھے سیدھے بلیک میل کر رہے ہو---؟"

"جویریہ! تم نے سنا ہو گا کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ تم لوگوں نے بھی تو اپنے مفاد کی خاطر سب کچھ جائز کر لیا ہے تو مجھ پہ ہی یہ پابندی کیوں---؟"

"مثلاً---؟" جویریہ نے پوچھا۔

"مثلاً یہ کہ تمہاری دولت کی خاطر روپے کے مولوی کو تمہارا شوہر---"

بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ زنانے سے ایک بھرپور تھپڑ سلیم کے دائیں گال کو گلنار کر گیا--- یہ حادثہ اتنی سرعت اور ایسے میکانکی انداز میں ظہور پذیر ہوا کہ چند ثانیے تو دونوں فریق یہ محسوس ہی نہ کر سکے کہ کیا ہو گیا ہے؟ اس سے پہلے کہ سلیم اپنے کسی ردعمل کا اظہار کرتا' جویریہ اسی دھیمے لہجے اور پرسکون انداز سے بولی۔

"تم نے کہا تھا کہ میں گھر میں اکیلی ہوں' اب تمہیں احساس ہو گیا کہ میں اکیلی نہیں بلکہ میرے ساتھ میرا اللہ' میری جرات اور میرا ایمان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم آئندہ بھی ایسی نازیبا حرکت نہیں کرو گے---اور بھول جاؤ کہ کیا ہوا ہے۔ تمہیں ایک لاکھ روپے پندرہ روز بعد' جب تم چیک اپ کے لئے آؤ گے' مل جائیں گے۔ اپنے ساتھ امی اور رخسانہ فہمیدہ کو لانا مت بھولنا---مگر اس کی کیا گارنٹی ہے کہ تم آئندہ زبان بند رکھو گے؟"

"---عورت اور قریبی رشتہ داری کی وجہ سے میں نے تمہارے تھپڑ کا جواب تھپڑ سے نہیں دیا ورنہ میری بھی عزت ہے اور میرے اندر بھی غیرت ہے---" وہ بولا۔

"بلیک میلر اور نشے باز میں کم از کم یہ دونوں چیزیں تو ہرگز نہیں ہوتیں---بات میں یہ کر رہی تھی کہ کیا گارنٹی ہے کہ تم آئندہ زبان نہیں کھولو گے؟"

بوکھلا کر وہ بولا۔ "گارنٹی تو کسی چیز کی نہیں ہوتی' وقت اور حالات پر منحصر ہوتا ہے---لاکھ روپے اگر مجھے مل جائیں تو پھر میں اپنے خاندان کی بدنامی کی وجہ سے زبان بند رکھوں گا---" وہ جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ "میرا خیال ہے' مجھے اب جانا چاہیے---"

"تھوڑی دیر اور رکو' حافظ صاحب آنے ہی والے ہیں---"

وہ اپنا گال سہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں پندرہ روز بعد آؤں گا' اپنے وعدے کے مطابق روپے تیار رکھنا---اور ہاں' اس وقت میرے پاس واپسی کا کرایہ بھی نہیں اور کچھ دوائیں بھی لینی ہیں' چاچا گھر میں ہوتا تو اس سے مانگ لیتا---" اپنے سرخ گال پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے مزید کہنے لگا۔ "اس گھر میں ذلتیں ہی رہ گئی ہیں۔ چاچا نے بھی میری پٹائی کی تھی' آج تم نے بھی مجھے تھپڑ مارا ہے---"

جویریہ نے اسے دو سو روپے دیتے ہوئے جواب دیا۔ "اس گھر سے تمہیں رحمتیں اور برکتیں بھی مل سکتی ہیں' اگر تم انہیں لینا چاہو---جیسے یہ روپے تمہاری دوا اور کرائے کے لئے ہیں' اگر تم ان روپوں کا کہیں غلط استعمال کرو تو اس میں کسی کا کیا قصور ہے؟" وہ بڑی اپنائیت سے سمجھانے لگی۔ "اب بھی کچھ نہیں بگڑا' بری صحبت سے پرہیز کرو' اپنے آپ کو بدلو' بیوہ ماں اور جوان بہنوں کی ذمہ داری اب تمہارے کندھوں پہ آپڑی ہے---ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچو تم اس عمر اور ان حالات میں اگر منشیات اور برے کاموں میں پھنس کر رہ گئے تو ان کا کیا ہو گا؟---سدا کا داتا تو خدا ہے اور کوئی کب تک تمہاری مدد کرتا رہے گا---جوان ہو' محنت کر سکتے ہو' کما کر کھلا سکتے ہو تو پھر کیوں محنت نہیں کرتے؟"

"مجھے نصیحتیں مت کرو---مجھے اس حالت میں پہنچانے میں آپ لوگوں کا ہاتھ بھی ہے۔ میں کویت گیا' کاروبار کیا۔ اگر نقصان ہو گیا تو اس میں میرا کیا قصور ہے اور والد صاحب کا انتقال ہو گیا تو اس

میں میرا کیا دوش---؟" وہ جھنجلا کر بولا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو---تمہارا دوش صرف اتنا ہے کہ تم نے بری صحبت اختیار کر لی' دوسروں کی عزت خراب کرتے رہے حتیٰ کہ اپنے گھر میں اپنی منگیتر کو بھی نہ بخشا۔ دشمنیاں مول لیں' پولیس کے چکروں میں پھنس گئے' نشہ شروع کر دیا۔ اگر تم یہ سب کچھ نہ کرتے تو شاید تایا ابو صدمے سے یوں نہ مرتے' تمہارے گناہ کا بوجھ نادر بھائی کو اپنے کندھوں پہ نہ اٹھانا پڑتا اور تمہاری ماں اور بہنوں کو یوں دربدر ٹھوکریں نہ کھانا پڑتیں---سلیم! یاد رکھنا کہ عورت کی عزت پہ آیا ہوا حرف اور شیشہ پہ آیا ہوا بال کبھی نہیں مٹ سکتا۔ عورت کے ناتے تمہارا رابعہ کے ساتھ جو بھی رشتہ ہے' اب اس کا تقاضا ہے کہ اس کی عزت کا خیال رکھو---بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتی---"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے---مجھے لاکھ روپے دے دینا' میں زبان بند کر لوں گا۔"

وہ چلا گیا تو جویریہ مصلیٰ بچھا کر' حل المشکلات کے روبرو اپنی مشکل بیان کرنے بیٹھ گئی۔ اس کے اندر کھچڑی سی پک رہی تھی' مختلف خدشات سانپوں کی مانند سر ابھار رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس کا نام کس نے رکھا تھا' سلیم تو سلامتی اور حلیمی کا نام ہے مگر یہ تو عفریت ہے۔ اگر یہ سب کچھ چاچا اور نادر کو معلوم ہو گیا تو پھر کیا ہو گا' ان پہ کیا بیتے گی؟---اس کا سر درد سے پھٹنے لگا' وہ تہیہ کر چکی تھی کہ ان معصوم انسانوں کو اس اذیت سے دوچار نہیں کرے گی جس اذیت سے وہ گزر رہی تھی۔

چاچی آئی تو وہ ابھی مصلیٰ پہ تھی۔

"لڑکی! یہ کون سا وقت ہے نماز پڑھنے کا؟---زوال شروع ہو چکا"

وہ دل ہی دل میں "خدا نہ کرے" کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی---حافظ صاحب آئے تو کہنے لگی' ذرا فیصل آباد ٹیلی فون کر دیں کہ طبیعت بڑی اداس ہے' ذرا آکر مل جائیں۔

جویریہ کے ٹیلی فون پہ دوسرے روز حاجی صاحب مع اپنی اہلیہ تشریف لے آئے' پہنچتے ہی انہوں نے محسوس کیا کہ یہ کچھ پریشان ہے' کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن شائد موقع نہیں پا رہی۔ پھر بھان چاچا اسٹیشن چلے گئے' حافظ صاحب کے مدرسہ جاتے ہی وہ پوچھنے لگے کہ خیریت' پریشان کیوں ہو؟ جواب میں وہ رونے بیٹھ گئی۔ حاجی صاحب کا ماتھا ٹھنکا کہ ضرور کوئی غیر معمولی بات ہے' وہ اور قریب ہو گئے۔

"جویریہ بیٹی! کیا ہوا---جو بات بھی ہے' جلدی جلدی کہہ ڈالو۔" وہ اسے پچکارتے ہوئے بولے۔

وہ خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی' پھر ذرا رک رک کر کہنے لگی۔

"سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بات کہاں سے شروع کروں اور اگر آپ سے بھی چھپاؤں تو کس سے کہوں؟---بھان چاچا سے کہنے کا مطلب تو ان پہ ظلم کرنا ہے۔"

"مجھ سے کہو بیٹا' میں سنوں گا---شاباش' تسلی سے بات کرو۔"

اس نے شروع سے آخر تک ساری روداد من و عن بیان کر دی۔

"بس' یہی بات تھی؟" انہوں نے ایسے کہا جیسے کوئی طوطا مینا کی کہانی سنی ہو۔ "بیٹا! یہ دنیا ہے۔ خیر شر' اچھائی برائی' نیکی بدی' سب کچھ ساتھ ساتھ چلتا ہے اور جینے کے لئے بڑے حوصلے اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمیں خود کو ہر وقت' ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رکھنا چاہیے--- تم نے جو بتایا ہے' اس سارے قصے کے کچھ حصے کا مجھے بھی اندازہ تھا اور صد آفرین نادر پہ جس نے بروقت رابعہ کو سہارا دے کر ہم سب کو بدنامی اور بربادی سے بچالیا' صد لعنت اس سلیم پہ کہ جس کی یہ کرتوتیں اور ایسی حرکتیں ہیں--- تم فکر نہ کرو بچی! یہ بے غیرت کسی کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ یہ ہمیں بلیک میل کر رہا ہے' اور اگر اسے ابھی روکا نہ گیا تو یہ پھر ایسے ہی کرے گا' میں اس کا بندوبست کر لوں گا۔"

وہ کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگی۔ "وہ لوگ بہت پریشان ہیں' بڑے مشکل حالات سے گزر رہے ہیں۔ اس وقت انہیں ہماری مدد کی ضرورت ہے۔" پھر رک رک کر کہنے لگی۔ "--- ذرا صرف سے سلیم سے ہے۔ وہ اس وقت سخت یاسیت اور محرومی کے عالم میں ہے۔ کویت سے بے نیل و مرام واپسی' پولیس کیس' کاروبار کی بربادی' باپ کی موت اور اب بے روزگاری کا مسئلہ--- وہ اس وقت گردن تک مایوسیوں کی دلدل میں دھنس چکا ہے۔ اب اسے بلیک میل کے علاوہ اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا---"

"یہ تو ٹھیک ہے بیٹا! ان حالات میں اس کی مدد تو کی جا سکتی ہے مگر جس طرح کی مدد وہ بلیک میلنگ کے ذریعے مانگ رہا ہے' کم از کم ہمارے لئے ناقابل قبول ہے۔ ایک مرتبہ بلیک میل ہونے کا مطلب ساری زندگی بلیک میل ہونا ہے---"

"آپ کی بات بالکل بجا ہے لیکن اب اگر ہم اس وقت پیسے کا منہ دیکھتے ہیں تو اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ ہم سب کو رسوا اور برباد کر دے گا۔ یہ ہنستا بستا گھر' یہ خوشیوں اور آسودگی سے باغ و بہار چہرے' یہ پیار' اعتماد' سب کچھ چھن جائے گا--- سبحان چاچا اور نادر پہ کیا گزرے گی' لوگ کیا کہیں گے' رابعہ کا مستقبل---" وہ حاجی صاحب کا ہاتھ تھام کر التجا بھرے لہجے میں فریاد کرنے لگی۔ "میری ساری دولت اور میری خوشیاں' میری زندگی' سب کچھ اسے دے دیجئے--- للہ! میرے نادر بھائی' میری بہن رابعہ اور چاچا کی خوشیاں بچا لیجئے---"

ہجویریہ ویسے بھی اس حالت میں نہیں تھی کہ وہ کوئی جذباتی صدمہ سہار سکے۔ حاجی صاحب نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا' تسلی دی اور کہنے لگے۔

"تم ٹھیک کہتی ہو' تمہاری سوچ درست ہے' اسے ایک لاکھ دے دیں گے۔ دو ہفتے بعد میں روپیہ لے کر آ جاؤں گا اور باقی اللہ پہ چھوڑتے ہیں---"

اس رات وہ داتا دربار چلے گئے' ساری بات سرکار کے روبرو رکھ کر صبح صبح فیصل آباد روانہ ہو گئے۔

●●

جمعرات کے روز صبح صبح ہی سلیم مع اپنی والدہ' رخسانہ' فہمیدہ' لاہور پہنچ گیا۔ ناشتے کے بعد شفاخانے اور داتا دربار سلام کے لئے جانا تھا۔ ہجویریہ' رخسانہ تو دوپہر کے کھانے کے انتظام میں مصروف ہو گئیں۔ سبحان چاچا' سلیم' اس کی والدہ اور حافظ صاحب شفاخانے اور داتا سرکار حاضری کے لئے باہر نکل آئے۔ موسم بڑا اچھا تھا' رات کھل کر بادل برسے تھے۔ کیچڑ سے بچتے بچاتے کسی خالی تانگے کی تلاش میں وہ دو موریہ پل تک چلے آئے۔ یہاں تو جیسے راوی دریا بہہ رہا تھا' پوری سڑک پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہاں ایک خالی تانگہ مل گیا۔ سبحان چاچا اور سلیم کی والدہ پیچھے بیٹھ گئے اور حافظ صاحب آگے--- سلیم نے ابھی پائدان پہ پاؤں دھرا ہی تھا کہ پاس سے گزرنے والے ایک ٹرک سے گھوڑا بدکا' اگلے پاؤں اٹھا کر جو الف ہوا اور سلیم کا پاؤں پھسلن کی وجہ سے جو پھسلا تو گھوڑے کی پچھلی ٹانگوں میں اوندھا ہو گیا' بدحواسی میں گھوڑا جو سرپٹ بھاگا تو پوری سڑک پہ بھگدڑ مچ گئی۔ تیز چمکدار پائیدان کا پھل سلیم کے پیٹ سے نیچے' زیریں حصے میں گھس گیا۔ بادامی باغ لاریوں کے اڈے سے ذرا پہلے ایک ریڑھے سے ٹکرا کر تانگہ جو الٹا تو گھومتے پہیوں سے خون ملے کیچڑ کے چھینٹے راہ گیروں کے لباس کو بھی غلیظ کر گئے۔ سلیم کے سر دھڑ کی شناخت ختم ہو چکی تھی' انتڑیاں پہیے اور گھوڑے کی پچھلی ٹانگوں پہ امر بیل کی مانند الجھی ہوئی تھیں' ایک پیر اور بازو کہیں راستے میں رہ گیا تھا۔ کھوپڑی کا پیالہ کسی لجلجے' ادھ کٹے تربوز کی مانند کھلا پڑا تھا۔ ناف کے نیچے آر پار' پائیدان نازک حصے کو صاف کر گیا تھا۔ ریڑھ کی ہڈی کولہے کے جوڑ سے علیحدہ ہو چکی تھی۔ سبحان چاچا تو وہیں گھوڑا الف ہوتے ہی پیچھے کی جانب گر پڑا تھا' سلیم کی ماں کسی نہ کسی طرح تانگے میں ساتھ ہی چمٹ چمٹا کر بیٹھی رہی' تانگہ الٹنے سے اس کی بھی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اگلی نشست پہ حافظ صاحب معجزانہ طور پر بچ گئے' ایک خراش تک نہ آئی جبکہ کوچوان بھی لہولہان تھا اور شانہ اتروا بیٹھا تھا۔ گھوڑا تو گرتے ہی دم توڑ گیا' ریڑھے سے ٹکرا کر اپنے ہی زور اور بوجھ سے گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی--- گھر میں کسے معلوم کہ ادھر کیا کچھ ہو گیا ہے۔ فیصل آباد والے حاجی صاحب بھی پروگرام کے مطابق پہنچے ہوئے تھے۔ بیٹھے بیٹھے انتظار کرتے ہوئے ظہر کا وقت ہو گیا لیکن ان کی کوئی خبر نہ تھی۔ مسجد سے ایک دو آدمی حافظ صاحب کا معلوم کرنے آئے مگر کوئی کیا بتاتا کہ وہ کہاں ہیں؟--- اسی انتظار میں عصر اور پھر شام ہو گئی۔ اب حاجی صاحب کو پریشانی لاحق ہوئی اور وہ فوری طور پر ایک ہمسائے کو لے کر باہر تلاش کرنے نکل پڑے--- ادھر میو ہسپتال میں پولیس حافظ صاحب کو بیانات کے بکھیڑے میں جکڑے بیٹھی تھی۔ سبحان چاچا' اس کی بھابی اور بہت سے زخمی جو اسی بھگدڑ میں رگڑے گئے تھے' سب بیانوں' معائنوں اور مرہم پٹیوں کے چکروں میں پڑے ہوئے تھے۔ سلیم کی ماں بے ہوش تو نہ تھی لیکن

ہوش میں بھی نہیں تھی' پاگلوں کی طرح چیختی چلاتی' بین کر رہی تھی' سلیم کا انجام اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ آخر ڈاکٹروں نے اسے ٹیکہ لگا کر بے سدھ کر دیا' ادھر سبحان چاچا بھی بوکھلایا ہوا تھا اور کسے ہوش تھا کہ گھر اس حادثے کی اطلاع دیتا؟--- حاجی صاحب کو ایک تانگے والے سے ہی حادثے کی خبر مل گئی' انہوں نے سلیم کے شفا خانے جانے کی بجائے سیدھے میو ہسپتال ہی جانا مناسب سمجھا' وہاں اندر داخل ہوتے ہی انہیں سبحان چاچا دکھائی دیا' سلیم کی موت کا معلوم ہوا' سب کچھ جان لینے کے بعد انہوں نے ساتھ آئے ہوئے ہمسائے کو گھر روانہ کر دیا اور خود ٹیلی فون کرنے کے لئے باہر آگئے۔

رات گئے تک پولیس کی انکوائری' بیانات اور ہسپتال کے سلسلے چلتے رہے۔ حاجی صاحب کے گھر والے پہنچ چکے تھے۔ گھر اور ہسپتال میں ملنے ملانے والوں کا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا--- سلیم کی ماں کی ٹانگ دو جگہ سے ٹوٹ گئی تھی' چھوٹی موٹی دوسری چوٹیں بھی تھیں' ٹانگ پہ پلاسٹر چڑھا دیا گیا۔ سبحان چاچا بھی پٹیاں اور پلاسٹر بندھوائے بستر پہ پڑے تھے۔ پولیس اور ہسپتال کی کارروائی کے بعد پوسٹ مارٹم کے بغیر لاش ورثاء کے حوالے کر دی گئی۔ گاؤں سے بھی قریبی رشتہ دار پہنچ چکے تھے۔ جمعہ کی نماز کے بعد حافظ محمد یوسف نے نماز جنازہ پڑھائی' جنازہ ٹرک میں ڈال کر گاؤں پہنچا کر باپ کے پہلو میں دفن کر دیا۔ یہ سارا انتظام حاجی صاحب اور ان کے صاحبزادوں نے کیا۔ سبحان چاچا اور ان کی بھابی کو ہسپتال میں خون کی بوتلیں لگی ہوئی تھیں' حرکت کرنے کے قابل نہ تھے۔ آخری وقت سلیم کا منہ بھی نہ دیکھ سکے۔ یکایک اس ناگہانی حادثے سے سب کے حواس مختل تھے' کوئی بھی تو ہوش میں نہ تھا' مسلسل رت جگے اور بے آرامی سے سب ہی نڈھال تھے--- قدرت بھی عجیب فیصلے کرتی ہے۔ انسان سوچتا کچھ ہے' ہوتا کچھ ہے۔ سلیم ایک لاکھ روپے لینے آیا تھا' حاجی صاحب لاکھ روپے اسے دینے آئے تھے مگر کسے معلوم تھا کہ ان روپوں میں اس کے حصے میں جو روپے آئیں گے وہ اس کے کفن دفن پہ خرچ ہوں گے جبکہ سبحان چاچا بے چارا صحیح صورت سے بے خبر تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ مرنے والا کیا کچھ کر گزرا اور کیا کچھ کرنے والا تھا--- خدا کا کرنا دیکھئے کہ جس دن سلیم کی موت واقع ہوئی' اسی دن نادر نے بچے کی ولادت کی خوشخبری فیصل آباد بھیج دی اور سبحان چاچا سے نومولود کا نام تجویز کرنے کی استدعا کی' چلے کی مدت ختم ہونے کے بعد فوری آنے کا کہا اور زچہ و بچہ کی خیریت لکھی۔ فیصل آباد والوں نے دانستہ اس خوشخبری کی اطلاع لاہور نہ پہنچائی' مناسب وقت کے انتظار میں چپ سادھ لی۔

دسویں کی فاتحہ تک سبحان چاچا اور سلیم کی ماں پلاسٹر' پٹیوں سمیت گھر منتقل ہو چکے تھے۔ سبحان چاچا تو بیساکھی کے سہارے ادھر ادھر' تھوڑا بہت چل پھر لیتا لیکن بھابی ابھی صدمے اور اندر باہر کی ٹوٹ پھوٹ کے باعث ہل بھی نہیں سکتی تھی۔ حاجی صاحب کی اہلیہ' ایک بچہ اور صاحبزادہ مستقل یہاں مقیم تھے۔ جویریہ کے لئے بڑی احتیاط کے دن تھے' حاجی صاحب آتے جاتے رہتے--- مزید پندرہ بیس روز

گزرے تو حاجی صاحب نے نادر کو اس حادثے کی اطلاع دی' صبر کی تلقین کرتے ہوئے چالیسویں کے پندرہ روز بعد فیصل آباد پہنچنے کی تاکید کی اور مزید ہدایت کی کہ اپنا سارا سامان بھی ساتھ لے آنا' تمہیں دوبارہ وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہوگی--- چالیسویں کے بعد چوتھے روز' پیر کی صبح اذان کے بعد جویریہ کے کمرے سے مہین سی جلترنگ بجی۔ حافظ صاحب مسجد میں نماز کے لئے کھڑے' صفیں سیدھی دیکھنے کے لئے دائیں بائیں دیکھ رہے تھے اور مکبر تکبیر کہہ رہا تھا--- اللہ اکبر!--- وہ اکثر صبح کی نماز کی پہلی رکعت میں سورہ رحمٰن کا کوئی نہ کوئی رکوع قرات کیا کرتے تھے لیکن آج اس وقت اپنے آپ ہی سورہ مریم درمیان سے شروع ہو گئی--- بچی کا یہی نام تجویز ہوا' ننھی سی پھول جیسی مریم بالکل جویریہ کی شکل تھی۔ مسلسل کئی پریشانیوں اور حادثوں کے بعد یہ پہلی خوشی کی کرن تھی جو اس اداسیوں بھرے گھر میں ابھری تھی۔ حاجی صاحب نے مصلحتاً "ابھی نادر کے ہاں بیٹے کی ولادت کی خوشخبری نہیں سنائی تھی' پوتی کی ولادت پہ مبارکباد دیتے ہوئے بولے۔

"سبحان بھائی! اس مبارک موقع پر پوتے کا کوئی اچھا سا نام بھی تجویز کر لو---"

"انشاء اللہ! خدا وہ مبارک گھڑی بھی لائے تو آپ ہی اپنے پوتے کا نام رکھیں گے کہ نادر والا شعبہ آپ کا ہے۔" سبحان چاچا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ مبارک گھڑی آچکی ہے---" انہوں نے خط نکال کر دکھایا۔ "--- موقع نہیں تھا اسی لئے بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اب وہ کچھ دنوں تک یہاں پہنچنے ہی والے ہیں۔"

نادر اور رابعہ پروگرام کے مطابق پہلے فیصل آباد آئے' ایک روز وہاں رکے' حاجی صاحب بہت خوش ہوئے--- رابعہ بالکل بدل چکی تھی۔ چہرے مہرے' اٹھنے بیٹھنے سے ایک سنجیدہ گھریلو ذمہ دار سہاگن دکھائی دیتی تھی اور دونوں آپس میں بڑے خوش تھے۔ نادر آہستہ آہستہ اسے اپنے ڈھب پہ لے آیا تھا۔ اتنا عرصہ باہر رہنے سے بے شمار تبدیلیاں آچکی تھیں' شکلیں بدلی بدلی سی لگتی تھیں۔ نادر کے چہرے پہ ایک چھوٹی سی خوبصورت داڑھی کا اضافہ ہو چکا تھا' صحت بھی پہلے سے اچھی تھی اور ننھا بچہ بھی بڑا صحت مند اور خوبصورت تھا--- لاہور میں جیسے خوشیوں کی بہار آگئی' دکھ سکھ ایک دوسرے سے یوں پھوٹتے ہیں جیسے اندھیرے سے سورج اور روشنی سے تاریکی' کون کہہ سکتا تھا کہ یہ گھر جہاں اس وقت خوشی فواروں کی مانند اچھالے لے رہی ہے' کئی ہفتوں عشروں سے کسی کے لبوں پہ خفیف سی ہنسی کے لئے بھی ترس گیا تھا۔ انسان کتنی جلد بھول جاتا ہے یا شائد جان بوجھ کر بھول جانا چاہتا ہے۔ نسیان بہت بڑی نعمت ہے' اگر یہ نعمت نہ ہو تو شائد انسان جی نہ سکے--- سب ہی صدقے واری ہو رہے تھے۔ ننھا اور ننھی مریم کبھی اس گود' کبھی اس گود--- حاجی صاحب اور سبحان چاچا تماشا دیکھ رہے تھے' اندر ہی اندر خوش ہو کر اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے۔

تیسرے روز گاؤں جانے کا پروگرام بنایا' رخسانہ کی ماں پہلے سے بستر تھی' پلستر اتر گیا تھا' کمزوری تھی مگر چل پھر سکتی تھی۔ ڈیڑھ مہینے سے یہاں پڑی تھی' سلیم کا آخری بار منہ بھی نہ دیکھا۔۔۔ وہ اب گاؤں' باپ کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ گھر پہ بابا جی' بے بے جی اور رخسانہ تھے۔ یہ لوگ گاؤں پہنچے تو سارا گاؤں جمع ہو گیا' آہ و فغاں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ گاؤں والوں کے ساتھ قبرستان پہنچے۔ باپ بیٹے کی قبریں ساتھ ساتھ تھیں' ماں غش کھا کر قبروں پہ گر پڑی۔ نادر نے فاتحہ پڑھی' پھول ڈالے۔۔۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ گھر واپس آ گئے۔ دوسرے روز نادر نے دیگیں پکوائیں' گاؤں اور غریبوں میں تقسیم کیں۔۔۔ سبحان چاچا' حاجی صاحب اور نادر کے سامنے اب ان کا مستقبل دامن دراز کئے ہوئے کھڑا تھا' کھل کر بات تو کوئی نہیں کر رہا تھا لیکن اندر ہی اندر ان تینوں کی چکی چل رہی تھی کہ اب یہ تینوں عورت ذات کس چکی کا پسا کھائیں گی؟

"بھابی! اب گاؤں میں کیا رہ گیا ہے۔۔۔ چلو' لاہور ہی مل جل کر گزارہ کر لیں گے؟" سبحان بولا۔

"سبحان! سر کے سائیں اور جوان بیٹے کی قبریں یہاں ہیں' کیسے چھوڑ کر جاؤں؟۔۔۔ کم از کم یہاں رہ کر اپنے دل کی بھڑاس تو نکال لیا کروں گی۔۔۔ میں یہیں رہوں گی' پتہ نہیں کتنے دن زندگی باقی ہے' وہاں جا کر کیا کروں گی؟" وہ روتے ہوئے بولی۔

سبحان نے اس وقت اصرار مناسب نہ سمجھا' خرچہ پانی دے کر دوسرے روز واپس آ گئے۔

سبحان چاچا نے حاجی صاحب سے استدعا کی کہ اب نادر اور رابعہ کو لاہور ہی رہنے دیں۔ صدمے جھیل جھیل کر میری کمر ٹوٹ گئی ہے' برداشت اور ہمت بھی جواب دے گئی ہے۔ اللہ نے بچے دے کر گھر میں رونق لگا دی ہے۔ چار دن اب ہمیں خوشیاں دیکھنے دیں۔۔۔ حاجی مسکراتے ہوئے بولے۔

"بھئی' میں نے یہی سوچ کر تو انہیں یہاں بلایا ہے۔ تمہاری خواہش کے مطابق اب یہ تمہارے پاس ہی رہیں گے۔۔۔"

ایسے میں حافظ صاحب مٹھائی کے ڈبے اور حجام کو ساتھ لئے آ گئے۔ یہ انتظام بھی حاجی صاحب نے کیا تھا۔

"لو بھئی سبحان! آج ننھے کے ختنے بھی ہو جائیں اور کوئی اچھا سا نام بھی تجویز کر لو۔۔۔"

"بسم اللہ کریں' حاجی صاحب! یہ سب آپ کے ہی کام ہیں۔۔۔ نام' وام سب آپ ہی جانیں۔"

"اجازت دیں تو میں بھی کچھ کہوں؟" رابعہ بولی۔ "میری رائے ہے کہ یہ دونوں کام گاؤں میں ہونے چاہئیں' اپنے پرائے گھر میں۔۔۔ تائی امی' بابا جی' بے بے جی' رخسانہ' فہمیدہ سب وہیں ہیں۔"

"رابعہ ٹھیک کہتی ہے۔۔۔" نادر نے تائید کی۔ "اس خوشی کے موقع پہ ان کی شمولیت بہت ضروری ہے۔"

"۔۔۔ ایک درخواست اور کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے اپنا بچپن اس گھر میں بڑی آسائشوں سے گزارا ہے۔ انہوں نے اپنے بچوں سے زیادہ پیار دیا' میرے بارے میں جو کچھ سوچا تھا وہ تو پورا نہ ہو سکا لیکن اب میں بیٹی بن کر ان کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔۔۔ آپ سب اجازت دیں تو میں تائی امی کے پاس ہی رہنا چاہتی ہوں۔۔۔"

بجویریہ بھی اجازت لے کر بولی۔

"یہ میری بھی خواہش ہے کہ یا تو وہ یہاں ہمارے پاس رہیں یا پھر ہم ان کے پاس چلے جائیں۔۔۔ اب چونکہ رابعہ کی خواہش بھی یہی ہے اس لئے آپ اسے گاؤں رہنے کی اجازت دے دیں۔"

یہ کہہ کر وہ نادر کی جانب دیکھنے لگی۔ سبحان چاچا اور حاجی صاحب' رابعہ کے منہ کی جانب دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ کیا یہ وہی رابعہ ہے!۔۔۔ پھر سبحان چاچا سے پہلے حاجی صاحب بول پڑے۔

"بڑا نیک خیال ہے' سبحان اللہ!۔۔۔ کیوں سبحان بھائی تم کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں حاجی صاحب! رابعہ کی باتیں سن رہا ہوں۔۔۔" پھر نادر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگے۔ "تمہارا کیا خیال ہے برخوردار؟"

"۔۔۔ خیال اور فیصلہ تو آپ بزرگوں کا ہے' میں تو سر خم کرنے والوں میں سے ہوں۔۔۔ ویسے رابعہ کے خیالات اور جذبہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی حاصل ہوئی ہے۔ میری طرف سے اسے اجازت ہے' بلکہ ہم تینوں ان کی خدمت کریں گے۔۔۔" وہ ننھے بچے کو چومتے ہوئے بولا۔

حاجی صاحب پھر سبحان اللہ کہتے ہوئے بولے کہ اس کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے' انشاء اللہ اگلے جمعہ کو گاؤں چلیں گے۔

●●

یہ صحن میں داخل ہوئے تو بھابی اندر سے بھاگی بھاگی باہر آئی' رابعہ اور بچے سے لپٹ گئی' ان کی بلائیں لینے لگی۔ پھر دعائیں دیتی ہوئی بولی۔

"آپ گاؤں داخل ہوئے تو مجھے ایک مخصوص سی خوشبو کا احساس ہوا' وہی خوشبو اور وہی احساس جو ایک ممتا بھری ماں اپنے بیٹے کی آمد پہ محسوس کرتی ہے۔۔۔ یقین کریں' آج ایک عرصے کے بعد یہ سکون بھری' روح میں اتر جانے والی خوشبو آئی ہے جیسے سلیم گھر آ گیا ہو۔۔۔"

وہ وارفتگی کے عالم میں دیوانہ وار اس خوشبو کی پوٹ کو سینے سے چمٹا کر چومنے لگی' آنکھیں بھیگ گئیں۔۔۔ جذبات کے طوفان اور ہلکی ہلکی آنسوؤں کی بوندا باندی تھمی' مطلع صاف ہوا تو حاجی صاحب' سبحان چاچا سے کہنے لگے۔

"بھائی! بچے کے نام کا مسئلہ تو حل ہو گیا' اب اس کے ختنے کروانے کا بندوبست کرو---"

رابعہ تائی امی کے کاندھے پہ سر ٹکا کر کہنے لگی۔ "تائی امی! اس کا نام تم خود ہی رکھو---"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔ "رابعہ! مجھے ناموں' واموں کی کچھ سمجھ نہیں--- میں تو اسے سلیم ہی کہا کروں گی--- دیکھو تو اس کا ماتھا' آنکھیں' ہونٹ' لمبی لمبی انگلیاں' سلیم ہی سلیم!--- وہ بھی جب بچہ تھا تو ہو بہو ایسا ہی تھا۔ تم تو سلیم کے ساتھ ہی جوان ہوئی ہو' تم سے زیادہ اسے کون جانتا ہے---؟"

"ہاں' تائی امی! ہو بہو سلیم ہے--- اور یہ تم نے بالکل درست کہا کہ مجھ سے زیادہ سلیم کو کون جان سکتا ہے؟--- تائی امی! میں آپ کی وہی ہوں جو آپ نے مجھے سمجھا تھا۔ یہ آپ کا بیٹا سلیم ہی ہے' آج سے اس کا نام سلیم ہے۔ نادر اور میں' آپ کی خدمت کریں گے۔ آج سے میں یہیں آپ کے قدموں میں رہوں گی---" جل تھل پھر شروع ہو گئی--- ساون کا کیا ہے جب جی چاہے برس پڑے۔

شام تک ختنے بھی ہو چکے' شیرینی بانٹی گئی' مبارک سلامت ہوئی۔ کتنی مدت کے بعد اس آنگن میں خوشیوں کی میٹھی میٹھی دھوپ پھیلی تھی۔

●●

نادر لاہور آ گیا تھا' گاؤں میں رہ کر کیا کرتا کہ کوئی کام دھندا تو تھا نہیں--- جویریہ اس کا لال کرتا استری کر رہی تھی۔ ایک زمانہ کے بعد وہ اسٹیشن پہ پہنچا' سنگی ساتھیوں نے بڑی کشادہ دلی سے استقبال کیا' خیر خیریت دریافت کی' سلیم کی ناگہانی موت پہ اظہار افسوس کیا--- وہی اسٹیشن' مسافر' سمجھوتہ ایکسپریس' گاڑیاں' پٹڑیاں اور بوجھ!--- زندگی کی گاڑی بھی اپنی مخصوص گھی بندھی ڈگر پہ رواں دواں ہو گئی' نادر اور سبحان چاچا ہر ہفتے باری باری گاؤں جاتے' ایک آدھ دن رہتے اور واپس آ جاتے۔ جویریہ اور حافظ صاحب بھی آتے جاتے رہتے' فیصل آباد والے بھی ہر طرح سے خیال رکھتے۔ ننھا سلیم رابعہ سے زیادہ اپنی دادی سے مانوس تھا۔ رخسانہ اور فہمیدہ نے دوبارہ پڑھائی شروع کر دی تھی۔ ماں رخسانہ کو مزید پڑھانا تو نہ چاہتی تھی لیکن اس کے مجبور کرنے پہ پھر اسکول ڈال دیا کہ کم از کم میٹرک تو کر لیا جائے۔ ماں اس کے بارے میں بھی پریشان رہتی۔ جوان' خوبصورت' شادی کی عمر--- کئی ایک رشتے کرانے والیوں سے بات بھی کر رکھی تھی۔ گاؤں' قصبوں میں اچھے لڑکے جو پڑھے لکھے با روزگار ہوں' کہاں دستیاب ہوتے ہیں اور جو کوئی تھوڑا بہت پڑھ لکھ گیا' روزگار نوکری کے لئے کسی بڑے شہر جا کر گم ہو گیا۔ گاؤں میں کھیتی باڑی کرنے والوں یا چھوٹے موٹے دوکاندار لڑکوں کو تو وہ رشتہ دینے سے رہی' کئی بار سوچا کہ سبحان سے بات کرے' گی--- رابعہ بھی رخسانہ کے بارے میں فکر مند تھی' گاؤں اور اردگرد کا ماحول ٹھیک نہیں تھا۔ وہ خود بھی اسی صورت حال سے گزر چکی تھی بلکہ اسی ماحول کی بے راہروی کا شکار ہو چکی تھی۔ اس سے زیادہ کون جانتا تھا کہ رخسانہ اس ماحول میں کس خطرناک عمر کے کس خطرناک دور میں کھڑی ہے۔

کھلے دنوں میں جویریہ بھی اپنی ساس کے ساتھ گاؤں چلی آئی۔ گاؤں کی کھلی کھلی فضا' کھیت کھلیانوں اور کچی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو' سادہ مرادے لوگ۔ ساگ' بھٹے' گنے' جو' مکئی اور خاص کر تنور والیاں اور بھٹیارنیں اسے بے حد بھلی لگتیں--- اس مرتبہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت یہاں گزارنا چاہتی تھی اور اس کی بھاری بھاری طبیعت کا تقاضا بھی تھا' وہ شائد پھر سے ماں بننے والی تھی--- خوب ہنسی کھیل میں دن گزر رہے تھے' موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رخسانہ بھی ریاضی کے مضمون میں جویریہ سے مدد لینے لگی' دو چار اور لڑکیاں بھی سینے پرونے اور میٹھی میٹھی باتیں سننے کے بہانے پاس آ بیٹھتیں۔ سلیم اور مریم کی ننھی منی حرکتوں اور شرارتوں سے پورا آنگن بھرا بھرا لگتا۔

ایک دن جویریہ اکیلی بیٹھی دھوپ سینک رہی تھی۔ رخسانہ اندر اپنی ماں بہن کے ساتھ بڑے صندوق سے کچھ نکال رہی تھی۔ رخسانہ کی کتابیں اور کاپیاں ادھر جویریہ کے پاس چارپائی پہ پڑی تھیں' ننھے سلیم نے ایک کتاب جو اٹھا کر نیچے پھینکی تو ایک چھوٹا سا تہہ کیا ہوا کاغذ بھی زمین پہ گر گیا' اٹھا کر جو چند مختصر سی سطریں پڑھیں تو آنکھیں پھیل گئیں' منہ کھلے کا کھلا رہ گیا--- کاغذ تہہ کر کے پاس رکھ لیا۔ خدشات' خوف اور بے چینی کا بے کراں سمندر اس کے چاروں طرف ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ جیسے جیسے سوچتی' وہ ڈوبتی جاتی۔ وہ ٹکٹکی باندھے سامنے دروازے کو گھور رہی تھی جس کی چوکھٹ کی اس جانب رخسانہ کچھ کھول بند کر رہی تھی--- آنے والی رات قیامت کی تھی' پلک سے پلک نہ لگی تھی۔ ساری رات وہ غوطے کھاتی رہی تو صبح آنکھیں انگارہ بنی دہک رہی تھیں۔

"جویریہ! خدا خیر کرے' تمہارے چہرے پہ یہ بے رونقی اور آنکھیں سرخ---؟" رخسانہ کی ماں نے حیرت سے پوچھا۔

"---طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے' مجھے جلدی سے ابھی لاہور پہنچنا چاہیے---"

جلدی جلدی سامان باندھا تو رخسانہ بھی تیار ہو گئی کہ چھٹیاں ہیں' میں بھی بھائی کے ساتھ لاہور جاؤں گی اور شائد جویریہ بھی یہی چاہتی تھی۔ لاہور والے ان کے یوں پریشانی کی حالت میں اچانک چلے آنے پہ فکر مند ہوئے۔ سب کی خیریت پوچھی تو یہاں بھی طبیعت کی اچانک خرابی کا کہہ کر ٹال دیا--- اب کس سے ذکر کرے' کیا کرے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور سوچ سوچ کر باولی ہوئی جا رہی تھی۔ آخر موقع پا کر تنہائی میں رخسانہ کو پکڑ کر بیٹھ گئی اور بلا تمہید وہ تہہ کیا ہوا رقعہ کھول کر سامنے رکھ دیا۔ رقعہ اس کے ہاتھ کیسے لگا' یہ واقعہ بھی بتا دیا۔

"رخسانہ! میں تمہاری ہمدرد اور بہن ہوں' مجھ سے بھی چھپاؤ گی تو کیا کرو گی' کس سے کہو گی؟--- اس سے پہلے کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے اور تمہاری دکھوں کی ماری ہوئی ماں بے موت مر جائے' مجھے سچ سچ سب کچھ بتا دو--- میں تم سے وہاں بھی پوچھ سکتی تھی مگر میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا اور اگر تم خود

یہاں آنے کا اظہار نہ کرتیں تو بھی میں تمہیں ضرور لاتی تاکہ تم کھل کر بات کرسکو۔۔۔"

رخسانہ دونوں ہاتھوں سے پلو کو مروڑتی' نظریں جھکائے آنسو بہا رہی تھی۔ چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور ہونٹوں پہ جیسے تالے تھے۔

"تمہارے خاموش رہنے سے کچھ نہیں ہوگا البتہ تمہاری زبان کھلنے سے شاید تمہاری سلامتی کا کوئی راستہ کھل جائے۔۔۔ بولو میری بہن!"

آنسو پونچھتے ہوئے وہ ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔ "ہجویریہ بھابی! میں خود ہی تمہیں بتانا چاہتی تھی مگر ایک تو مجھے موقع نہیں مل رہا تھا' دوسرے مجھے الفاظ اور ہمت نہیں مل رہی تھی۔۔۔ بھابی' خدا کی قسم! میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔ مجھے اپنے ماں باپ اور آپ کی عزت کا بڑا خیال ہے۔ شاید آپ کو پتہ ہوگا کہ بھائی سلیم میری ایک سہیلی نازیہ کے سلسلے میں پھنس گئے تھے۔ وہ بڑی اچھی' نیک اور خوبصورت لڑکی تھی' میری بہت اچھی سہیلی تھی اور اسی ناتے ہمارا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بھی تھا' رابعہ کو سب کچھ معلوم ہے۔۔۔ سلیم نازیہ میں دلچسپی لینے لگا بعد میں پتہ چلا کہ سلیم اسے خط بھی لکھتا تھا اور ملنے کی کوشش بھی کرتا' پھر کچھ تصویروں کی باتیں بھی نکلیں اور پھر خدا جانے جھوٹ یا سچ' نازیہ مر گئی۔ اس کے گھر والوں نے اس کی موت یا خودکشی کا الزام سلیم پہ دھر دیا' ثبوت میں اس کے خط' رقعے اور تصویریں دکھائیں' کسی نہ کسی طرح پولیس کو بھی خبر ہو گئی اور پھر پولیس ہمارے پیچھے پڑ گئی۔ اباجی نے دے دلا کر سلیم کو بے قصور ثابت کروا دیا۔ وہ غریب لوگ تھے' نہ رشوت دے سکتے تھے اور نہ پولیس کچہریوں کے چکروں میں پڑ سکتے تھے' رو پیٹ صبر کر کے بیٹھ گئے۔۔۔ نازیہ کا ایک بھائی انور علی تھا۔ وہ اس وقت اسکول میں پڑھتا تھا' نہ تو مقابلہ کرسکتا تھا اور نہ ہی ابھی اتنا سمجھدار تھا سو بات رفع دفع ہو گئی لیکن انور نے اپنے دل میں کینہ رکھا ہوا تھا کہ اپنی بہن کا بدلہ ضرور لے کر رہے گا چاہے اسکی جان بھی چلی جائے' اس کی ماں نے بھی اسے بدلہ لینے کی قسم دے رکھی تھی۔۔۔ وقت گزر تا گیا' ہم بھی آہستہ آہستہ اس بات کو بھول گئے مگر وہ شاید نہیں بھولے تھے۔ ابا کی وفات کے بعد ایک دن میں اور فہمیدہ گاؤں کی چند دوسری لڑکیوں کے ساتھ سامنے والے گاؤں سے واپس آ رہی تھیں کہ گاؤں سے باہر ہی لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے بجلی چلی گئی' لڑکیاں جلدی جلدی اپنے اپنے گھروں کی جانب بھاگ گئیں۔ ہم دونوں بہنیں بھی جلدی جلدی اپنے گھر کی جانب آنے لگیں۔ ان دنوں چوریوں کی وارداتیں بھی ہو رہی تھیں' گاؤں کے لڑکے باری باری ٹھیکری پہرہ کرتے تھے۔ مسجد کے پاس گلی کے موڑ پر دو لڑکوں نے جنہوں نے اپنے چہرے چھپائے ہوئے تھے' ہمارا راستہ روک لیا۔ پھر ایک نے مجھے اور دوسرے نے فہمیدہ کو جکڑ لیا۔ جس نے مجھے جکڑا وہ مجھے مسجد کی دیوار کے پاس لے گیا' چہرے سے کپڑا ہٹایا تو وہ انور علی تھا۔۔۔ کہنے لگا' میں نے قسم اٹھا رکھی ہے۔ تمہارے بھائی نے میری معصوم بہن کو خراب کیا اور وہ اسی صدمے اور بدنامی کے خوف سے خودکشی

کرنے پر مجبور ہوئی۔ اب میں تمہیں اور تمہاری بہن کو نہیں چھوڑوں گا چاہے مجھے پھانسی ہو جائے' میں نے اپنی ماں کے دودھ اور نازیہ کے دوپٹے کی قسم کھائی ہوئی ہے۔۔۔ میں نے لاکھ واسطے دیئے' رو رو کر دہائیاں دیں مگر اسے ترس نہ آیا' صرف اتنا کہا کہ میں تمہاری کم سن بہن کو تو ترس کھا کر چھوڑ سکتا ہوں مگر تمہیں بے آبرو کرنا مجھ پہ واجب ہو چکا ہے۔ پھر خدا کے گھر کی دیوار کے سائے میں مجھے اس کا کوئی بندہ اس وقت اس درندے کے شکنجے سے بچانے نہ آیا' منہ کالا کرنے کے بعد وہ رونے لگا اور کہنے لگا۔۔۔ رخسانہ! مجھے معاف کر دینا' میں جانتا ہوں کہ تم بے قصور ہو لیکن تمہارا باپ' جس کے پاس کویت کے دینار تھے' ان دیناروں کے بل بوتے پر اس نے ایک ظالم بیٹے کو بے قصور ثابت کروا دیا۔ ہم غریبوں کے پاس یہ کچھ نہیں تھا۔ ہم مظلوم ہوتے ہوئے بھی ظالم ٹھہرائے گئے' پولیس نے رشوت لینے کے بعد ہم سے کہا کہ آپ کی بیٹی ہی بدچلن تھی' آوارہ تھی اور اس نے ہی سلیم کو بھی خراب کیا۔ تم مسجد کے نیچے کھڑی ہو' قسم کھا کر بتاؤ کہ کیا تمہاری پیاری سہیلی بدکار تھی' میری معصوم بہن آوارہ تھی؟۔۔۔ میں ایک دفعہ پھر معافی مانگتا ہوں۔ جو کچھ میں نے کیا ہے وہ اچھا ہے یا برا' مجھے اس سے غرض نہیں۔۔۔ جاؤ' اپنے باپ کی قبر پہ جاؤ' اپنے بھائی سلیم کے پاس اور سب کچھ انہیں بتا دو' مجھے کسی کا خوف نہیں۔ سلیم سے کہنا کہ بھائی! میں تمہارا قرض اتار آئی ہوں۔۔۔ ہجویریہ بھابی! یقین کرو' یہ سب کچھ سن کر مجھے اپنی بربادی کا ذرا بھی دکھ نہ ہوا' اچھا ہوا کہ میں نے بھائی کا قرضہ اتار دیا۔۔۔ جن بہنوں کے بھائی ایسے بے غیرت' نشے باز اور بدحرام ہوں ان کی ماں بہنوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔۔۔" اس کا چہرہ جیسے ابھرتے سورج کے سامنے تھا' آتش بداماں۔۔۔!

"رخسانہ۔۔۔"

وہ ہاتھ کے اشارے سے ہجویریہ کو روکتی ہوئی بولی۔ "۔۔۔ ابھی بات مکمل نہیں ہوئی بھابی! خدا کے لئے مجھے آج سب کچھ کہہ لینے دو' پھر شاید موقع ملے نہ ملے اور یہ جرات' ہمت آئے نہ آئے۔۔۔ بھابی! جانتی ہوں کہ میں اب کنواری نہیں لیکن مجھے ذرا بھر ندامت نہیں' کسی کا خوف نہیں اور شکر ہے کہ اس شریف آدمی نے میری معصوم بہن کو چھوڑ دیا۔۔۔ یقین کرو' مجھے سلیم کے اس انجام کا رتی بھر افسوس نہیں۔۔۔"

"رخسانہ! بس کرو' مجھ میں اور کچھ سننے کی تاب نہیں اور جو کچھ میں اب تم کو بتانے لگی ہوں' شاید وہ کچھ سننے کی تم میں سکت نہ ہو۔۔۔ ننھا سلیم نادر کا نہیں' تمہارے بھائی سلیم کا ناجائز بچہ ہے۔ سلیم نے نازیہ سے جو کھیل کھیلا' وہی کھیل اس نے اپنے گھر' اپنی منگیتر رابعہ کو بے ہوش کر کے کھیلا۔ جب اسے ماں بننے کا احساس ہوا تو وہ خودکشی کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔ نادر کو جب یہ سب معلوم ہوا تو اس نے انتہائی رازداری سے فوری شادی کر کے رابعہ کو تحفظ فراہم کر دیا مگر آج تک سبحان چاچا اور کسی فرد کو یہ

حقیقت معلوم نہیں --- ایک بات اور --- نادر اور رابعہ آج تک علیحدہ علیحدہ سوتے ہیں' نادر نے آج تک اسے چھوا تک نہیں --- رخسانہ! نادر جیسا انسان کبھی تم نے دیکھا ہے؟ ایسے ہی چیدہ چیدہ انسانوں کی وجہ سے یہ دنیا قائم ہے' اس دنیا میں رہنے اور جینے کو جی چاہتا ہے --- میری مانو تو ایک بات کہوں؟"

"کہو ---؟"

"نادر اگر تم سے شادی کر لے تو کیسا رہے ---؟"

"کیا کہہ رہی ہو بھابی ---!"

"--- صحیح کہہ رہی ہوں' یہی واحد حل ہے --- نادر جیسا فرشتہ انسان تمہیں کہاں ملے گا؟"

"وہ شادی شدہ ہے اور پھر رابعہ ---؟"

"یہ سب کچھ تمہارے سوچنے کی باتیں نہیں' سب تم مجھ پر چھوڑ دو --- رہی رابعہ کی بات تو رابعہ کی خواہش بھی یہی ہے۔ وہ دونوں صرف نکاح نامے اور دنیا کی نظر میں میاں بیوی ہیں۔ رابعہ نے قرآن پہ ہاتھ رکھ کر عہد کیا ہوا ہے کہ ساری زندگی کسی مرد کی قربت حاصل نہیں کرے گی۔ اس کی زندگی کا مقصد اب محض سلیم کی پرورش' تربیت اور اللہ اللہ کرنا ہے --- اب تم کو ایک اور عجیب بات بتاتی ہوں --- جانتی ہو' میرے والد مرحوم کی خواہش تھی کہ نادر ان کا داماد بنے' لاکھوں روپے اس کے نام کر دیئے لیکن اس نے محض اس بناء پہ شادی سے انکار کر دیا کہ مجھے ایک دفعہ اسٹیشن پہ بس کہہ چکا تھا۔ وہ مفت کی دولت سمیٹنا نہیں چاہتا تھا' دنیا کو یہ کہنے کا موقع فراہم کرنا نہیں چاہتا تھا کہ اس نے دولت کی خاطر کسی لڑکی سے شادی کی اور امیر ہو گیا۔ ایسے کردار کا انسان اپنے محسن کی لڑکی سے کیسے چپ چاپ شادی کر سکتا ہے جسے وہ سگے باپ سے زیادہ مان دیتا ہے' جس کے پاس تن کے کپڑوں کے علاوہ ہاتھ کا رومال بھی نہیں تھا۔ یہ تو قربانی تھی رابعہ کی زندگی اور سبحان چاچا کی عزت بچانے کی خاطر ---" کچھ دیر خاموشی کے بعد جویریہ پھر کہنے لگی۔ "قدرت کے ہر کام میں کہیں نہ کہیں بہتری پوشیدہ ہوتی ہے اور ضروری نہیں کہ ہم اسے فوری طور پر سمجھ پائیں --- جو کچھ ہوا ہے' یقیناً اس میں بھی کہیں نہ کہیں کوئی بہتری ہو گی۔ رابعہ ہمیشہ کے لئے گاؤں رہنے کا تہیہ کر چکی ہے اور صاف صاف کہہ چکی ہے کہ ساری عمر تائی امی کی خدمت کرے گی' وہ خود ہی نادر کے لئے راستہ بنا چکی ہے --- بس تم ذرا صبر اور عقلمندی سے کام لو اور مجھے کچھ سوچنے دو ---" وہ اس کا ہاتھ تھام کر التجا بھرے لہجے سے کہنے لگی۔ "یہ وعدہ کرو کہ اس واقعہ کا ذکر تم کبھی کسی سے نہیں کرو گی اور میں تمہارے بارے میں جو فیصلہ کروں وہ تمہیں قبول ہو گا۔"

●●

سلیم اپنی ماں اور دادی کے پاس گاؤں رہتا ہے' بڑا نیک اور سعادت مند بچہ ہے' قرآن حفظ کر رہا ہے --- ادھر لاہور میں حافظ صاحب کی ایک بیٹی مریم' دو جڑواں صاحبزادے محمد یٰسین اور محمد طٰہٰ ہیں اور دونوں قرآن حفظ کر رہے ہیں۔ نادر اور رخسانہ اب علیحدہ قریب ہی ایک مکان میں رہتے ہیں۔ ان کے ماشاء اللہ کوئی پانچ چھ بچے ہیں' علیحدگی کی وجہ محض یہ تھی کہ بچے آپس میں لڑائیاں کرتے تھے۔ جویریہ اور رخسانہ میں دو چار زوردار جھڑپیں بھی ہوئیں اور اب آپس میں بول چال بند ہے --- سبحان چاچا تین مہینے ہوئے انتقال کر چکے ہیں۔ آخری وقت اس نے نادر کو قریب بلا کر کان میں کہا کہ پیدائشی ولی تو سنا تھا' پیدائشی قلی تمہیں دیکھا ہے۔ بوجھ جو بھی تم نے اٹھائے ہیں' تم سمجھتے ہو کہ میں نہیں جانتا مگر میں سب کچھ جانتا ہوں کہ آخر میں بھی تو پرانا قلی ہوں --- نادر کے تالو سے بال جھڑ چکے ہیں' کندھوں اور ہاتھوں پر گٹے پڑے ہوئے ہیں۔ اکثر وہ کہتا ہے کہ دوسروں کا بوجھ اٹھانے والا پل صراط سے یوں گزر جائے گا جیسے قلی بوجھ سمیت بھیڑ بھاڑ میں گیٹ سے باہر نکل جاتا ہے' اس کے لئے راستہ چھوڑ دیا جاتا ہے اور ٹکٹ کی پوچھ گچھ بھی نہیں ہوتی۔

○●